جامِ آرزو

مہوش افتخار

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مہوش افتخار

زمین پہ گرا اس کا وجود، ٹھوکروں کی زد میں تھا۔ جو اس کے جسم پہ اندھا دھند اور انتہائی بے رحمی سے لگائی جا رہی تھیں۔ وہ تڑپ رہا تھا، چیخ رہا تھا، لیکن وہاں کوئی اس کا مددگار نہ تھا۔ درد کی شدت ہر ضرب پہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے برانڈڈ کپڑے خاک اور خون سے اٹنے لگے تھے۔ جبکہ وجیہہ چہرے کے تیکھے اور مغرور خدوخال، آنسوؤں، خون اور گرد کے پیچھے چھپ گئے تھے۔

رفتہ رفتہ اس کا جسم شل ہونے لگا تھا۔ مزاحمت دم توڑتی جا رہی تھی۔ ان کے جوتے اب بھی اسے رگید رہے تھے، لیکن درد میں وہ شدت نہ رہی تھی۔ سوئی جاگی کیفیت میں اس نے اپنے بے وزن وجود کو ہوا میں اٹھتا محسوس کیا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ پوری طاقت سے کچرے کے ڈھیر پہ پھینک دیا گیا تھا۔

اس کا سر بڑی زور سے کسی چیز سے ٹکرایا تھا اور لبوں سے بے اختیار اک کراہ نکلی تھی۔ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ ایک آخری احساس بڑی شدت سے اس کے اندر جاگا تھا..... تعفن کا کریہہ احساس۔ تعفن۔ جو اس کے ناک اور منہ میں گھسنے لگا تھا اس کے شان دار وجود سے لپٹنے لگا تھا۔ مگر.....

مکمل ناول

☆ ☆ ☆

سبز بیلوں سے ڈھکے خوب صورت سے بنگلے کے سیاہ گیٹ پر پہرہ دیتے چوکیدار نے جانے پہچانے ہارن پر مستعدی سے آگے بڑھ کے گیٹ کھولا تھا اور باہر منتظر کھڑی گاڑی سبک رفتاری سے اندر داخل ہوئی۔ سیدھی سامنے پورچ میں جا کھڑی ہوئی تھی۔

"سلام بی بی۔" وہ پرس' لیپ ٹاپ اور دوائیں اٹھائے باہر نکلی تو گیٹ بند کرتے دل شیر نے پلٹ کے اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو دل شیر؟" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ لیے اپنے مخصوص نرم لہجے میں استفسار کیا۔

"اللہ کا شکر ہے بی بی۔" جواباً" وہ مسکرا کر بولا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی' عمارت کے داخلی دروازے کی جانب چلی آئی' لیکن اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ دروازے کو چھو جاتے' دروازہ اندر سے کھل گیا۔

"السلام علیکم!" مما جان کے شفیق چہرے پہ نظر پڑتے ہی اس کے لب خود بہ خود مسکرا دیے۔

"وعلیکم السلام! آج اتنی دیر کیوں ہو گئی تمہیں؟" دروازہ بند کرتے وہ اس کے پیچھے چلی آئی تھیں۔ ان کے متفکر لہجے نے مہر کی مسکراہٹ گہری کر دی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا سامان کاؤچ پہ ڈھیر کرتے وہ خود بھی قریب ہی گر سی گئی تھی۔

"بس آج پرنسپل نے اچانک میٹنگ کے لیے بلایا تھا' اس لیے دیر ہو گئی۔" اس نے جواب دیتے ہوئے پاس پڑا دواؤں والا شاپر اٹھا کر ان کی جانب بڑھایا۔

"آپ کی دوائیں۔"

"کیا ضرورت تھی آج لانے کی۔ کل آجاتیں۔" وہ شاپر لیتے ہوئے خفگی سے بولیں۔ مہر مسکراتے ہوئے جھک کر سینڈل اتارنے لگی۔

"کالج میں کچھ کھایا تھا یا نہیں؟" ان کے سوال پہ اس کا جھکا سر نفی میں ہل گیا۔

"صرف جوس پیا تھا۔"

"تو بیٹا لو وہ بھی نہ پیتیں۔ خواہ مخواہ زحمت کی۔" وہ سیدھی ہوئی تو نظریں ان کے خفا چہرے سے جا ٹکرائیں۔ ایسے ٹھنڈے میٹھے انداز میں کلاس لینا ان کا ہی خاصا تھا۔ مہر نے بے اختیار اپنی گہری ہوتی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔

"پاپا نے صبح اپنی شوگر چیک کی تھی؟" اس کے استفسار نے انجم بیگم کے چہرے پہ چھائی خفگی میں اضافہ کر دیا۔

"ایک سوائے اپنے' سب کی فکر ہے۔" ان کی فہمائشی نظروں پر اس نے ان کے کندھے پہ سر رکھ دیا۔

"میری فکر کرنے کے لیے آپ جو ہیں۔" وہ لاڈ سے بولی تو انجم بے اختیار اک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئیں۔

"میں کھانا لگواتی ہوں۔ تم فریش ہو جاؤ۔" وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولیں تو مہران کا گال چومتی اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ ٹیبل پہ آئی تو منتظر بیٹھی انجم بیگم نے اس کے آگے چاولوں کی ڈش بڑھائی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے زیب کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھی کہ آج عائشہ کے سسرال والوں کا فون آیا تھا۔ وہ اس جمعے کو منگنی کا فنکشن رکھنا چاہ رہے ہیں۔" ان کی بات پہ مہر کا چاول نکالتا ہاتھ یک لخت ساکت ہو گیا۔

"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" وہ لمحے کا توقف کیے بنا سپاٹ لہجے میں بولی تو انجم بیگم کی نظریں اس کے چہرے پہ جا ٹھہریں۔

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ تم جانتی ہو کہ تمہارا وہاں جانا کتنا ضروری ہے۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں اسے ٹوکا۔

"مگر مما جان! میں اس شخص۔۔۔"

"وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔" انہوں نے اس کی

بات کاٹی۔

"بہن کی منگنی تک تو لازماً "لوٹ آئے گا نا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا چمچ واپس ڈش میں پٹخا۔

"مشکل ہے۔ زیب بتا رہی تھی کہ کسی فارن کمپنی سے ڈیل ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ شاید شرکت نہیں کر سکے گا۔" اس کے برعکس وہ مکمل طور پہ پُرسکون تھیں۔

"اور اگر آگیا تو؟"

"تو آجائے۔ ہم کیا اس سے ڈرتے ہیں؟" اب کے انہوں نے خفگی سے اسے دیکھا تو مہر کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔

"مگر مما جان....."

"کوئی اگر مگر نہیں۔ تمہارا اس معاملے میں خود کو مضبوط کرنا بے حد ضروری ہے مہر! ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جائے گی بیٹا!" انہوں نے دھیرے سے سمجھاتے ہوئے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا تو مہر بے اختیار اک بوجھل سانس کھینچ کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

نیویارک میں طلوع ہونے والی یہ ایک معمول کی صبح تھی۔ مارک نے اپنی بیوی جوزفین کو روز کی طرح اس کے دفتر کے باہر ڈراپ کیا تھا اور خود اپنے دفتر کی جانب گاڑی بڑھانے کو تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ دھیان سے گاڑی ایک طرف کرتے ہوئے اس نے عجلت میں اپنا سیل فون جیب سے نکالا جس کی اسکرین پہ کوئی انجانا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو!" کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی پہ ڈالی تھی۔

"مسٹر مارک بات کر رہے ہیں؟" دوسری طرف سے کسی خاتون کی آواز آئی تو وہ بے اختیار چونک گیا۔

"جی۔"

"میں کیمونٹی ہیلتھ کیئر سینٹر سے بات کر رہی ہوں۔ آپ کسی سیم نامی شخص کو جانتے ہیں؟" دوسری جانب سے سوال کیا گیا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"جی... وہ... وہ میرا دوست ہے... سب ٹھیک تو ہے نا؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"معذرت کے ساتھ، لیکن وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ پلیز، جتنی جلدی ہو سکے یہاں پہنچ جائیں۔"

"کیا؟" دوسری طرف سے ملنے والی اطلاع نے لحظہ بھر کو اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔

"او کے۔ میں۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ آپ کس کیمونٹی سینٹر سے بات کر رہی ہیں؟" خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے دریافت کیا اور پھر دوسری جانب کا جواب سن کر اس نے "آناً فاناً" گاڑی مطلوبہ سینٹر کی جانب موڑ دی۔

☼ ☼ ☼

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ زیب بیگم نماز ادا کر کے ملازمہ کو چائے رکھنے کی ہدایت دیتی لاؤنج میں داخل ہوئیں تو صوفے پر منہ بسورے بیٹھی عائشہ نے ان کی

جانب دیکھا۔

"امی! یہ کیا بات ہوئی بھلا' آپ لوگوں نے انہیں اگلے جمعے کے لیے کیوں نہیں کہا۔"

"بیٹا اگلے ہفتے نوما واپس آسٹریلیا جارہی ہے۔ تمہاری ساس کہہ رہی تھیں کہ یہی تین چار دن ہیں ان کے پاس۔" انہوں نے اس کی ہونے والی نند کا حوالہ دیا تو جائشہ کو غصہ آگیا۔

"اور جو میرا بھائی یہاں نہیں ہے وہ؟"

"جاشی ٹھیک کہہ رہی ہے امی! حنان بھائی کے بغیر بھلا کیا اچھا لگے گا۔" نویرہ نے بڑی بہن کی تائید کی۔ زیب اک گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"مجبوری ہے بیٹا۔ اب ہم انہیں منع تو نہیں کرسکتے تھے نا اور پھر تمہارے ڈیڈی نے حنان کے مشورے سے ہی ہامی بھری ہے۔"

"بھائی نے تو ساری بات سن کے یہی کہنا تھا' مگر میں ان کے بغیر یہ فنکشن نہیں کرنے والی۔" جائشہ قطعی لہجے میں بولی۔

"تم ایسا کرو بھائی سے کہو کہ وہ ہر حال میں جمعے کی شام تک یہاں پہنچ جائیں۔ فنکشن اٹینڈ کریں اور پھر اگلے دن واپس چلے جائیں۔" نویرہ نے اسے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا تو زیب بیگم کا مطمئن دل یک لخت پریشان ہوگیا۔

"کوئی ضرورت نہیں اسے پاگلوں کی طرح یہاں وہاں دوڑانے کی۔ ہم نے کون سا کوئی بہت بڑا فنکشن کرنا ہے۔ ایک چھوٹی سی تقریب ہوتی ہے اور بس۔"

"لیکن امی۔۔۔"

"فضول کی بحث مت کرو جائشہ۔ حنان اگر جمعے تک فارغ ہوگیا تو پہنچ جائے گا۔ وہ کہہ چکا ہے تمہارے ڈیڈی سے۔" زیب قطعیت سے بولیں تو دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھتی خاموش ہوگئیں۔

☼ ☼ ☼

حیران پریشان بیٹھے مارک نے نظریں اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر شیشے کی دیوار کے پار پٹیوں میں جکڑے اور مشینوں میں گھرے وجود کی جانب دیکھا اور اس کا ذہن نئے سرے سے ماؤف ہونے لگا۔ وہ یعنی سیم اور نیویارک کے ایک مخدوش' بدنام زمانہ علاقے کے کچرے کے ڈھیر پر! اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ کتنی ہی دیر خالی الذہنی کے عالم میں اسے تکتا رہا اور پھر اس نے تھک کر بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔

کچھ دیر قبل اپنی گاڑی اسپتال کی جانب دوڑاتے ہوئے اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہاں اسے سیم اس درجہ بری حالت میں ملے گا۔ اسے آئی سی یو میں دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی' لیکن جب وہاں کی انتظامیہ کے ذریعے اسے وہاں پہنچانے والی خاتون کا بیان سننے کو ملا تھا تب تو وہ سچ میں مارے حیرت کے سکتے میں آگیا تھا اور اس کی یہ بے یقینی تا حال برقرار تھی۔

وہ جتنی بار نظر اٹھا کر اس کے بے سدھ وجود کی طرف دیکھتا' اتنی ہی بار نئے سرے سے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوجاتا۔ اس وقت بھی اس کے کانوں میں ڈاکٹر کی آواز گونج رہی تھی۔ جب انہوں نے پہلے پہل پوری بات اس کے گوش گزار کی تھی۔

"انہیں یہاں ایک خاتون لے کر آئی تھیں۔ یہ انہیں آج صبح اپنے گھر کی پچھلی گلی میں موجود کچرے کے ڈرمز کے درمیان کوڑے کے ڈھیر پر انتہائی زخمی حالت میں ملے تھے۔ ان کا کافی سے زیادہ خون بہہ چکا تھا۔ اس لیے ان کی حالت خاصی نازک تھی۔ ہم نے انہیں ٹریٹمنٹ دینے کے بعد ان کے کپڑوں کی تلاش لی تھی۔ تب ہمیں ان کی جیب سے ایک واحد وزیٹنگ کارڈ ملا تھا جس پہ "مارک اینڈ سیم" پرائیویٹ لمیٹڈ لکھا ہوا تھا۔ ان کے بازو پہ چونکہ سیم نام کا ایک ٹیٹو (TATOO) موجود تھا اس لیے ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ کارڈ ان ہی کے آفس کا ہے۔ اس کارڈ پر لکھے نمبر سے ہی ہم نے آپ سے رابطہ کیا تھا اور صد شکر کہ آپ ہمیں وقت پر مل گئے۔ ورنہ تو یہ کیس مزید الجھ جاتا۔" اور آنکھیں پھاڑے بیٹھے مارک کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اس تفصیل نے حقیقتاً "اس کی بولنے

کی صلاحیت سلب کرلی تھی۔

"ہم نے رولز کے مطابق ان کے بارے میں پولیس کو انفارم کردیا ہے۔ وہ یہاں کچھ ہی دیر میں پہنچنے والی ہے۔" ڈاکٹر کی اگلی اطلاع پہ وہ بامشکل تمام اپنے سر کو اثبات میں ہلا پایا تھا۔

"کیا آپ جانتے ہیں مسٹر مارک! کہ یہ اس علاقے میں کیا کرنے گئے تھے؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ تو اس کا سر میکانکی انداز میں نفی میں ہل گیا۔

"مجھے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔۔۔" اس کی بات پہ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔

"اس کا مطلب ہے کہ اصل صورت حال ان کے ہوش میں آنے کے بعد ہی واضح ہوگی۔" انہوں نے پر سوچ لہجے میں کہا تو اس کے شل ہوتے ذہن میں سیم کی حالت کا احساس جاگا۔

"یہ کب تک ہوش میں آجائے گا ڈاکٹر؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بلیڈنگ کی زیادتی کی وجہ سے اگلے چوبیس گھنٹے خاصے کریٹیکل (Critical) ہیں۔"

"کوئی اندرونی چوٹیں تو نہیں ہیں نا؟" اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

"سر کے پچھلے حصے میں خاصی گہری چوٹ آئی ہے' لیکن اسکیننگ کے ذریعے پتا چلا ہے کہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ زخم تو کافی ہیں' لیکن شکر ہے کہ اور کوئی سیریس انجری نہیں ہوئی۔" ڈاکٹر کی بات پہ اس کے دل کو تھوڑی تسلی ہوئی۔

"ان کا سیل فون' والٹ' ڈرائیونگ لائسنس؟"

"کچھ بھی ان کے پاس نہیں تھا۔" ڈاکٹر نے رسان سے جواب دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا' ان کا شکریہ ادا کرکے کمرے سے نکل آیا۔ جوزفین کو اس کے آفس میں فون کرکے مطلع کرنے کے بعد اس نے آنے والے پولیس آفیسرز کو اپنا بیان دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد لامتناہی سوچوں کا ایک سلسلہ تھا جس نے اس کے ذہن کو پراگندہ کردیا تھا۔ ان میں سب سے عجیب اور تلخ احساس اس کا کچرے کے ڈھیر پہ پایا جانا تھا۔ یہ سب کیسے ہوا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ اور سب سے بڑی بات وہ کل رات اس علاقے میں کیا کررہا تھا؟ یہ وہ سوالات تھے جنہوں نے اس کے اندر ادھم مچا رکھا تھا' مگر فی الوقت اس کے پاس سوائے صبر اور انتظار کے دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

منگنی کی تقریب کو زیب بیگم اور صغیر صاحب نے محدود پیمانے تک رکھنے کی کافی کوشش کی تھی' مگر نہ' نہ کرنے کے باوجود سب ہی لوازمات اکٹھے ہوتے چلے گئے تھے۔ نتیجتاً' جمعے کی شام تک "قاضی ولا" میں رنگ و نور کی بھرپور تقریب منعقد ہوگئی تھی۔ جسے دیکھ دیکھ کر جائشہ کا موڈ مزید خراب ہوگیا تھا۔ وہ صبح سے کتنی بار حنان سے رابطے کی کوشش کرچکی تھی' مگر نجانے ایسی کون سی مصروفیت تھی کہ وہ اس کا فون تک نہیں اٹھا رہا تھا۔

جائشہ کی فرمائش پہ اسے مہرا اور نویرہ نے مل کر گھر پر ہی تیار کیا تھا۔ دودھیا گلابی کامدانی سوٹ میں وہ کھلی کھلی سی بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی تیاری سے فراغت پاکے مہرا اپنے کپڑے اٹھائے واش روم میں گھس گئی تھی۔

شاور لینے کے بعد اس نے اپنے اسٹیپ میں کٹے چمک دار بالوں کو بلو ڈرائی کرکے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مناسب میک اپ اور نازک سی ڈائمنڈ جیولری پہننے کے بعد وہ شیفون کے پرل آف وائٹ اور ڈل گولڈن سوٹ میں نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

مہمانوں کی آمد کے ساتھ ہر طرف پھیلی رونق میں اضافہ ہوگیا تھا۔ منگنی کی رسم کی ادائیگی کے لیے جائشہ کو لاکے اس کے ہونے والے منگیتر کے پہلو میں بٹھایا گیا تو محفل کو گویا چار چاند لگ گئے۔ رسم کی ادائیگی کے بعد تصویروں کا سلسلہ چل نکلا جس کے بعد مہمانوں کے لیے ارینج کیا گیا ڈنر لگا دیا گیا تھا۔

زیب بیگم کی ہدایت پہ مہر اور نویرہ' جائشہ کو اندر لے گئی تھیں۔ جہاں اس کی فرینڈز اور خاندان کی دیگر لڑکیوں نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ اندر باہر ہر طرف مسکراہٹوں اور خوش گپیوں کا سلسلہ تھا۔ مہر بھی جائشہ کی دونوں نندوں کے ساتھ لان میں کھڑی باتوں میں مصروف تھی جب انجم اور زیب اس کے پاس چلی آئیں۔ انہیں آتا دیکھ کر مہر دونوں لڑکیوں سے معذرت کرتی ماں اور خالہ کی جانب بڑھی۔

"بیٹا! تم ایسا کرو اندر جاؤ۔ اور نجیب سے کہہ کر میرے کمرے میں رکھے مہمانوں کے تحفے باہر لے آؤ۔" زیب بیگم کی بات پہ وہ اثبات میں سر ہلاتی اندر چل دی۔

نجیب (ملازم) سے سارے تحائف اٹھوانے کے بعد وہ اسے ساتھ لیے واپس لان میں پلٹی تو وہاں خوش گوار سی ہلچل دیکھ کے ایک پل کو الجھ سی گئی' لیکن جوں ہی اس کی نظر جائشہ کے سسرالیوں سے پرتپاک انداز میں ملتے حنان سے ٹکرائی اس کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا اور قدم غیر ارادی طور پہ ساکت ہو گئے۔ وہ یوں بنا بتائے پہنچ جائے گا' اس بات کا کسی کو اندازہ نہ تھا۔

"بی بی جی' یہ کہاں رکھوں؟" اسے اپنی جگہ پہ جما دیکھ کے چیزیں اٹھائے کھڑے نجیب نے آہستگی سے سوال کیا تو وہ خود کو سنبھالتی' سامنے لگے صوفوں کے درمیان میں رکھی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"وہاں رکھ دو۔ اور امی کو بتا دینا۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک لمحے کا توقف کیے بنا پلٹ کر تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

وہ اس شخص کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے جائشہ کے کمرے میں جانے کے بجائے سیدھا نویرہ کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ غصے میں لب بھینچے بیڈ پہ آ کے گر سی گئی تھی۔

یہ شخص اس کی زندگی کا وہ سیاہ باب تھا' جسے وہ چاہ کر بھی اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ کر الگ نہیں کر سکتی تھی۔ اس شخص نے رشتوں پہ اعتبار کے لائق نہ چھوڑا تھا۔

وہ اس پل ہمیشہ کی طرح خود کو بہت بے بس اور کمزور محسوس کر رہی تھی۔ جس کے پاس کوئی راہ فرار نہ تھی۔ ذہن تھا کہ الجھتا چلا جا رہا تھا۔ تب ہی باہر سے حنان کے ہنسنے اور نویرہ اور جائشہ کی حیرت سے بھرپور خوش گوار چہکاریں سنائی دی تھیں۔ یقیناً" وہ اندر جائشہ کے کمرے میں آچکا تھا اور بھائی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کے دونوں خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔

باہر مچے ہنگامے نے اس کے اندر دکھ کی نئی لہر پیدا کر دی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے۔ جس کی نظروں سے خود کو چھپانے کے لیے وہ اس کمرے کی تنہائی میں آ بیٹھی تھی یا پھر ہر مرد ہی دوہرے معیار کا قائل ہوتا ہے۔ اپنی بہنوں' بیٹیوں کے لیے کچھ اور۔ اور دوسروں کی عزتوں کے لیے کچھ اور......

موبائل کی اچانک بیل نے اس کی تلخ سوچوں کو بکھیر دیا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے پرس میں رکھا فون نکالا۔ جس کی اسکرین پہ انجم بیگم کا نام دیکھ کے اس کے لبوں پہ زخم خوردہ مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ گنتی کے چند ناموں کے سوا بھلا اس کی فکر کرنے والا تھا ہی کون؟

"کہاں ہو تم مہر؟ میں اور زیب کب سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔" اس کی "جی مما" کے جواب میں وہ پریشانی سے بولیں تو وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

"میں اندر نویرہ کے کمرے میں ہوں۔"

"وہاں اکیلی کیا کر رہی ہو بیٹا۔ باہر آ کے سب کے درمیان بیٹھو۔" ان کے رسان سے کہنے پہ وہ چڑ سی گئی۔

"پلیز مما جان! میں اس فضول شخص کی نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔" اس کی بات پہ انجم لمحے بھر کو خاموش ہو گئیں۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ وہ لازما" پہنچے گا۔" جھنجلاہٹ نے اسے غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں زیب سے کہتی ہوں کہ وہ تمہیں ڈرائیور کے ساتھ گھر بھجوا دے۔"

وہ لمحے بھر کے توقف کے بعد بولیں حالانکہ وہ چاہتی تھیں کہ مہر باہر آئے اور بالکل نارملی فنکشن اٹینڈ کرے، مگر بہر کیف وہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتی تھیں۔

"رفیق سے کہیے گا کہ وہ پورچ میں میرا انتظار کرے۔ میں دس، پندرہ منٹ تک باہر آتی ہوں۔"

اس نے ایک نظر دروازے کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک ہے، لیکن نکلنے سے پہلے مجھے کال کر دینا۔"

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے پونے دس ہونے کو تھے۔ فون بند کر کے وہ دروازے کی جانب چلی آئی، جس کی دوسری طرف سے اب بھی ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ تقریباً" دس منٹ بعد باہر سے آتے شور میں کمی واقع ہوئی تو مہر نے آہستگی سے دروازہ کھولتے ہوئے احتیاط سے باہر جھانکا، اور راہداری خالی دیکھ کے بے اختیار اطمینان بھری سانس لیتی باہر نکل آئی۔

اپنے پیچھے دروازہ بند کرتی وہ تیز قدموں سے داخلی دروازے کے بجائے راہداری کے دوسرے سرے پر موجود دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ جو گھر کے عقبی لان میں کھلتا تھا۔ وہاں سے وہ باآسانی کسی کی نظروں میں آئے بنا گھوم کر پورچ تک پہنچ سکتی تھی۔ محتاط انداز میں دروازہ کھول کے اس نے باہر نکل کر انجم بیگم کو کال ملائی۔

"مما! میں جارہی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تمہارے پاپا سے میں نے کہہ دیا ہے کہ تمہارے سر میں شدید درد ہے۔ اس لیے زیب تمہیں ڈرائیور کے ساتھ گھر بھجوا رہی ہے۔"

ان کے سمجھانے پر مہر نے ہنکارا بھرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اپنوں کے درمیان سے یوں چوری چھپے نکلنا اس کے اندر پژمردگی کے ساتھ غم و غصے کی شدید لہر بپا کر گیا تھا۔ اسے خود پہ، اپنی بے بسی پہ اور سب سے بڑھ کے اسے ان حالات تک پہنچانے والے پہ بے انتہا غصہ آرہا تھا۔ لب بھینچے وہ اپنے دھیان میں آگے بڑھی تھی، لیکن جوں ہی اس کی نظر سامنے کو اٹھی تھی اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

اس کے مقابل عمارت کی دوسری جانب سے بلیک ٹو پیس میں ملبوس حنان، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اسی کی طرف آرہا تھا۔

"جانتا تھا کہ مجھے اچانک سامنے پاکر تم یونہی فرار کی راہ اختیار کروگی، لیکن جان حنان! تم ہمیشہ یہ بات بھول جاتی ہو کہ تمہارے معاملے میں، میں ایک تیسری آنکھ بھی رکھتا ہوں اور وہ آنکھ میں کبھی بند نہیں کرتا۔"

اس سے محض چند فٹ کے فاصلے پہ رکتے ہوئے وہ گمبھیر لہجے میں کہتا استہزائیہ انداز میں مسکرایا تو مہر کی ہتھیلیاں بھینچ گئیں۔ وہ اس سے اس درجہ چوکسی کی امید نہیں رکھتی تھی۔

"پھر کہو کیسا لگا میرا سرپرائز؟ آئی مین دونوں سرپرائز؟" اس کے اڑے اڑے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔ مہر نے کڑی نظروں سے اس کے تیور دیکھے اور بنا کوئی جواب دیے پلٹ کر واپس اندر جاتے دروازے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ اس کی کلائی حنان کی مضبوط گرفت میں آگئی۔

"ہاتھ چھوڑو میرا!" اشتعال سے پلٹتے ہوئے اس نے غصے سے حنان کی طرف دیکھا۔

"تمہیں معلوم ہے! تمہاری یہ ضد، یہ گریز، میری محبت کو اور بھی ہوا دیتا ہے۔ اتنی ہوا کہ مجھے تم سے ہی نفرت ہونے لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے تمہیں توڑ مروڑ کے وہاں پھینک دوں۔ جہاں سے تمہارا خیال تک واپس نہ آئے۔" لبوں پہ یہ زہرخند مسکراہٹ اور آنکھوں میں عجیب سی برودت لیے اس نے مہر کی کلائی پہ اچانک اتنا دباؤ بڑھایا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

"حنان!"

"کیوں، درد ہوا جان حنان؟" اس کے چہرے سے چھلکتی تکلیف کو دیکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔

اور پھر اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے بے اختیار اس کا سرخ پڑتا ہاتھ لبوں سے لگالیا۔

"بہت۔ بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ اس کی یہ حرکت اتنی اچانک اور اتنی غیر متوقع تھی کہ مہر کا پورا وجود سناٹے میں آگیا لیکن محض لمحے بھر کے لیے۔ اگلے ہی پل اس کے اندر گویا وحشت سی بھر گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ گھوما مگر اس سے پہلے کہ حنان کے چہرے پر اپنا نشان چھوڑتا' اس نے ہوا میں ہی مہر کا ہاتھ روک لیا۔

"اوں ہوں۔ یہ غلطی کبھی مت کرنا۔ ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔" سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس نے جھٹکے کے انداز میں اس کے دونوں ہاتھ چھوڑے تو وہ اسے کھاجانے والی نظروں سے گھورتی تیزی سے پیچھے ہٹی۔

"حنان قاضی! اپنے اندر کی غلاظت کو اپنی ذات تک محدود رکھو۔"

"الفاظ وہ بولو جن کی چبھن کو بعد میں برداشت کرسکو۔ کیونکہ میں اپنی توہین کرنے والوں کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کیا کرتا۔" اس کی بات پہ مہر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"توہین ان کی ہوا کرتی ہے۔ جن کی کوئی عزت ہو۔ اپنے گھر میں نقب لگانے والے بے ایمان کو تو کوئی لٹیرا بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔"

"کیا شعلہ بیانی ہے۔ بہت خوب!" اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے۔

"لگتا ہے خاصی ہمت بندھائی گئی ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ تم اور تمہاری یہ دونوں زمینی نگہبان اگر چاہیں بھی تو تمہیں مجھ سے چھین نہیں سکتیں!"

"تم نے مجھے پایا ہی کس دن تھا؟" مہر نے تمسخرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دوبدو جواب دیا۔ تو حنان ایک پل کو واقعی لاجواب ہوگیا۔ اس کے چہرے پہ پھیلتی ناگواری مہر کو اندر تک پُرسکون کرگئی۔

"حنان صاحب! حقیقت آپ کے نہ ماننے سے بدل نہیں جائے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مہر کی زندگی میں کسی حنان قاضی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ آپ اپنی ہار تسلیم کرلیں اور میرے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جائیں۔"

"حقیقت تو تمہارے نہ ماننے سے بھی نہیں بدلے گی جانِ حنان۔ کیونکہ ایک حقیقت تو یہ بھی ہے کہ بے نشان لوگوں کو اتنے بڑے بڑے دعوے زیب نہیں دیتے!" اتنی کاری ضرب پہ مہر کا سارا خون چہرے پہ سمٹ آیا تھا۔ "اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ خود کو خوش گمانی کی اس تصوراتی دنیا سے باہر نکال کر ہمیشہ کے لیے میرا ہاتھ تھام لو!" کاٹ دار مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس نے اپنا ہاتھ مہر کی جانب پھیلایا۔ اس کا ایک ایک لفظ مہر کے اندر چنگاریاں سی بھر گیا۔

"یہ ہاتھ تھامنے سے بہتر ہے کہ میں تاعمر یوں ہی بے نشان کھڑی رہوں۔ کیونکہ تم میری زندگی کا وہ ناسور ہو حنان قاضی۔ جس نے میرا رشتوں پہ سے اعتبار ہی ختم کردیا۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں' شدید نفرت!" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر جاتے دروازے کی جانب بڑھی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے قدم دہلیز پار کرتے' حنان کی سرد آواز نے لحظہ بھر کو اس کی رفتار دھیمی کردی تھی۔

"نفرت کا یہ اظہار تمہیں بہت مہنگا پڑے گا مہر بی بی! اب دیکھنا میں تمہاری ہر خوش فہمی کی کیسے دھجیاں اڑاتا ہوں۔" اور مہر کا دل اس کی بات پہ تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا۔

مگر وہ بنا رکے دروازہ کھول کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

تاریک انجان گلیوں میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے اس نے خوف زدہ نظروں سے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔ اور ان خوفناک بھوکے کتوں کو اپنے پیچھے پوری رفتار سے آتا دیکھ کے اس کا سارا وجود کانپ اٹھا تھا۔ ایک جھٹکے سے رُخ موڑتے ہوئے اس نے وحشت زدہ

نظروں سے ارد گرد موجود بند دروازوں اور کھڑکیوں کو تکتے ہوئے چلا کر مدد کی استدعا کی تھی۔ لیکن اس کی صدا ان ویران گلیوں میں گونج کر واپس لوٹ آئی تھی۔

اس کی ٹانگیں بھاگ بھاگ کر شل ہونے لگی تھیں۔ بے تحاشا پھولتی سانس اور جلتا حلق اس کی برداشت کو آخری حد پہ لے آیا تھا۔ اس کی رفتار کم ہونے لگی تھی۔ رال ٹپکاتے، غراتے ہوئے کتے قریب آنے لگے تھے۔ تب ہی اچانک سامنے ایک دروازہ نمودار ہوا تھا۔ جو اس کی مدد کے لیے کھول دیا گیا تھا۔

کھلا دروازہ دیکھ کے اس کے پست ہوئے وجود میں نئی جان پڑ گئی تھی۔ وہ دیوانہ وار اپنی پہلی اور شاید آخری پناہ گاہ کی جانب بھاگنے لگا تھا۔ اس کے قدموں نے دہلیز کو چھو لیا تھا۔ لیکن۔ اندر جانے کے بجائے وہ۔ وہ وہیں ساکت ہو گیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ مڑا تھا اور اس نے دوسری جانب دوڑ لگا دی تھی۔ کھلا دروازہ کھلا ہی رہ گیا تھا۔

تاریکی بڑھنے لگی تھی۔ اچانک اس کا پاؤں کسی خاردار چیز میں الجھا تھا۔ اور وہ منہ کے بل کچرے کے ڈھیر میں جا گرا تھا۔ تیز بدبو اس کے ناک اور منہ میں گھسنے لگی تھی۔ اس کے روم روم پہ قابض ہونے لگی تھی۔ وہ مارے اذیت اور کراہیت کے چلا اٹھا تھا۔

"بچاؤ!"

اٹھارہ گھنٹے سے بے سدھ پڑے سیم کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئی تھیں۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ جبکہ ہونٹ بالکل سوکھے پڑے تھے۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے بے قراری سے اپنے سر کو جنبش دینا چاہی تھی۔ لیکن اس کوشش میں بے اختیار کراہ اس کے لبوں سے نکل گئی تھی۔

اس کی آواز پہ اپنے کام میں مصروف نرس نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اور اسے ہوش میں دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب چلی آئی تھی۔

"مجھے۔ مجھے نکالو یہاں سے۔ یہاں۔ یہاں بہت بدبو ہے۔" ہر طرح کی پہچان سے عاری، خالی نظریں اس کے چہرے پر جمائے وہ نحیف لیکن متوحش آواز میں بولا تو نرس نے تسلی آمیز انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ریلیکس مسٹر سیم۔"

"یہ غلاظت مجھے گندہ کر رہی ہے۔ وہ دیکھو۔ وہ کتے مجھے نوچ کھائیں گے۔ مم۔ مجھے۔ مجھے یہاں سے نکالو۔ بچاؤ! بچاؤ!" وہ اچانک بے قابو ہو کے زور زور سے چلانے لگا۔

اس کے ہسٹریائی انداز نے نرس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے اس نے سرعت سے آگے بڑھ کے ایمرجنسی بیل کا بٹن دبایا۔ چند ہی سیکنڈ میں ڈیوٹی پہ موجود دو ڈاکٹرز مع اسٹاف کے وہاں بھاگے چلے آئے تھے۔ اس کی بگڑتی حالت کے پیش نظر ڈاکٹرز نے اسے سکون آور انجکشن لگا دیا تھا۔ جس کے زیر اثر وہ تھوڑی ہی دیر میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اعصاب شکن تھکن مہر کے اندر اتر آئی تھی۔ وہ چپ چاپ آ کے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ انجم اور زیب اس تمام واقعے سے لاعلم تھیں، سو اس نے انہیں لاعلم رکھنے کا ہی فیصلہ کیا تھا۔ کیا فائدہ تھا انہیں بھی اپنے ساتھ جلانے کا۔

گاڑی کی خاموش فضا میں اس کے بے آواز آنسو قطرہ قطرہ بہتے رہے تھے۔ لیکن اپنے کمرے کی چار دیواری میں پہنچ کر اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

حنان نے کچھ بھی تو غلط نہیں کہا تھا۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے بھلا حقیقت تھوڑی بدل جاتی ہے۔ اور وہ گزشتہ کئی سالوں سے یہی تو کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ایسا کرتے ہوئے دنیا کی نظر میں وہ کتنی احمق، کتنی قابل رحم لگ رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی ایسا کر رہی تھی۔ زیب کے لیے۔ مما جان کے لیے۔ پاپا کے لیے۔ اور شاید اپنے لیے بھی۔ کہ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

لیکن حنان کے منہ سے یہ سچائی اس کے دل و دماغ پہ کوڑے کی طرح برسی تھی۔ کیونکہ یہ وہ شخص تھا جس کے سامنے وہ اپنا بھرم ہر حال میں قائم رکھنا چاہتی تھی۔ پھر چاہے ساری دنیا کتنی باتیں کیوں نہ بنالیتی۔ لیکن یہ ایک شخص کبھی نہیں!

صابن سے اپنا ہاتھ مل مل کے دھوتے ہوئے اس کی آنکھوں سے نہ تو آنسو رک رہے تھے اور نہ ہی ہاتھ کی پشت پہ سے ان لبوں کا احساس مٹ رہا تھا۔ آنسو' پانی' جھاگ تینوں چیزیں اکٹھی سنک میں بہہ رہی تھیں۔ ہاتھ کی جلد سرخ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی بے قراری کو چین نہیں آرہا تھا۔ اور آتا بھی کیونکر۔ اسے کوئی ایک تو نہیں بلکہ کئی نقصان مل کر رلا رہے تھے۔ وہ نقصان جن کا گھوم پھر کر سارا خسارہ صرف اس کے حصے میں آیا تھا۔ اور وہ اس خسارے کو برداشت کرتے کرتے اب نڈھال ہو گئی تھی۔

اپنے تھکے ہوئے وجود کو گھسیٹتی وہ بیڈ پہ آکے گر گئی تھی۔ اس کا دل شدت سے اس پل ان تمام اذیتوں سے قرار کا خواہش مند تھا۔ مگر چونکہ اسے بہلانے کا کوئی سامان اس کے پاس نہ تھا۔ اس لیے وہ ابراہیم صاحب کے کمرے سے جاکر نیند کی ایک گولی لے آئی تھی۔

پانی کے ساتھ اس گولی کو نگلتے ہوئے اسے مہر احمد کے اس انجام پہ بے اختیار رونا آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا آپ یقین سے کہہ رہے ہیں مسٹر سیم! کہ یہی سب کچھ ہوا تھا؟" آفیسر نے اس کا بیان قلم بند کرنے کے بعد بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ جو تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔

"جی۔" وہ بنا کسی تاثر کے دھیرے سے بولا تو آفیسر نے اس کے پاس کھڑے مارک کو دیکھتے ہوئے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"اس صورت میں تو کسی کے خلاف کوئی پرچہ نہیں بنتا۔" اور مارک جو اتنی دیر سے سیم کی کہانی سن رہا تھا' بے اختیار اپنا غصہ دبا کر رہ گیا۔ وہ ایک سو ایک فیصد جانتا تھا کہ سیم غلط بیانی کر رہا ہے۔

"آپ کی گاڑی انشورڈ تھی؟" پولیس آفیسر نے ایک بار پھر سیم کی جانب دیکھا۔

"جی۔"

"چلیں پھر۔ خدا آپ کو جلد صحت یاب کرے۔" وہ اسے وش کرتا' کمرے سے باہر نکل گیا' مارک جیسے پھٹ پڑا۔

"تم نے آفیسر سے جھوٹ کیوں بولا۔"

"میری مرضی۔" اس کی طرف دیکھے بنا جواب دیا۔ مارک کا دماغ گھوم گیا۔

"سیم! مجھے مزید پاگل مت کرو۔ تم نہیں جانتے' میں نے یہ دو دن کس ذہنی اذیت میں مبتلا رہ کر تمہارے ہوش و حواس بحال ہوجانے کا انتظار کیا ہے۔"

"جانتا ہوں۔"

"تو پھر تم بتاتے کیوں نہیں کہ تم اس رات اس علاقے میں کیا کر رہے تھے؟" وہ جھنجلا کر بولا تو سیم کے وجود سے تعفن کا وہ کرب ناک احساس پھر سے لپٹنے لگا۔

بے اختیار مٹھیاں بھینچے اس نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"پلیز مارک؟ مجھے پریشان مت کرو!" اور مارک اسے بے بس نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ تب ہی موبائل کی بیل نے اس کا دھیان اپنی جانب کھینچ لیا۔ اسکرین پر جوزفین کا نام دیکھ کے اس نے فون کان سے لگالیا۔

"سنا تم نے اس شخص کا کارنامہ۔ آفیسر کو بیان دیا ہے کہ میں ایک پرانے دوست کو ڈھونڈنے اس علاقے میں گیا تھا۔ جب اس گلی میں' مجھے کچھ غنڈوں نے گھیر لیا اور مار پیٹ کرنے کے بعد میری قیمتی چیزیں چھین لیں۔" اس کی "ہیلو" کے جواب میں وہ کھولتے لہجے میں بولا تو آنکھیں موندے سیم نے بے اختیار اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔ وہ اسے کیسے بتاتا

کہ یہ ذکر اس کے لیے کتنی ذہنی اذیت کا باعث بن رہا تھا۔

"کیا فضول بات کر رہی ہو۔ کیا میں نہیں جانتا کہ اس کے کتنے دوست اس کلاس سے بی لانگ کرتے ہیں؟ ویسے بھی میرے پوچھنے پہ بتا چکا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔" اس نے ایک پتی نگاہ سامنے لیٹے سیم پہ ڈالی۔

"مجھے کیا معلوم ایسا کیوں کر رہا ہے' میں تو خود پریشان ہو کر رہ گیا ہوں۔" وہ لحظہ بھر کو رک کر جوزفین کی بات سننے کے بعد گویا ہوا۔

"اچھا یاد آیا۔ تم سیم کے لیے گیسٹ روم تیار کروینا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ کل چیک اپ کے بعد..."

"کل یا پرسوں۔ میں تمہاری طرف نہیں جاؤں گا۔" وہ آنکھیں بند کیے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ تو مارک نے غصے سے اس کی جانب دیکھا۔

"تو کہاں جاؤ گے؟"

"اپنے گھر۔"

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ وہاں کون تمہارا خیال رکھے گا؟" مارک نے اب کے اپنے غصے کو ایک طرف رکھتے ہوئے تحمل سے کام لیا۔

"میں کرلوں گا مینیج... تم جانتے ہو' مجھے کسی کی پرسنل لائف ڈسٹرب کرنا پسند نہیں۔" اب کے وہ آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے کی قطعیت' مارک کو اک گہری سانس لینے پہ مجبور کر گئی۔

"وہ نہیں مان رہا۔ تم ایسا کرنا آفس سے واپسی پہ سیم کے گھر کی ایکسٹرا چابی گھر جا کے اٹھا لینا اور وہاں جاکے گروسری وغیرہ چیک کرلینا۔" اس نے جوزفین سے کہتے ہوئے پرسوچ نظروں سے سیم کو دیکھا اور ایک آدھ مزید بات کرنے کے بعد فون بند کردیا۔

"تم جانتے ہو! تم ضدی اور من مانی کرنے والے پہلے ہی تھے' لیکن اس ایکسیڈنٹ کے بعد سے تو تمہارا رویہ بہت عجیب ہو گیا ہے۔" اس پر نظریں جمائے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا' سیم کے سرہانے آکھڑا ہوا تو وہ اک بوجھل سانس لیتا چہرہ جھکا گیا۔

"کیا بات ہے سیم' سب ٹھیک تو ہے نا؟" اس کی خاموشی مارک کو تشویش میں مبتلا کر گئی تھی۔ یہ خاموشی اس کی آزاد' شوخ وشنگ اور سیمابی طبیعت کے بالکل برعکس تھی۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں۔" وہ دل گرفتی سے فقط اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ اپنے اندر اتر آنے والے خوف کو فی الوقت زباں دینے کا اس میں حوصلہ نہ تھا۔

"کیا مطلب؟" مارک نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔

"کوئی مطلب نہیں... میں خود نہیں جانتا' مجھے کیا ہو رہا ہے۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے پھر سے آنکھوں پہ بازو رکھ لیے۔ اس کے ناقابل فہم انداز نے مارک کو پریشان کردیا۔ وہ کتنے ہی پل اسے الجھی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے ڈاکٹر سے ڈسکس کرنے کے ارادے سے باہر نکل گیا۔

اس کی غیر موجودگی کے احساس پہ سیم نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بجھی بجھی سی خالی نگاہیں بے تاثر انداز میں سامنے دیوار پہ جا ٹھہری تھیں... سفید' سیدھی اور سپاٹ دیوار۔ نجانے کیوں اس کمرے اور اس بستر پہ آکے زندگی یک لخت ساکت ہوگئی تھی۔ یوں جیسے وہ کسی "رولر کوسٹر" سے اچانک نیچے اتر آیا ہو' جو اسے لیے اوپر' نیچے' دائیں بائیں بھاگی چلی جارہی تھی' تیز اور تیز بہت تیز!

اور اب جو یہ شور مچاتا غوطے کھاتا سفر ایک جھٹکے سے رکا تھا تو وہ خود بھی بھونچکا سا رہ گیا تھا۔ واہموں اور اندیشوں میں گھرا۔ ایک دم اکیلا۔ حالانکہ اس کی زندگی کا محور و مرکز تو ہمیشہ سے صرف اس کی اپنی ذات ہی رہی تھی۔ پھر ایسے میں اس زندگی میں یکایک یہ تنہائی کا احساس کہاں سے اتر آیا تھا۔ وہ حیران تھا... بہت حیران۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا جس کی انہوں

نے بڑے بھرپور انداز میں پرورش کی تھی اور یہ اس کے نزدیک ان کا کوئی احسان نہ تھا' اس کا باپ ایک دولت مند انسان تھا سو اگر انہوں نے اسے زندگی کی ہر آسائش مہیا کی تھی تو کوئی انوکھا کام نہیں کیا تھا۔ رہا ان کا پیار و محبت تو وہ بھی ایک قدرتی امر تھا جس کے بدلے میں اس نے بھی انہیں چاہا تھا۔ پھر بھلا وہ اب اور کیا کرتا؟ کیا اس کی اپنی کوئی زندگی' کوئی خواہشات نہ تھیں؟

وہ آگے بڑھا تھا اور اپنی ترجیحات کے مطابق آگے بڑھا تھا۔ دولت کو اس نے اپنی زندگی میں اولین ترجیح پہ رکھا تھا' جس کی طاقت اور اہمیت سے وہ ہمیشہ بہ خوبی واقف رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امریکا جیسے ملک میں جو طرز زندگی وہ گزار رہا ہے' وہ فقط اس کے باپ کی جانب سے ملنے والی دولت کے بل پہ ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس نے اپنے دوست مارک کے ساتھ مل کر اپنی ذاتی فرم بنائی تھی جس نے اس پر کامیابی کے نئے دروازے کھول دیے تھے۔ اپنی ذات کے حوالے سے اس کے فیصلے ہمیشہ جوش کے بجائے ہوش پر مبنی رہے تھے اس نے رشتے ناتوں کو کبھی بھی اپنی کمزوری نہیں بننے دیا تھا۔

نتیجتاً" وہ آج اپنی مرضی کی ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزار رہا تھا۔

لیکن اس حادثے نے یکایک اس کی اس کامیاب اور بھرپور زندگی پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیا تھا۔ اسے اس خوف سے دوچار کر دیا تھا جس کے بارے میں اس نے آج تک سوچا ہی نہ تھا۔

اس رات کچرے کے ڈھیر پہ صرف وہ ہی نہیں بلکہ خود سے جڑی اس کی بہت سی خوش فہمیاں بھی ڈھیر ہوئی تھیں۔ لوگوں کی ہر طرح کی گندگی نے جب اس کے تن کو بستر کی طرح چھوا تھا اور اس چبھتی ہوئی نہایت تیز بدبو نے جب اس کی ناک اور منہ میں راستہ بنایا تھا۔ تب اسے حقیقی معنوں میں اپنی اوقات اور اپنی طاقت کا احساس ہوا تھا۔ وہ کیا تھا اور حالات اسے لمحوں میں بے بسی کی کس انتہا پر پہنچا سکتے تھے یہ اسے اس روز پتا چلا تھا اس خوف نے ہوش میں آنے کے بعد اس کے اندر پنجے گاڑ دیے تھے۔ اسے زندگی میں پہلی بار وقت اور حالات سے ڈر لگا تھا۔ اپنی موت سے ڈر لگا تھا۔

وہ مخمل کے بستر پہ پیدا ہوا تھا' لیکن اسی مخمل کے بستر پہ مرتا' یہ ضروری نہیں تھا۔

اس روز اگر اسے اس کچرے کے ڈھیر پہ موت آجاتی یا پھر اس کا بے ہوش وجود ہی چوہوں اور آوارہ کتوں کی خوراک بن جاتا تو کیا ہوتا اس کا؟

کیا وہ اگلی صبح ایک گلی سڑی لاوارث لاش کی صورت لوگوں کو ملتا۔ جس سے وہ خوف کھاتے پولیس کے حوالے کر دیتے؟ کیا اس نے اپنا ایسا ہی بھیانک انجام تصور کیا تھا؟ یقیناً" نہیں۔

لیکن خود مختاری اور آزادی کی جس زندگی کا وہ پروردہ تھا۔ اس کا ایک نہ ایک دن اور کہیں نہ کہیں ایسا ہی تنہا اور گمنام خاتمہ ہونا تھا اور یہ ایک طے شدہ بات تھی' مگر اسے اس سفاک حقیقت کا احساس زخمی حالت میں اس بستر پر پہنچنے کے بعد ہوا تھا اور اس جان لیوا احساس نے اس کے اندر سے سود و زیاں کے ہر حساب کو ختم کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس وجہ کو بھی فراموش کر گیا تھا جو اس حادثے کا سبب بنی تھی۔ اس رات وہ وہاں کیسے پہنچا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہوا تھا ہر بات' ہر چیز بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کی زندگی کی ترجیحات نے یکایک جیسے پلٹا کھایا تھا۔ امارت' اسٹائل' دوست' عورت اس فہرست میں کہیں نیچے چلی گئی تھیں۔ اور ان سب پہ حاوی ہو گیا تھا۔ فقط ایک موت کا احساس۔ موت جو اپنے شکار کو مہلت نہیں دیتی۔ موت جس کا ذائقہ سب نے چکھنا ہے۔

☆ ☆ ☆

"تم نے مجھے پایا ہی کس دن تھا؟ تم میری زندگی کا ناسور ہو۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں' شدید نفرت!" آئینے کے سامنے کھڑے حنان نے پرفیوم

اسپرے کر کے بوتل زور سے ڈریسنگ ٹیبل پہ پٹخی تھی۔

"ٹھیک ہے مہر صاحبہ! آج اس آنکھ مچولی کا بھی اختتام کرتے ہیں۔" اس نے ایک آخری نظر خود پہ ڈالی اور مطمئن سا کمرے سے نکل کر نیچے ڈائننگ روم کی طرف چلا آیا تھا۔ جہاں اس وقت سب ہی گھر والے ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔

"السلام علیکم!" سب کو سلام کرتا وہ باپ کے بائیں جانب اپنی مخصوص کرسی کی طرف بڑھا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔ کیسے ہو بیٹا؟" صغیر صاحب نے اخبار پہ سے نظریں ہٹاتے ہوئے بیٹے کو دیکھا۔

"فائن۔ ڈیڈی' میں کل ڈیل فائنل کر کے آیا تھا۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ سرپرائز کے چکر میں' میں کام کسی اور کے ذمے چھوڑ آیا ہوں۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا تو صغیر صاحب مسکرا دیے۔

"تمہیں مجھ سے بہت سے گلے سہی' لیکن تمہارے پروفیشنل ازم پر میں نے کبھی شک نہیں کیا۔"

"چلیں شکر ہے۔ آپ کو میری کوئی ادا تو بھائی۔" اس نے سلائس پلیٹ میں رکھا۔

"اوں ہوں۔ صبح صبح کوئی تلخ بات نہیں۔" نوریہ نے نرمی سے ٹوکتے ہوئے بھائی کے لیے پلیٹ میں انڈہ نکالا۔

"کل مہر نظر نہیں آئی مجھے۔ کیا اس نے فنکشن اٹینڈ نہیں کیا؟" اس نے ایک نظر چائے بناتی زیب بیگم پہ ڈالتے ہوئے نوریہ کی جانب دیکھا۔ اس کے منہ سے مہر کا نام سن کے حسب توقع زیب کا چہرہ تن گیا۔ جسے حنان نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے خاصا حظ اٹھایا تھا۔

"نہیں ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟ جاشی کو' آپی اور میں نے ہی مل کر تیار کیا تھا۔" نوریہ کے جواب پر اس نے چونکنے کا تاثر دیا۔

"اچھا! تو پھر وہ مجھے نظر کیوں نہیں آئی؟"

"اس کے سر میں درد تھا۔ اس لیے وہ جلدی چلی گئی تھی۔" جواب نوریہ کے بجائے زیب بیگم کی طرف سے آیا تو حنان کی سرد نگاہیں ان کی پرتپش نگاہوں سے جا ٹکرائیں۔

"جلدی چلی گئی تھی یا بھیج دی گئی تھی؟" اس کے استہزائیہ انداز نے زیب بیگم کو اندر ہی اندر خائف کر دیا۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے ایک اچٹتی نظر صغیر صاحب پہ ڈالی۔ حنان انہیں کوئی جواب دیے بنا باپ کی جانب رخ پھیر گیا۔

"پتا نہیں' آپ لوگوں نے محسوس کیا ہے یا نہیں' لیکن مجھے لگتا ہے انجم آنٹی کو مہر کا یہاں زیادہ آنا پسند نہیں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" صغیر صاحب نے الجھ کر بیوی کی جانب دیکھا۔ جو خود بھی حنان کی اس بات سے پریشان ہو گئی تھیں۔ جاشہ اور نوریہ بھی ہاتھ روکے بھائی کی طرف متوجہ تھیں۔"

"ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ان فیکٹ مجھے تو مہر بھی ڈپریشن کا شکار لگنے لگی ہے۔" وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولا تو صغیر صاحب پریشان ہو گئے۔

"ہو سکتا ہے بیٹا! آخر وہ بھی تو انسان ہی ہے۔"

"تو آپ لوگ اس مسئلے کو حل کیوں نہیں کرتے؟" اور زیب لمحے میں بھانپ گئیں کہ وہ کس ارادے کے تحت یہ ساری گفتگو کر رہا تھا۔

اگر صغیر قاضی اور دونوں بچیاں وہاں موجود نہ ہوتیں تو وہ اس لڑکے کا دماغ ٹھکانے لگا دیتیں۔ اندر ہی اندر کھولتے ہوئے انہوں نے "فوراً" سے پیشتر مداخلت ضروری سمجھی تھی۔

"وہ اپنے مسئلے خود حل کر سکتے ہیں۔"

"آپ شاید بھول رہی ہیں' یہ ہمارا بھی مسئلہ ہے۔ رہیں انجم آنٹی اور ابراہیم انکل تو ان لوگوں کی نیت اگر حل کرنے کی ہوتی تو بہت پہلے اس معاملے کو حل کر چکے ہوتے۔" حنان نے پلٹ کر جتایا تو زیب نا چاہتے ہوئے بھی خاموش ہو گئیں۔ ان کی خاموشی پر حنان کی آنکھوں میں کاٹ دار سی چمک بھر گئی۔ جسے

زیب بیگم کے سوا وہاں بیٹھا کوئی بھی شخص محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ مارے ضبط کے ان کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔

"ویسے اگر دیکھا جائے زیبی! تو حنان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اب اس بارے میں آپا اور بھائی جان سے بات کرنا چاہیے۔" اور باپ کی بات پہ حنان کا دل چاہا تھا کہ وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔ اس کی تمسخر اڑاتی نظریں بے اختیار زیب بیگم کی جانب اٹھی تھیں۔ جنہیں انہوں نے کمال حوصلے سے نظرانداز کر دیا تھا۔

"کوئی فائدہ نہیں صغیر صاحب! مہر اس معاملے میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔"

"وہ بچی ہے زیبی اور ابھی اتنی دور اندیش نہیں ہوئی کہ اس کے فیصلوں کو ہم حتمی مان کر خاموش بیٹھے رہیں۔" وہ قدرے خفگی سے گویا ہوئے تو زیب گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ نہیں مانتے اس کی بات، لیکن آپ نے سوچا ہے اس زور زبردستی کا کیا نتیجہ نکلے گا؟"

"جو بھی نکلے گا، موجودہ صورت حال سے تو بہتر ہی ہو گا۔" انہوں نے چائے کی پیالی اپنی جانب سرکائی۔

"تم آج آپا کو انفارم کر دینا کہ کل ہم ان کی طرف چکر لگائیں گے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ جو بھی بات ہو گی روبرو ہو گی۔" ان کے حتمی لہجے پہ زیب بیگم نے پریشان نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا تھا۔

جبکہ حنان کا دل اپنی اس فتح پہ اندر تک سرشار ہو گیا تھا۔ بات نے بہت جلدی اور بہت آسانی سے اس کی مرضی کا رخ لے لیا تھا اس نے ایک فاتحانہ نگاہ زیب بیگم کے مضطرب چہرے پر ڈالی اور لبوں پہ در آنے والی کاٹ دار مسکراہٹ کا گلا گھونٹنے کو چائے کا کپ اٹھا کے لبوں سے لگا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر نے سیم کی ذہنی حالت کو اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے سے منسوب کرتے ہوئے ذہنی دباؤ کا نتیجہ قرار دیا تھا جو اس کے بقول رفتہ رفتہ ہی زائل ہو تا۔ ڈاکٹر کی بات سے مارک کو خاصا اطمینان ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر مزید اسپتال میں ٹھہرنے کے بعد آفس چلا آیا تھا۔

سیم کی غیر موجودگی کے باعث کام کا سارا بوجھ اس پہ آپڑا تھا۔ وہ ان ڈھائی، تین دنوں میں اسپتال اور دفتر کے درمیان حقیقتاً "گھن چکر بن کے رہ گیا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے ماتھے پہ شکن تک نہ آئی تھی۔ وجہ اس کی حد سے زیادہ پر خلوص اور نرم طبیعت تھی۔ وہ خود سے جڑے سب ہی لوگوں کا جن میں اس کے دوست بھی شامل تھے خیال رکھنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا۔

اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے مغرب کے سرد سینے میں مشرقی اقدار نے پر حدت الاؤ روشن کر دیا ہے۔

اس کی اس درجہ جذباتی طبیعت کا سیم اکثر مذاق اڑایا کرتا تھا، لیکن وہ برا مانے بغیر مسکرا دیا کرتا تھا۔ ابھی بھی وہ کام کرتے ہوئے مسلسل اسی نقطے پر سوچ رہا تھا کہ آیا اسے اس حادثے کے بارے میں سیم کے والدین کو آگاہ کرنا چاہیے یا نہیں، جب اس کے سیل پہ آنے والی جوزفین کی کال نے اس کا دھیان ہٹا دیا تھا۔

"ہاں جوزی! کہو۔"

"میکی! تم جلدی سے سیم کے گھر پہنچو۔ یہاں بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔" جوزفین کی گھبرائی ہوئی آواز نے مارک کو پریشان کر دیا تھا۔

"کیسی گڑبڑ؟" اس نے متفکر لہجے میں سوال کیا۔

"مارک! یہاں۔ یہاں چوری ہو گئی ہے۔"

"کیا؟" وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب کیا ہو گا۔ اگر بھائی جان نے بھی صغیر صاحب کی تائید کی تو ہم کیا کریں گے؟" روتی ہوئی زیب نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔

صغیر قاضی اور حنان کی دفتر روانگی کے بعد زیب ہائی بلڈ پریشر کا بہانہ کیے کمرے میں چلی آئی تھیں۔ اندر آنے کے بعد انہوں نے ملازمہ سے کارڈلیس منگوا کر بہن کو فون ملایا تھا اور صغیر صاحب کے پیغام سے لے کر پوری بات ان کے گوش گزار کردی تھی۔

"اگر نہیں۔ وہ یہی کریں گے۔ میں جانتی ہوں۔" انجم دل گرفتہ لہجے میں بولیں تو زیب بیگم رونا بھول گئیں۔

"ہائے آپا! اب پھر ہم کیا کریں؟" ان کی پریشانی سوا ہو گئی تھی۔ انجم نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔

"کرنا کیا ہے۔ ہم مکمل طور پر بے بس ہیں زیبی! سچ پوچھو تو میرے پاس صغیر کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں۔"

"تو پھر کل کیا ہوگا؟" ان کے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔

"اللہ جانے۔" بوجھل انداز میں کہتی وہ پل بھر کو رکیں۔

"ویسے زیبی! اگر دیکھا جائے تو اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی پڑے گا۔ ہم کب تک آنکھوں پر پٹی باندھے 'حقیقت کو نظر انداز کرتے رہیں گے۔" انہوں نے انتہائی حوصلے سے بہن کو سمجھایا۔

"آپ کا کیا خیال ہے 'کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ مہر کی ہر تکلیف کا خاتمہ ہو جائے؟" انہوں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔

"لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ بھی تو سوچیں۔"

"ہونا کیا ہے۔ اگر حنان 'مہر سے اتنی ہی محبت کا دعوے دار ہے تو ٹھیک ہے' اسے بھی آزما لیتے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولیں تو زیب تلخی سے مسکرا دیں۔

"یہ محبت نہیں صرف ضد ہے۔ زیر کرنے کی ہوس ہے اور آپ یہ بات اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ برسوں کے آزمائے ہوئے کو بھلا کیا آزمانا آپا۔۔۔ اور مہر' آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ اس کے لیے مان جائے گی؟ وہ تو اس کے سائے تک سے دور بھاگتی ہے۔ وہ کبھی بھی حنان کے لیے راضی نہیں ہوگی۔" ان کی بات پر انجم بیگم کو تھکن اپنے روم روم میں اترتی محسوس ہوئی۔

"زندگی اس عمر میں آکے اتنی تلخ' اتنی مشقت بھری ہو جائے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ زیبی نجانے اللہ نے ہم دونوں بہنوں کی قسمت میں اولاد کا سکھ کیوں نہیں لکھا؟" ان کے دل گرفتہ لہجے پر زیب بیگم کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئیں۔

"میں اگر حنان کے آج کے عمل دخل اور کوشش کو ایک طرف رکھ دوں۔ تب بھی صغیر نے ایک نہ ایک دن تو یہ سوال اٹھانے ہی ہیں' پھر کیوں نہ ابھی سہی۔ تم آنے دو اسے' دیکھتے ہیں کل ابراہیم کیا جواب دیتے ہیں۔"

"اور مہر؟" زیب کو فکر لاحق ہوئی۔

"اسے میں فی الوقت پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ بات تو ویسے بھی ہم چاروں کے درمیان ہی ہونی ہے۔"

"لیکن میں آج حنان سے ضرور بات کروں گی۔" زیب کے تصور میں اس کا سرشار چہرہ اور جتاتی نظریں گھومیں تو ان کا غصہ پھر سے تازہ ہو گیا۔

"کیا فائدہ۔ کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔" انجم بیگم نے سمجھانا چاہا۔

"نہیں آپا۔ آج جو اس لڑکے نے کیا ہے' اس کے بعد مجھے ہر حال میں اس سے بات کرنی ہے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" ان کے قطعی لہجے پہ وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سیم کے بیڈ روم میں 'مارک گنگ سا دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیڈ پہ بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی بے خبری پہ خود کو کوسے یا سیم کے راز داری برتنے پر اس سے سوال کرے۔

دھیرے سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے بے یقینی سے ایک بار پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھے فوٹو فریم کی طرف دیکھا اور اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔

جوزفین کی کال سننے کے بعد وہ اندھا دھند گاڑی

دوڑاتا سیم کے اپارٹمنٹ پہنچا تھا۔ طرح طرح کے واہمے اور وسوسے سارا راستہ اسے پریشان کرتے رہے تھے۔۔۔ یہ سب آخر ہو کیا رہا تھا؟

جوزی اسے پریشانی کے عالم میں اپارٹمنٹ کے باہر ہی ٹہلتی نظر آئی مارک کو دیکھ کر وہ بے اختیار اس کی جانب لپکی تھی۔ جوزفین کا ہاتھ تھامے وہ گھر کے اندر چلا آیا تھا۔ اس کی توقع کے برعکس اندر کسی قسم کی کوئی بے ترتیبی نہ تھی بلکہ پہلی نظر میں کہیں کسی گڑبڑ کے آثار نہ تھے' مگر جوزفین کے بتانے پر اسے بہت سی قیمتی چیزیں اپنی جگہ سے غائب نظر آنے لگی تھیں۔

کام واقعی نہایت اطمینان اور طریقے سے کیا گیا تھا۔ یوں جیسے آنے والے کو سیم کی اچانک آمد کا کوئی دھڑکا نہ ہو۔ تو کیا چور یہ جانتا تھا کہ سیم زخمی ہے یا زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہے؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ سیم کے ساتھ ہونے والے حادثے اور گھر میں ہونے والی چوری کے پیچھے ایک ہی شخصیت ملوث تھی؟ اس خیال نے مارک کو چونکا دیا تھا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ وہ سیم کے بیڈ روم کی جانب بھاگا تھا تاکہ اس کی الماری میں موجود لاکر کو چیک کر سکے' نا سمجھی کے عالم میں جوزفین بھی اس کے پیچھے لپکی تھی۔ ڈریسنگ روم میں موجود دیوار گیر الماری کھول کر اس نے لاکر کو چھوا تھا اور وہاں آٹومیٹک کوڈ والا سسٹم دیکھ کے اس نے بے اختیار اطمینان بھری گہری سانس لی تھی۔

"شکر ہے' یہ تو محفوظ رہا۔" جوزفین نے بھی شکر کا کلمہ ادا کیا۔ مارک اب ایک ایک کر کے باقی خانے اور دراز کھول کے دیکھ رہا تھا۔

"اب ان میں سے کیا کچھ غائب ہے' یہ تو سیم ہی بتا سکتا ہے۔" جوزفین نے کہتے ہوئے آگے بڑھ کر الماری کا آخری پٹ کھولا۔

"آل۔۔۔ یہ کس کے کپڑے ہیں؟" ترتیب سے لٹکے لیڈیز ڈریسز کو دیکھتے ہوئے وہ ایک پل کے لیے ٹھٹک گئی تھی۔ اس کی بات پہ مارک سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا اور بغور سامنے لٹکے کپڑوں کو دیکھنے لگا۔

"کیا پتا سوزی کے ہوں۔" اس نے خیال آرائی کی۔

"سوزی کے؟ اور اتنے سستے سے کپڑے۔" جوزفین نے پلٹ کر اسے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کے ایک شرٹ کی آستین اونچی کرتے ہوئے مارک کو دکھائی۔

"تو پھر یہ کس کے ہو سکتے ہیں؟" مارک کی آنکھوں میں الجھن در آئی۔ اس نے جوزفین کو ایک طرف کیا اور آگے بڑھ کے اندر موجود دیگر خانوں کو کھنگالنے لگا' مگر سوائے ایک ٹوٹے ہوئے پرس اور دو جوڑی سستے سے استعمال شدہ جوتوں کے وہاں اور کچھ نہ تھا۔ اس دوران جوزفین اندر بیڈ روم میں جا چکی تھی۔

"مارک! جلدی ادھر آؤ!" چند لمحوں بعد اسے جوزی کی پکار سنائی دی تو وہ تیزی سے کمرے کی جانب پلٹا جہاں جوزفین سائیڈ ٹیبل کے پاس ہاتھ میں فوٹو فریم لیے کھڑی تھی۔

"یہ سیم کے ساتھ کون ہے؟" اور مارک نے آگے بڑھ کے فریم اس کے ہاتھ سے لے لیا جس میں ایک مسکراتا ہوا گندمی چہرہ' سیاہ چمکتے بالوں کے درمیان' سیم کے شانے سے ٹکا ہوا تھا۔ اس چہرے کو دیکھتے ہوئے مارک کی آنکھیں بے اختیاری کے عالم میں پھیل گئی تھیں اور اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"یہ۔ یہ تو۔۔۔"

☼ ☼ ☼

"ہائے! بیوٹی فل۔" سامنے موجود چہرے کو خمار آلود نگاہوں سے تکتے ہوئے وہ اس کی جانب جھکا تو اس کے برابر کھڑے مارک نے بے اختیار اس کا بازو تھام لیا۔

"سیم!" اس کی تنبیہی پکار پہ گلاس ہاتھ میں تھامے کھڑے سیم نے بدمزگی سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا سیم؟ دیکھ نہیں رہے' ہمارے سامنے کیسی حسین خاتون کھڑی ہیں۔" اور اس کی اس برملا تعریف

یہ جہاں مقابل کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہیں مارک ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے کھڑی لڑکی کو جانے کے لیے کہا۔ تو وہ مسکراہٹ دباتی وہاں سے ہٹ گئی۔

"تم بھی نا کتنے بدذوق آدمی ہو۔ آج تو جوزی بھی تمہارے ساتھ نہیں۔" سیم نے ایک بڑے سے گھونٹ میں گلاس ختم کرتے ہوئے پاس سے گزرتے ویٹر کو تھمایا۔

"مارٹینی۔" اس کے نئے آرڈر پہ مارک نے بے اختیار اسے گھورا۔

"تم غالباً اس پارٹی کے میزبان ہو۔" مارک نے جتایا۔

"تو؟"

"تو یہ کہ کچھ تو حواس قائم رہنے دو۔" اور مارک کے یوں جل کر کہنے پہ وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"جیسے مہمان ویسا میزبان۔ یہ میری فریڈم پارٹی ہے اور میں یہاں پوری آزادی سے انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ صرف انجوائے!" وہ اپنی بات کر کے ایک طرف بنائے گئے اسپیشل ڈانس فلور کی جانب تھرکتا ہوا بڑھ گیا۔ تو مارک اس کی دیوانگی پر بے اختیار مسکرا دیا۔

آج یہاں شہر کے بہترین ہوٹل میں سیم نے اپنی اور سوزی کی طلاق کی خوشی میں اپنے تمام دوستوں کو بہت بڑی پارٹی دی تھی۔

ڈھائی سال قبل ان دونوں کے متعلق کبھی کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ محض تیس ماہ بعد ان کی اس طوفانی محبت کا اختتام اس نقطے پر آکے ہوگا۔

سوزی، سیم کے دل کو اور سیم، سوزی کے دل کو ایسا اور اس حد تک بھایا تھا کہ دونوں نے اپنی فیملیز کے خلاف جا کے ایک دوسرے سے شادی کرلی تھی۔

شادی کے بعد دونوں نے بڑے بھرپور محبت بھرے انداز میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا، لیکن پھر۔ پھر وہی ہوا تھا جو اس سرد معاشرے میں ہوتا آیا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی محبت اپنی رعنائی کھونے لگی تھی۔ دونوں کا دل ایک دوسرے سے بھرنے لگا تھا اور دونوں نے ہی اپنی دلچسپیوں کے نئے سامان ڈھونڈ لیے تھے، یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے جان چھڑانے کے شدت سے خواہش مند ہوگئے تھے، مگر مسئلہ یہ تھا کہ طلاق کی صورت میں سیم کو یہاں کے قوانین کے مطابق اپنی ساری جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ جو اسے کسی طور منظور نہ تھا۔ رات دن کی سوچ بچار اور وکیل کے مشورے سے سیم کو ایک حل سوجھ ہی گیا۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے اور مارک کے بھروسے پر، غیر قانونی ڈاکیومنٹس بنوا کر عدالت میں خود کو مارک کا مقروض ظاہر کردیا۔ یوں سوزی کے ہاتھ سوائے آزادی کے پروانے کے اور کچھ نہ آسکا اور سیم اپنی دوہری کامیابی کے نشے میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کی زندگی سے سوزی نام کی پریشانی بغیر کسی نقصان کے دور ہوگئی تھی اسے فی الوقت اور کیا چاہیے تھا؟

اپنی اسی کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے اس نے اپنے دوستوں کی فرمائش پہ آج شہر کے مشہور ہوٹل میں، پول سائیڈ پر بہترین پرائیویٹ پارٹی ارینج کروائی تھی۔ جہاں مہمانوں کی تفریح کے لیے شراب اور شباب دونوں کی کمی نہ تھی۔ نتیجتاً" اس وقت ہوٹل کے پول ایریا میں رونق اپنے عروج پر تھی۔ فلک شگاف میوزک اور جلتی بجھتی لائٹوں کے درمیان کئی جوڑے ایک طرف بنائے گئے خاص ڈانس فلور پہ محو رقص تھے۔ جوزفین چونکہ شہر سے باہر اپنی بہن سے ملنے گئی ہوئی تھی اس لیے وہ سیم کی اس پارٹی میں شریک نہ ہوسکی تھی۔

سیم اپنے کہے کے مطابق ڈانس فلور پہ پوری آزادی سے انجوائے کررہا تھا۔ اس کی حرکتوں نے جلد ہی مارک کو بھی اس کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کردیا۔ سب ہی بڑے بھرپور انداز میں کھانے پینے اور خاص طور پر بلوائی گئی ڈانسرز میں مگن تھے۔ ایسے میں ان کے چند دوستوں کو نئی شرارت سوجھی تو انہوں نے مارک کو اٹھا کر پول میں پھینک دیا۔ اس کے بعد تو جیسے وہاں نیا تماشا شروع ہوگیا۔ ایک کے بعد ایک سب ہی پول میں غوطے کھانے لگے۔

پاگلوں کی طرح ہنستا' سیم اپنی باری بھگتا کے ڈگمگاتے قدموں سے پول سے باہر آیا' تو ایک نازک سی لڑکی اس سے آٹکرائی۔
"دیکھ کے ڈارلنگ!" اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے سیم نے نظریں اٹھائیں اور بے اختیار چونک گیا۔
"ارے تم تو وہی خوب صورت خاتون ہو۔" تیکھے نقوش سے سجے گندمی چہرے پر نظریں جمائے' وہ مسکرا کر بولا۔ تو وہ بھی مسکراتی ہوئی سنبھل کر پیچھے ہٹی۔
"جی میں وہی ہوں' مسٹر سیم۔" اور سیم اس کے غیر ملکی لہجے میں اپنا نام سن کے چونک گیا۔
"تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟"
"کیونکہ آپ اس پارٹی کے میزبان ہیں اور میں یہاں آپ کی اور آپ کے مہمانوں کی خدمت پر مامور ہوں۔" اس کی بات پر پہلی بار سیم کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اس کے جسم پر سجے ویٹرس کے یونیفارم پر جا ٹھہریں' لیکن محض لمحہ بھر کو۔ اگلے ہی پل وہ دوبارہ اس کے پرکشش چہرے کی جانب لوٹ آئیں۔
"تمہیں کس بے وقوف نے ویٹرس بنایا ہے؟" آنکھوں میں ستائش لیے وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
اس کے سفید موتیوں کے سے دانت اور چہرے پر پھیلتی چمک نے سامنے کھڑے سیم کو مبہوت سا کر دیا۔ وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں ایک ٹک اسے دیکھے گیا تو اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔
"تمہارا نام کیا ہے؟" اس کے گمبھیر لہجے پر مقابل کے گالوں پر ہلکی سی سرخی اتر آئی۔
"لورین۔"
"لورین فرام۔؟" وہ جان گیا تھا کہ وہ امریکن نہ تھی۔
"فرام اسپین۔"
"اوکے تو لورین فرام اسپین' کیا تم میرے ساتھ ڈانس کرو گی؟" شوخ نظروں سے اسے تکتے ہوئے سیم نے مسکرا کر اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔
"مگر میں یہاں ڈیوٹی پر......"
"تمہاری یہاں ڈیوٹی صرف میری بات ماننا ہے۔ سو بتاؤ' میرے ساتھ ڈانس کرو گی؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے سیم نے اپنا سوال دہرایا تو لورین کے پاس مزید انکار کی کوئی وجہ نہ رہی۔ اس نے **جھجکتے** ہوئے سیم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جسے اس نے دھیرے سے لبوں سے لگا کر لورین کے چہرے کو سرخ ہونے پر مجبور کر دیا۔
وہ اسے اپنے ساتھ لیے ڈانسنگ فلور پہ چلا آیا اور سب کی حیرت بھری نظروں کی پروا کیے بنا اس کے ساتھ ڈانس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ رات دھیرے دھیرے ڈھلنے لگی' مگر سیم کی بانہوں نے اسے خود سے دور نہ جانے دیا اور جب صبح کے وقت پارٹی اپنے اختتام کو پہنچی تو وہ مدہوش سا لورین کو ساتھ لگائے اپنی شان دار گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس وقت پارکنگ میں موجود اس کے سب ہی دوست یہ بات بہ خوبی جانتے تھے کہ دونوں کی منزل فی الوقت ایک ہی ہے۔

☼ ☼ ☼

"مارک! تم صحیح کہتے ہو۔ وہ یہاں شفٹ ہو چکی ہے۔ پورے گھر میں اس کی چیزیں موجود ہیں۔" لاؤنج سے آتی جوزفین کی آواز نے مارک کو ایک گہری سانس لینے پر مجبور کر دیا۔
اس نے سائیڈ ٹیبل پہ دھرے فوٹو فریم پہ سے نظریں ہٹائیں اور بیڈ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سیم کی اس رازداری نے حقیقتاً اسے دھچکا پہنچایا تھا۔ جب سے ان دونوں کی دوستی اعتبار کی ایک خاص منزل کو پہنچی تھی۔ انہوں نے کبھی بھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ پھر اس معاملے میں سیم نے ایسا کیوں کیا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر ہونے کے ساتھ ساتھ دل میں دکھی اور جوزفین کے سامنے عجیب سی شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا حالانکہ ساری تفصیل

سننے کے بعد اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی 'مگر پھر بھی سیم کی اس حرکت نے اسے اندر ہی اندر نادم کر دیا تھا۔

"صرف چیزیں ہی موجود ہیں۔ وہ محترمہ یہاں سے بھی شفٹ ہو گئی ہیں۔" مارک باہر آیا تو اندر کی تلخی نا چاہتے ہوئے بھی لہجے میں اتر آئی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ سب اسی کا کارنامہ ہے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" جوزفین نے حیرت سے 'غصے میں بھرے شوہر کا چہرہ دیکھا۔

"حد ہے۔ تمہیں وہ یہاں کہیں یا سیم کے اردگرد نظر آ رہی ہے؟"

"لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس چوری میں اسی کا ہاتھ ہے۔"

"صرف اس چوری میں نہیں بلکہ سیم کے ساتھ ہونے والے حادثے میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔" مارک یقین سے بولا تو جوزفین کی آنکھوں میں موجود حیرت دوچند ہو گئی۔

"اگر ایسی بات ہوتی مارک! تو بھلا سیم اس لڑکی کو بخشتا؟ وہ تو ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے اس کے خلاف رپورٹ لکھواتا۔" جوزفین کی بات پہ مارک ایک پل کو خاموش ہو گیا۔

"تو پھر وہ کہاں ہے؟" اس نے نیا سوال اٹھایا۔

"اب یہ تو سیم ہی بتا سکتا ہے۔" جوزی نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"اور سیم صاحب منہ سے کچھ پھوٹنے کو تیار نہیں۔" مارے اشتعال کے مارک نے پاس پڑی کرسی کو ٹھوکر لگائی۔

"میں پولیس کو کال کر رہا ہوں۔ میں اس سارے گورکھ دھندے سے تنگ آ چکا ہوں۔" جوزفین کو دیکھتے ہوئے اس نے غصے سے جیب سے سیل نکالا۔

"بہتر ہو گا اگر تم یہ کام نہ کرو۔" جوزفین کے رسان سے کہنے پر اس کا ہاتھ ساکت ہو گیا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام صرف سیم کو جا کے مطلع کرنا ہے۔ آگے پولیس کو کال کرنا یا نہ کرنا اس کا ذاتی فیصلہ ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھایا تو مارک نے ایک گہری سانس لی۔ جوزفین ٹھیک کہہ رہی تھی۔

معاملے کو پولیس تک پہنچانا واقعی ایک بڑا فیصلہ تھا جسے کرنے کا حق صرف سیم کو تھا۔ ویسے بھی جس حد تک رازداری وہ اس سے برت چکا تھا' اس کے بعد تو پتا نہیں سیم کو اس کی اس درجہ مداخلت پسند آتی بھی یا نہیں؟

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں سیدھا سیم کے پاس جانا چاہیے۔" اس نے قدرے پرسکون آواز میں کہا تو جوزی نے اطمینان کی سانس لی اور پھر اپنا پرس اٹھائے اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی' جب حنان کی گھر میں آمد ہوئی۔ پورچ میں اس کی گاڑی رکنے کی آواز پر' اپنے کمرے میں اس کی منتظر زیب بیگم نے ایک نظر سوئے ہوئے صغیر صاحب پر ڈالی اور آہستگی سے اٹھ کر باہر چلی آئیں۔ انہوں نے آج سارا دن جس اعصاب شکن کیفیت میں گزارا تھا' وہ اس پل سوا ہو گئی تھی۔

تیز قدموں سے چلتی وہ سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں کہ سامنے موجود داخلی دروازہ کھلا اور حنان نے اپنے دھیان میں اندر قدم رکھا تھا' لیکن جوں ہی اس کی نظر زیب بیگم پر پڑی تھی اس کی بھنویں استہزائیہ انداز میں اوپر اٹھ گئی تھیں اور لبوں پہ بڑی دل جلانے والی مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے لاک لگایا اور اطمینان سے چلتا ان کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"السلام علیکم!" جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ پرسکون انداز میں بولا تو زیب کا ضبط جواب دے گیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ تم یہ تماشا کھڑا کر کے اپنا مقصد

پالوگے؟ میرے صبر کو اتنا مت آزماؤ حنان! کہ میں تمہارے کردار کی اصلیت تمہارے باپ کے سامنے کھولنے پر مجبور ہو جاؤں۔" غصے سے سرخ آنکھیں اس پر جمائے وہ دھیمے، لیکن سرد لہجے میں بولیں تو حنان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"آپ کے جو جی میں آئے وہ کریں، لیکن ایک بات یاد رکھیے گا، آپ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتیں جبکہ میں ہر بات با آسانی مہر سے منسوب کر سکتا ہوں۔" اور اس کی بات پہ زیب بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔

"میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم اتنی گری ہوئی بات کر سکتے ہو۔" انہوں نے دکھ میں ڈوبی بے یقین نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا کریں۔ وہ کہتے ہیں نا محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے۔" اس نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"مت بھولو حنان! کہ مارنے والے سے بچانے والی ذات ہمیشہ برتر رہی ہے، میں ابھی زندہ ہوں اور میری مرضی کے خلاف بہر کیف کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"آپ اپنی مرضی کر چکیں۔ اب میری باری ہے۔ دیکھتا ہوں کون میری راہ کھوٹی کرتا ہے۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ دوبدو گویا ہوا۔

"اپنی راہ کھوٹی کرنے والے تم خود ہو۔ تمہارا گندہ کردار ہے۔ کل کو اگر حالات تمہاری مرضی کا رخ لے بھی لیتے ہیں تب بھی مہر کم از کم تمہارے حق میں فیصلہ دینے والی نہیں۔" انہوں نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر سچائی کا آئینہ اس کے سامنے رکھ دیا، لیکن وہ بجائے شرمندہ ہونے کے طنزیہ انداز میں مسکرا دیا۔

"یہ آپ کی بھول ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس لڑکی کو میری ضد مت بنائیں، مگر آپ نے میری بات نہیں سنی۔ اب دیکھیں میں آپ لوگوں کی ہر خوش فہمی کا کیسے خاتمہ کرتا ہوں۔" اس کی بات اور انداز پہ زیب بیگم کا دل اذیت سے بھر گیا۔

"تم میری ہر خوش فہمی کا خاتمہ بہت پہلے کر چکے ہو حنان! کاش کہ تم میری آزمائش بننے کے بجائے میرا مان، میرا فخر بنے ہوتے تو شاید آج وقت کچھ اور ہوتا۔"

"ایسا مان اور فخر بننے سے بہتر ہے کہ میں آپ کی آزمائش بنا رہوں۔ مجھے ویسے بھی غاصبوں سے ہاتھ ملانے کی عادت نہیں" کاٹ دار لہجے میں وہ کہتا آگے بڑھ گیا تھا اور زیب اس کے وار کی سختی پہ اپنا نچلا لب دانتوں سے دبا گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی بھر آئی تھیں۔

"یا اللہ مجھے حوصلہ دے۔ میری مدد فرما میرے مالک!" بہتے اشکوں کے درمیان وہ ہمیشہ کی طرح صرف اپنے رب کو ہی پکار پائی تھیں۔ اس لڑکے کی ہٹ دھرمی اور ان کی قسمت مزید کیا رنگ دکھانے والی تھی۔ ان کا دل یہ سوچ کر ہی ہولنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا ایک بڑا حصہ گزر چکا تھا، مگر نیند انجم بیگم کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ نہ سوچوں میں کوئی ربط تھا اور نہ دل و دماغ کو یکسوئی حاصل تھی۔ گزرے وقت کی تلخیوں کو یاد کر کے کبھی آنکھیں زار و قطار برسنے لگتی تھیں اور کبھی آنے والے وقت سے جڑے تمام خوف انہیں یوں منجمد کر ڈالتے کہ ان پر وحشت میں ڈوبے بنجر صحرا کا گمان ہونے لگتا۔

دراصل وہ آج تک اپنے فیصلے کے لیے خود کو معاف ہی نہیں کر پائی تھیں اور کرتیں بھی کیسے؟ اولاد کی ہر تکلیف آپ کو نئے سرے سے پچھتاوے کے چرکے لگاتی ہے یوں کہ آپ ساری زندگی کے لیے اپنی ہی نظروں میں مجرم بن جاتے ہیں۔

جرم کا ایسا ہی اذیت ناک احساس دن رات انجم بیگم کو بھی کھائے جا رہا تھا۔ ان کی ایک غلطی نے مہر کی زندگی کو ایسے امتحان سے دوچار کر دیا تھا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

انہیں آج بھی اس دن کا ایک ایک لمحہ یاد تھا، جب اپنی محبت اور خلوص کے ہاتھوں مجبور ہو کے انہوں نے ایک ایسے کام کے لیے رضامندی دے دی تھی جو وہ جانتی تھیں کہ اتنا مناسب نہ تھا، لیکن یہ بھی ایک

حقیقت تھی کہ اگر آج بھی وقت انہیں اسی جگہ اور ان ہی حالات میں دوبارہ لے جاتا اور ان کے سامنے ان کی بیمار والدہ اپنی ایک بظاہر بے ضرر سی خواہش کا اظہار اسی مان سے کرتیں تو شاید وہ آج بھی ان کی خواہش کا احترام اسی طرح کرتیں جس طرح انہوں نے اس روز کیا تھا' جب اماں جان کا نرم و نحیف ہاتھ ان کے ہاتھ پہ آن ٹھہرا تھا۔

"انجم! میری ایک بات مانو گی؟"

"جی اماں۔" انہوں نے پاس بیٹھی ماں کی جانب محبت سے دیکھا تھا جو محض چند ہی ماہ میں گھل کر آدھی ہو گئی تھیں۔ سچ ہے اولاد کا غم اچھے اچھوں کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے جبکہ وہ تو پہلے ہی ایک ناتواں سی عورت تھیں جنہیں ان کے شریک سفر جوانی میں ہی دو کم سن بچیوں کے ساتھ' دنیا کے سرد و گرم جھیلنے کو تنہا چھوڑ گئے تھے گو کہ ان کی وفات کے بعد اس وضع داری اور انسانیت کے دور میں ان کے مرحوم شوہر کے بہن بھائیوں نے ان کا اور ان کی بچیوں کا بھرپور طریقے سے خیال رکھا تھا' مگر جو مان اور جو بھروسا ایک شوہر اور ایک باپ کی موجودگی میں زندگی پر کیا جا سکتا ہے وہ حاجی صاحب کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا' لیکن پھر بھی صد شکر تھا کہ ان کی زندگی بہت اچھے اور باوقار انداز میں گزری تھی۔

بڑے ہونے پر انجم کا رشتہ ان کے تایا نے اپنے اکلوتے بیٹے ابراہیم کے لیے مانگ لیا تھا۔ یوں وہ بڑی خوشیوں اور دھوم دھام سے بیاہ کر اپنے تایا کے گھر چلی گئی تھیں۔ ابراہیم جو ویسے ہی اپنی چچی کا اپنی ماں کی طرح احترام کرتے تھے اور زیب کو اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح چاہتے تھے' انہوں نے شادی کے بعد نفیسہ بیگم کی زندگی میں صحیح معنوں میں ایک بیٹے کی کمی پوری کر دی تھی۔ جس پہ وہ اپنے رب کی بے حد شکر گزار تھیں۔

زیب کے سمجھ دار ہونے پہ جب ان کے لیے ایک غیر خاندان سے رشتہ آیا تب ابراہیم صاحب نے ہی ہر طرح کی ضروری چھان بین کروا کے نفیسہ بیگم کو مطمئن کیا۔ جس کے بعد زیب رخصت ہو کے اپنے گھر چلی گئیں۔

بیٹیوں سے فراغت کے بعد اماں جان' ابراہیم اور انجم کے بے حد اصرار کے باوجود ان کے گھر منتقل نہ ہوئیں' وہ ان نازک رشتوں کی اونچ نیچ سے بہ خوبی واقف تھیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنے ہی گھر میں اپنے پرانے اور قابل بھروسا ملازمین کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تھا اور تب اچانک حالات نے ایک ایسی کروٹ لی تھی کہ ان سب کی پرسکون زندگیوں میں ہلچل برپا ہو گئی تھی' وار اتنا کاری تھا کہ ہفتوں وہ خود کو سنبھال نہ پائے تھے' لیکن آخر کب تک؟ نہ چاہتے ہوئے بھی ان سب کو سنبھلنا پڑا تھا' مگر اماں جان کے ناتواں وجود میں گزری طاقت اور ہمت پھر لوٹ نہ پائی تھی۔

اس کڑی آزمائش نے انہیں توڑ کے رکھ دیا تھا اور وہ محض چند ہی ماہ میں بستر سے آ لگی تھیں۔ سوچوں اور پریشانیوں نے ان کی صحت کو گھن کی طرح کھا لیا تھا۔ انجم اور ابراہیم ہر ممکن طریقے سے ان کی تسلی و تشفی میں لگے رہتے' لیکن درد میں ڈوبا ان کا دل کسی طور سنبھلنے میں نہ آتا تھا۔

پھر ایک روز ایک خیال نے اچانک ہی ان کا دامن تھام لیا جس کے محض تصور سے ہی ان کی بے چین روح کو قرار سا آنے لگا۔ اس روز انہوں نے سیر ہو کے کھانا بھی کھایا اور زیب سے ڈھیر ساری باتیں بھی کیں اور جب شام میں انجم نے چکر لگایا تو ان کے اصرار پر وہ دونوں بیٹیوں کے سہارے اپنے کمرے سے نکل کر لان میں آ بیٹھی تھیں۔ اور تب انہوں نے اپنے دل کی بات کہنے کو بیٹی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"تم لوگ مجھے میرے نواسا' نواسی کی خوشی میری زندگی میں ہی دکھا دو۔"

"میں سمجھی نہیں اماں؟" انجم نے الجھی نظروں سے ماں کا پر امید چہرہ دیکھا۔

"میں چاہتی ہوں' مہر اور ہنی کا نکاح ہو جائے۔"

اوران کی بات پہ دونوں بہنیں چونک گئیں۔

"مگر اماں! وہ دونوں تو ابھی بچے ہیں۔" انجم حیرت سے مسکرائیں۔

"جانتی ہوں' لیکن کیا کروں' میرے پاس مزید وقت نہیں ہے بیٹا۔" وہ دل گرفتی سے پھیکی سی ہنسی ہنسیں تو دونوں کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبالیا۔

"کیسی باتیں کررہی ہیں اماں! ابھی تو آپ کو بہت ساجینا ہے۔" زیب نے ماں کا بازو تھاما۔

"کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلینے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی زیبی! میری حالت تم لوگوں کے سامنے ہے۔ تم بہنوں نے بچوں کے لیے جو فیصلہ کیا ہے اس نے مجھے کتنی خوشی دی ہے تم دونوں سوچ بھی نہیں سکتیں' لیکن میں تمہارے اس فیصلے کو بھی پورا ہوتا دیکھ سکوں گی۔ یہ اب نہیں لگتا۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ تم دونوں مجھے خوشی کی یہ گھڑیاں ابھی دکھادو تاکہ میں اپنی پریشانی کے ایک بڑے حصے سے نجات پاسکوں۔ ورنہ وقت تو ان شاء اللہ بعد میں بھی آئے گا۔ بس تمہاری ماں نہ دیکھ سکے گی۔" بات کرتے کرتے ان کی آواز بھر آئی تو بغور ان کی بات سنتی انجم اور زیب کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"آپ کی خواہش سر آنکھوں پہ اماں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" سسکتے ہوئے انجم نے ماں کا ہاتھ لبوں سے لگالیا۔

"جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ تم دونوں کو تمہارے بچوں کی ڈھیروں خوشیاں دکھائے۔" انہوں نے جھک کر بیٹی کا ماتھا چوما۔

"ابراہیم کو صبح میرے پاس بھیج دینا' میں اس سے خود بات کروں گی۔" ان کی بات پہ انجم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلادیا۔

"جاؤ زیبی! اندر سے کچھ میٹھا لے کر آؤ۔ میں اور تمہاری سمدھن منہ میٹھا کریں گے۔" ان کے مسکراتے لہجے پہ وہ دونوں کھل کر ہنس پڑی تھیں۔ ان کی یہ ہنسی اس گھر کے درودیوار نے بہت دنوں بعد سنی تھی۔

☆ ☆ ☆

اماں جان نے ابراہیم صاحب سے کیا کہا تھا۔ پتا نہیں' لیکن وہ پورے دل و جان سے نکاح کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ خاندان میں اس خبر پر ملے جلے تاثرات آئے تھے۔ ہاں جنہوں نے اعتراض کیا تھا۔ انہیں ابراہیم صاحب نے خود جواب دے دیا تھا۔ یوں میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی کے مصداق' سب ہی بولنے والے خاموش ہوگئے تھے اور وہ دن بھی آگیا تھا جب دس سالہ مہر اور بارہ سالہ ہنی کو زرق برق کپڑے پہنا کر نانی کے دائیں بائیں لا بٹھایا گیا تھا اور پھر ان کی موجودگی میں ہی نکاح کی پوری کارروائی عمل میں آئی تھی۔

اس دوران سب ہی کی آنکھیں کتنی ہی بار اشک بار ہوئی تھیں اور کتنی ہی بار وہ سب ان دونوں کی شرارتوں اور معصوم سوالوں پر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک یادگار دن تھا جس کے کئی یادگار لمحوں کو کیمرے نے محفوظ کیا تھا۔ اس دن کا اختتام ڈھیروں دعاؤں پر ہوا تھا۔

نفیسہ بیگم کی خوشی دیدنی تھی۔ ان کی صحت کی جانب سے سب ہی کو اب تسلی سی ہوچلی تھی' لیکن ہوا وہی تھا جو انہوں نے کہا تھا۔ اس تقریب کے محض ڈیڑھ ہفتے بعد وہ اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔

ان کے انتقال نے انجم اور زیب کی دنیا اندھیر کردی تھی۔ انہیں اس بات کا بھرپور اطمینان تھا کہ انہوں نے اپنی ماں کی خواہش پوری کرکے انہیں خوش و خرم اس دنیا سے جانے کا موقع دیا تھا۔ مگر تب وہ نہیں جانتی تھیں کہ آنے والا وقت اپنے اندر کیسے کیسے طوفان سمیٹے ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ان کی زندگیوں کے پرسکون ساحل اسے بھی' یہ چھپے ہوئے طوفان بڑی زور سے آکر ٹکرائے تھے۔ جس کے نتیجے میں ہر سو دکھ اور بے سکونی پھیل گئی تھی۔ ایسی الجھنوں نے ان سب کو گھیرا تھا کہ انہیں سلجھانے کی کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔ ایسے حالات

میں زندگی صرف آج تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ آنے والا کل اپنے اندر کیا راز سمیٹے ہوئے تھا' کسی میں کریدنے کی ہمت نہ تھی۔ اور گزرا ہوا کل جو الجھنیں چھوڑ گیا تھا' انہیں اگر مل بیٹھ کر سلجھانے کی کوشش کی جاتی تو ایسی بہت سی تلخ سچائیاں سامنے آجاتیں' جنہیں آج تک مصلحت کے پردے تلے وہ زیب اور مہر چھپائے بیٹھی تھیں اور ان کی یہی خاموشی حنان کو ان پہ حاوی کیے دے رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ زیب بیگم کو تو حوصلہ رکھنے کی تلقین کر چکی تھیں۔ لیکن خود اب ہمت ہار بیٹھی تھیں۔ ان ہی سوچوں میں رات تمام ہوئی تھی۔ نتیجتاً" صبح ان کی آنکھیں سرخ اور سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ مہر کو تو انہوں نے طبیعت خرابی کا بہانہ بنا کے زبردستی کالج جانے پر مجبور دیا تھا۔ لیکن ابراہیم صاحب کو مطلع کرنا ضروری تھا۔

"کل زیب کا فون آیا تھا۔ وہ اور صغیر مہر کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے آج ہماری طرف آرہے ہیں۔" آفس کے لیے تیار ہوتے ابراہیم صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا تو ان کی نظریں اپنی شریک حیات کی جانب اٹھ گئیں۔

"اچھا تو تمہاری یہ حالت اس فون کا نتیجہ ہے۔" وہ لمحے میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔

"کیوں آپ کو پریشانی نہیں ہوئی؟" انہوں نے بوجھل لہجے میں سوال کیا۔

"تمہاری پریشانی اپنی جگہ۔ لیکن صغیر بہر حال ہم سے ہر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔" ان کی بات پہ انجم بیگم کے اندر بے چینی پھیل گئی۔

"میں جانتی ہوں کہ صغیر ہم سے ہر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ لیکن۔" ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ وہ کن الفاظ میں اپنا مدعا شوہر کے سامنے بیان کریں۔ وہ اس حقیقت سے باخوبی آگاہ تھیں کہ ان کا اولاد کی طرف داری میں کہا گیا ایک بھی لفظ ابراہیم صاحب کے غصے کو بھڑکانے کے لیے کافی تھا۔ اسی لیے وہ جھجک کر خاموش ہو گئی تھیں۔

"جب تم یہ حقیقت جانتی ہو تو پھر اس "لیکن" کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی انجم۔" اور انجم بیگم کے چہرے پہ دکھ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔

"جانتی ہوں۔ لیکن پھر بھی آپ سے صرف اتنا کہوں گی کہ مہر کے لیے بہتر مستقبل کی خواہش میں آپ کہیں اس کی مشکلات میں اضافہ نہ کر دیجئے گا۔ اس کے لیے نئے سرے سے کوئی اچھا اور مناسب شریک سفر ڈھونڈنا ہمارے لیے آسان نہیں ہوگا۔"

ان کی بات پہ ابراہیم صاحب لحہ بھر کو خاموش ہو گئے۔

"تم نے مہر سے ان کے آنے کا ذکر کیا؟" چند لحوں کے توقف کے بعد انہوں نے بنا کسی خیال آرائی کے نیا سوال کیا۔ انجم بیگم کا بوجھل دل مزید بوجھل ہو گیا۔

"نہیں۔"

"اچھا کیا تم زیب سے کہو کہ وہ بچیوں سے کہہ کر مہر کا کوئی پروگرام بنوادے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آج شام گھر پہ رکے۔" وہ گاڑی کی چابیاں اور بریف کیس اٹھاتے ہوئے بولے۔ انجم اک گہری سانس لیتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔"

"اچھی بات ہے۔ چلو پھر شام میں ملاقات ہوتی ہے۔" وہ دروازے کی جانب بڑھے تو انجم ہمیشہ کی طرح انہیں رخصت کرنے کو ان کے پیچھے چل دیں۔

☼ ☼ ☼

"مبارک ہو سیم۔ تم کامیاب ہو گئے دوست! میں اب اپنی حد میں رہوں گا۔" مارک اور جوزفین ساتھ ساتھ چلتے سیم کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مارک کا لیا دیا انداز دھواں بن کے اڑ گیا تھا۔ وہ خود کو تلخ ہونے سے روک نہ پایا تھا۔

"کیا مطلب؟" بستر پہ دراز سیم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ تلخی سے مسکرا دیا۔

"میری فضول باتوں کے مطلب کو چھوڑو۔ اور یہ سن لو کہ تمہارے گھر میں چوری ہو گئی ہے۔"

"مارک!" اس کی بد لحاظی پہ جوزفین دنگ رہ گئی تھی۔ جبکہ سیم بالکل ساکت ہو گیا تھا۔

"نہیں۔ میں معذرت چاہتی ہوں سیم! تم پلیز حوصلے سے کام لو۔ دیکھو وہ جو کوئی بھی ہے 'پولیس اسے ڈھونڈ لے گی۔" شرمندگی کے مارے جوزی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے بات کو سنبھالے۔ بھلا کوئی کسی مریض کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے؟۔

"مجھے کسی کو نہیں ڈھونڈنا۔" سیم کی بے تاثر آواز شرمندہ ہوتی جوزفین کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ ساری شرم بھول بھال حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔ جبکہ مارک طنزیہ انداز میں قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم چور کو اچھی طرح جانتے ہو سو ڈھونڈنا کیسا؟" سیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے کاٹ دار لہجے میں جتایا تو سیم جیسے پھٹ پڑا۔

"ہاں' جانتا ہوں پھر؟"

"پھر یہ کہ ذلیل آدمی! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم اس عورت کو اپنے گھر میں لے آئے ہو؟" وہ غصے سے بولا تو گھبرائی ہوئی جوزفین نے پریشان نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ یہ شور شرابا کہیں اسپتال کے عملے کو نہ متوجہ کر لیتا۔

"میری مرضی!" غصے سے کہتے ہوئے سیم نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ مگر مقابل بھی مارک تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اور ایک جھٹکے سے اس کا بازو نیچے گرا دیا تو جوزفین کی سانس حلق میں اٹک گئی۔

"تمہاری اس حالت کی ذمہ دار بھی وہی ہے نا؟" اور جوزفین کو لگا کہ اب تو دونوں دوستوں کے درمیان جھڑپ ہوئی ہی ہوئی۔ لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سیم چند لمحے خاموشی سے مارک کا چہرہ تکنے کے بعد دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ اپنی اس حالت کا میں خود ذمہ دار ہوں۔"

"پلیز سیم! اب تو بتا دو یار کہ یہ۔ کیسے ہوا؟" مارک کا غصہ بے بسی میں ڈھل گیا۔

"کیوں اور کیسے کے ذکر کو جانے دو۔ یہ پوچھو کہ کس لیے ہوا؟" اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ بوجھل لہجے میں بولا تو مارک نے جیسے ہار مان لی۔

"اچھا۔ یہی بتا دو کہ کس لیے ہوا؟"

"مجھے موت کا احساس دلانے کے لیے۔"

"کیا؟" مارک نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے ذہنی توازن بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

"کیوں یقین نہیں آیا نا؟" اس کے تاثرات پہ سیم کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے بھی نہ آتا اگر میں اس رات بدبو سے بھرے اس کچرے کے ڈھیر پہ بے یارو مددگار نہ پڑا رہتا۔"

"مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔" مارک نے تشویش سے اسے دیکھا۔

"اوں ہوں' طبیعت ابھی تو صحیح معنوں میں ٹھیک ہوئی ہے۔" اس کے جواب پہ مارک کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ چند سیکنڈ اس کی جانب دیکھنے کے بعد وہ ڈاکٹر سے بات کرنے کی نیت سے پلٹا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھاتا' سیم نے اس کی کلائی تھام کر اسے اپنی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"اس بار تو میں اس عورت کو مل گیا۔ اور میری جان بچ گئی۔ لیکن اگر میں دوبارہ کسی کو نہ مل سکا تو؟"

"سیم! دیکھو تم اس حادثے کو ذہن پہ سوار۔"

"میری بات کا جواب دو مارک۔ اگر میں دوبارہ کسی کو نہ مل سکا تو؟" اور مارک اسے بے بس نظروں سے دیکھتا لب بھینچ گیا۔

"کوئی جواب نہیں ہے نا۔ مگر میرے پاس ہے۔ تو میں کسی کچرے کے ڈھیر پہ یا کسی تیز رفتار گاڑی کے ٹائروں تلے آ کے' یا اپنے فلیٹ کی تنہائی میں یا شراب کے نشے میں کسی بار میں ایک تنہا لاش کی صورت پڑا رہ جاؤں گا جس کے قریب جاتے ہوئے بھی ہر کوئی ڈرے گا' اس وقت اگر میری جیب سے کوئی نشانی نکل آئی تو شاید کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے تمہیں کال کر لیا جائے

گا۔ تم ٹریس نہ ہو سکے یا سرے سے کوئی نشانی ہی نہ مل سکی تو مجھ پہ ایک لاوارث لاش کا ٹھپہ لگا کے چند دنوں کے لیے سرد خانے میں پھینک دیا جائے گا۔ اور میری باری آنے پہ چند انجان لوگ ایک دن مجھے وہاں سے نکال کے ایک گمنام کھڈے میں ڈال دیں گے۔ جس پہ پہچان کا نہ تو کوئی کتبہ ہو گا اور نہ کوئی تحریر۔ پھر اگر تم بھی کبھی مجھے ڈھونڈنا چاہو گے تو ڈھونڈ نہ پاؤ گے۔ میں کہاں کھو جاؤں گا' میرے اپنوں کو کبھی پتا نہ چل سکے گا۔ کیا میں ایسے ہی کسی بے کس اور گمنام انجام کے قابل ہوں مارک؟"

بولتے بولتے اس نے اچانک سوال کیا تو دم سادھے کھڑا مارک اسے خاموشی سے ایک ٹک دیکھے گیا۔ اس منظر کشی نے اس کی رگ و پے میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑا دی تھی۔

"بولو نا مارک! کیا میری موت کی خبر' میری لاش کی بدبو لوگوں تک پہنچائے گی؟" اس نے مارے وحشت کے اپنے ہاتھ میں دبا مارک کا ہاتھ دبایا تو مارک خود بھی بے چین ہو گیا۔

"نہیں سیم! نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تم ایسے کسی انجام کے مستحق نہیں ہوا۔" اس نے جھک کر شدت جذبات سے اس کا شانہ دبایا۔ تو سیم کے پورے وجود میں در آنے والی بے قراری اور سراسیمگی سمٹ سی گئی۔

"بس مجھے یہی سننا تھا۔ اب مجھے کوئی الجھن' کوئی کشمکش نہیں۔" گہری سانس لیتے ہوئے اس نے پرسکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔ اس کی اس پل پل بدلتی کیفیت پہ مارک نے گھبرا کے جوزفین کی جانب دیکھا جو اسی کی طرح حیران پریشان سی کمرے کے وسط میں پتھرائی کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ سیم کو کیا ہو گیا ہے؟" خاموشی سے کھانا کھاتے ہوئے جوزفین نے اچانک سر اٹھا کے مقابل بیٹھے مارک کی جانب دیکھا جو اس کی طرح سوچوں میں گم ایک کے بعد ایک نوالے منہ میں رکھتا جا رہا تھا۔ اس کے سوال پہ مارک نے نظریں اٹھا کے جوزی کی طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا کانٹا پریشانی سے پلیٹ میں رکھ دیا۔

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ لیکن ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ وہ خوف کا شکار ہے۔ اور ایسی حالت میں ہمیں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ اسے ڈسچارج کروانے کے بعد میں کچھ دن اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہوں گا۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔"

"میں کیوں اعتراض کروں گی۔ اس کی حالت نے تو مجھے خود پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمیں اسے جلد از جلد کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا ہو گا۔" اس کے متفکر انداز پہ مارک نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بے فکر رہو۔ میں کل صبح ہی کسی اچھے سائیکالوجسٹ سے ٹائم لیتا ہوں۔" اس کی بات پہ جوزفین نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

مہر کالج میں تھی۔ جس وقت جائشہ کا فون آیا تھا۔ وہ اور نوریہ شام میں شاپنگ کا پروگرام بنائے بیٹھی تھیں۔ اور اسے ساتھ لے جانے پہ مصر تھیں۔ مجبوراً" مہر کو ہامی بھرنی پڑی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد اس نے کھانا کھا کے نماز پڑھی اور کچھ دیر سستانے کے بعد تیار ہو کے نیچے آئی تھی لیکن لاؤنج میں انجم بیگم کو سوچوں میں غلطاں بیٹھا دیکھ کے وہ چونک گئی تھی۔ یہ وقت تو ان کے آرام کا ہوتا ہے۔ پھر بھلا۔

"کیا بات ہے مما جان۔ آپ یوں کیوں بیٹھی ہیں؟" تیز قدموں سے ان کے قریب آتے ہوئے اس نے پریشان نظروں سے ان کی جانب دیکھا جو اس کی آواز پہ بے اختیار چونک گئی تھیں۔

"یوں ہی نیند نہیں آرہی تھی۔ اس لیے سوچا تھوڑا ٹی۔ وی دیکھ لوں۔" آواز میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے وہ مسکرائیں۔ مہر نے ایک نگاہ بند پڑے ٹی۔ وی پہ ڈال کے ان کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا گئیں۔

"کیا بات ہے مما جان۔ آپ مجھے صبح سے پریشان لگ رہی ہیں۔" ان کے برابر میں بیٹھتے ہوئے اس نے ان کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو انجم بیگم کی آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی بھر آئیں۔

"مہر! ایسا کب تک چلے گا بیٹا؟" ان کے استفسار پہ ایک بوجھل سانس اس کے لبوں سے ٹوٹ کر فضا میں بکھر گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ انہیں کون سی بات ستا رہی تھی۔

"آپ اس بات کو قبول کیوں نہیں کر لیتیں۔ مما جان! کہ زندگی اب یونہی گزرنے والی ہے۔"

"زندگی کوئی بچوں کا کھیل ہے، جو میں تمہاری اس فضول بات کو قبول کر لوں؟ ہم آج ہیں کل نہیں' اس کے بعد کبھی سوچا ہے کہ کیا ہوگا؟" انہوں نے غصے سے اسے دیکھا تو وہ نگاہیں جھکا گئی۔

"زینب اور صغیر کے سامنے ہم پہلے کیا کم شرمندہ ہیں، جو تم ہمیں مزید شرمندہ کرنے پہ تلی ہوئی ہو۔"

"آپ کیوں شرمندہ ہوتی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔" وہ پلکیں اٹھاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

"ایسے نادانی بھرے فیصلوں کو کوئی نہیں مانتا۔ وہ اگر اب تک چپ ہیں تو صرف اس لیے کہ تم خود ہوش کے ناخن لو۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ ہمیں خود ہی کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔" ان کے قطعی لہجے پہ مہر کے چہرے پر اضطراب ابھرا۔

"پلیز مما جان! آپ لوگ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔" اس نے مضطرب نظروں سے دیکھتے ہوئے ان کا ہاتھ تھاما۔ لیکن اس سے پہلے کہ انجم کوئی جواب دیتیں۔ لاؤنج کا دروازہ کھلنے کی آواز پہ دونوں نے ایک ساتھ پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔

"مہر بی بی! باہر جائشہ بی بی کی گاڑی آئی ہے۔" اسے متوجہ دیکھ کے دل شیر نے اسے وہیں سے مطلع کیا تو مہر بے دلی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا مما جان! میں جا رہی ہوں۔" اس کی نظریں ان کے تھکے ہوئے چہرے پہ جا ٹھہریں۔ "آپ پلیز کچھ دیر آرام کر لیں۔"

"کر لیتی ہوں۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولیں۔ مہر بے بسی سے انہیں دیکھتی پلٹ کر بوجھل قدموں سے باہر نکل گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد انجم کچھ لمحے یونہی خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہیں اور پھر ہاتھ بڑھا کر سامنے رکھا فون اٹھا لیا۔ ان کی انگلیاں "قاضی ولا" کا نمبر ملانے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تم سے بڑا بے وقوف اپنی زندگی میں نہیں دیکھا سیم!" اور زمین پہ گرے درد سے نڈھال ہوتے سیم کی آنکھیں ہر اذیت بھلائے سارے بے یقینی کے پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔

ہسپانوی نقوش سے سجا اس کا حسین چہرہ تمسخر اور حقارت کے رنگوں میں ڈوبا ایک لمحے کو اس کے قریب جھکا تھا اور اگلے ہی لمحے سیدھے ہوتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگ پوری طاقت سے سیم کی پسلیوں میں ماری تھی۔ اس کے جوتے کی نوک نے سیم کو بلبلانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اک کراہ اس کے لبوں سے نکلی تھی اور سوئے ہوئے سیم کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی تھی۔ بے اختیار تھوک نگلتے ہوئے اس نے لیٹے لیٹے گردن گھما کے اپنے دائیں طرف دیکھا' جہاں مارک بے خبر سو رہا تھا۔ اسے دیکھ کے اطمینان کا گہرا احساس سیم کو اپنے اندر اترتا محسوس ہوا۔

دھیرے سے رخ موڑ کر اس نے اپنا سینہ مسلا' تاکہ اس بے چینی اور گھبراہٹ سے نجات پا سکے۔ جو اس تلخ حقیقت نے سوتے میں بھی اس کے اندر جگا دی تھی' مگر اس خوب صورت ناگن کا چھوا اور اس کا دیا ہوا زہر

اس کے روم روم میں کھنچاؤ برپا کرنے لگا تھا۔ یہ حادثہ تو جیسے اس کی روح تک سے چمٹ گیا تھا اور کیوں نہ چمٹتا؟ وہ اس لڑکی کے ہاتھوں صرف لوٹا نہیں گیا تھا بلکہ ذلیل ہوا تھا۔ جسم سے لے کر احساسات تک اور احساسات سے لے کر روح تک ذلیل!

وہ لمحے' جب اس پہ اچانک پل پڑنے والے لڑکوں کے ہاتھ اور پاؤں لحظہ بھر کو رکے تھے اور اس کی درد سے بند ہوتی آنکھوں نے لورین کو اپنے قریب دو زانو جھکتا دیکھ کے اس کا اپنی جانب بڑھتا ہاتھ تھامنا چاہا تھا۔ اس یقین سے کہ شاید وہ نازک سی لڑکی اسے ان غنڈوں کے نرغے سے نکال لینے میں کامیاب ہو جائے وہ' اس کی زندگی کے سب سے کرب ناک لمحے تھے کیونکہ اگلے ہی پل لورین نے اس کی ہر خوش فہمی کی دھجیاں اڑاتے ہوئے انتہائی بے رحمی سے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا تھا اور اس کے ہاتھ انتہائی سرعت سے اس کی جیبوں میں رینگنے لگے تھے۔ جنہیں خالی کرنے کے بعد اس نے اس کی کلائی میں بندھی قیمتی گھڑی اتار کے پیچھے کسی کو تھمائی تھی۔

تب اسے اٹھتا دیکھ کے سیم نے اپنے نڈھال پڑے وجود کی پوری ہمت صرف کر کے اس کی کلائی جکڑ لی تھی۔

بے اختیار لورین کی نظریں اس کی وحشت زدہ بے یقین نظروں سے ٹکرائی تھیں اور اس کے سرخ لپ اسٹک سے سجے ہونٹوں کی تراش میں بڑی بے رحم سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

"میں نے تم سے بڑا بے وقوف اپنی زندگی میں نہیں دیکھا سیم!" اس کا تمسخر اور حقارت کے رنگوں میں ڈوبا حسین چہرہ پل بھر کو اس کے قریب جھکا تھا اور اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگ پوری طاقت سے سیم کی پسلیوں میں ماری تھی۔ اس کے جوتے کی نوک نے سیم کو بلبلانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اس کے لبوں سے اک کراہ نکلی تھی' لیکن اذیت اور ذلت کی جو کراہیں اس پل اس کے دل و دماغ سے نکلی تھیں وہ تاحال اس کے اندر گونج رہی تھیں۔

اعصاب کے تناؤ نے اس کے اندر سگریٹ کی طلب بیدار کر دی تھی۔ وہ کہنیوں کے بل زور دیتا آہستگی سے اٹھ بیٹھا تھا۔

سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کے وہ سیدھا ہونے کو تھا کہ اس کی نظر ٹیبل کی ٹاپ پہ پڑی' جہاں لیمپ کے پاس رکھا فوٹو فریم غائب تھا۔ چند ثانیے ٹیبل کی سطح کو دیکھنے کے بعد اس نے پلٹ کر مارک کی طرف دیکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سیم کو اپنے دل میں کسی کے لیے تشکر کے احساسات امڈتے محسوس ہوئے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک بہترین انسان اور باکمال دوست تھا۔ اسے مارک کا اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ یکایک بالکل درست لگنے لگا تھا۔

اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے وہ خود پہ سے لحاف ہٹا کے آہستگی سے بیڈ سے نیچے اتر آیا تھا اور لیمپ بجھا کر نائٹ بلب کی روشنی میں دھیرے دھیرے چلتا دروازہ کھول کے باہر لاؤنج میں نکل آیا تھا۔

اپنے پیچھے بنا کسی آہٹ کے دروازہ بند کر کے اس نے لائٹ جلائی تھی اور چلتا ہوا صوفے پہ آ بیٹھا تھا۔ سگریٹ جلا کے اس نے ایک گہرا کش لیا تھا۔ بہت دنوں بعد سکون کی ایک گہری لہر اسے اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی تھی۔ ایک سگریٹ ختم کر کے اس نے فوراً" دوسرا سگریٹ جلایا تھا۔

اپنے دھیان میں دھواں اڑاتے ہوئے اس کی نظر سامنے رکھے سینٹر ٹیبل کی جانب اٹھی تھی اور وہ بے اختیار چونک گیا تھا۔

ٹیبل پہ سجے بیش قیمت کرسٹل پیسز اب غائب تھے' لیکن ان کے برابر میں ڈیڑھ ہفتہ پہلے لا کر سجائے جانے والے نہایت سستے سے چند ایک رنگ برنگے ڈیکوریشن پیسز وہیں موجود تھے۔ یکایک اس کا اپنے منہ کی جانب بڑھتا ہاتھ ساکت ہو گیا تھا اور آنکھیں گویا اس میز پر جم سی گئی تھیں۔ ان ڈیکوریشن پیسز کو لورین کے گھر سے لا کے وہاں اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی محبت سے سجایا تھا اور تب وہ وہاں رکھے ان

قیمتی کرسٹل پیسز سے بھی زیادہ سجے تھے۔ وہ کتنی دیر لورین کے پہلو میں کھڑا انہیں نہار تا رہا تھا۔

لیکن اب رات کے اس پہر اسے وہ چیزیں اس قیمتی میز پہ اپنی اوقات آپ بتاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ "یہ فرق اسے پہلے کیوں نظر نہیں آیا تھا؟" تعجب سے سوچتے ہوئے اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا تھا۔ بے اختیار وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے قدم اور اس کی نظریں پورے گھر میں بھٹکنے لگی تھیں۔

ہر جگہ سے آسمان غائب تھا اور زمین رہ گئی تھی۔ یوں جیسے اس رات اپنی ذات سے متعلق اس کی تمام خوش گمانیاں غائب ہو گئی تھیں اور صرف اس کی لاچاری اور بے بسی رہ گئی تھی۔

وہ یہ کیسا نقصان کا سودا کر بیٹھا تھا؟ واقعی شاید اس سے بڑا بے وقوف اور کوئی نہ تھا جو خود کو عقل کل سمجھ کے نجانے کون کون سے پتھر اور کنکر اپنی جھولی میں اب تک بھرتا رہا تھا اور اب جو عقل ٹھکانے آئی تھی تو احساس ہوا تھا کہ وہ کتنے پانی میں تھا اور اپنے حق میں کتنے غلط فیصلے کر چکا تھا۔ پہلا غلط فیصلہ سوزی کو اپنی شریک سفر بنانے کا تھا۔ جس کی خود سر اور کھلی فطرت اس کے سامنے تھی' مگر پھر بھی اس نے سوزی کو ساری دنیا سے ٹکر لے کر اپنایا تھا کیوں کہ ان دونوں کی فیملیز ان کی شادی کے خلاف تھیں جبکہ انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ ان جیسی ذہنی ہم آہنگی شاید ہی کسی خوش نصیب جوڑے کے درمیان پائی جاتی ہوگی' لیکن جب سوزی ایک معشوقہ سے ایک بیوی کے روپ میں آئی تھی تب سیم کو احساس ہوا تھا کہ دھونس جمانے اور من مانی کرنے والی بے باک فطرت عورت کے ساتھ بطور شوہر اس کی ذہنی ہم آہنگی صفر کے برابر تھی۔ دونوں حکم دینے کے عادی تھے لینے کے نہیں۔ وہ یکایک ایسی دو تلواروں میں تبدیل ہو گئے تھے جو اپنی ہی غلطی سے ایک میان میں آگھسی تھیں اور اب ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کے درپے تھیں۔ بچے جیسا کوئی ننھا چو تکہ سوزی نے پیدا ہی نہیں ہونے دیا تھا۔

اس لیے دونوں نے مزید کسی مشکل کے اپنی اپنی راہ لی تھی۔

یہ الگ بات تھی کہ سیم کو اپنی دولت بچانے کے لیے بے تحاشا پاپڑ بیلنے پڑے تھے اور تب اس نے شادی جیسی بقول اس کے بے ہودہ اور لغو چیز سے ہمیشہ کے لیے توبہ کی تھی۔ لیکن وہ اپنی توبہ پر قائم نہیں رہ سکا تھا۔

محض ایک ہی ہفتے بعد لورین کا چہرہ اس کے دل' ذہن اور اس کے حواسوں پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ یونہی "آناً فاناً" لوگوں اور چیزوں کے عشق میں گرفتار ہونے کا عادی تھا۔ جب تک مقصود کو پا نہ لیتا' طلب کا بخار ایک سو چار درجے پہ پہنچا رہتا اور جب چیز دسترس میں آجاتی تو شوق کا پیمانہ بھرنے میں زیادہ دیر نہ لگتی اور اب کے تو واسطہ بھی لورین سے پڑا تھا۔ جو کسی ساحرہ سے کم نہ تھی۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے سے "زندگی" کشید کرنا جانتی تھی۔ وہ اتنی متحرک اور ایڈونچر پسند تھی کہ سیم جیسے سیمابی شخص کو بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنی رفتار بڑھانی پڑی تھی۔ اتنے عرصے بعد بنا کسی زنجیر کے یوں اڑے اڑے پھرنا اس کے لیے ایک بے حد رومانوی اور بھرپور تجربہ تھا جو اس نے لورین کے اصرار پہ ہی مارک تک سے چھپایا تھا۔

لورین کی ہمراہی نے اس کی من موجی اور بے نیاز فطرت کو خوب ہوا دی تھی۔ وہ کون تھی؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی؟ اس کا ماضی کیسا تھا؟ سیم کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

وہ بنا کسی کو بتائے خود جا کر اس کی ایک ایک چیز اس کے ڈربے نما مکان سے سمیٹ لایا تھا اور لا کر اس نے وہ تمام چیزیں بڑی محبت سے اپنی چیزوں کے ساتھ سجا دی تھیں۔ ایک دوسرے کے پہلو میں سجنے کے بعد ان کے درمیان موجود فرق اور بھی شدت سے ابھر کر آیا تھا' مگر تب بھلا سیم کو کب پروا تھی بلکہ اسے تو یہ فرق سرے سے نظر ہی نہیں آیا تھا یا شاید یہی قدرت کی منشا تھی۔

اور اب جب پٹی اترنے کا حکم آیا تھا تو وہ حق دق

بیٹھا اپنے سامنے موجود اس واضح ہوتے فرق کو دیکھ اور پرکھ رہا تھا۔ اپنے فیصلے جو اسے کبھی غلط نہ لگے تھے رات کے اس پہر اسے یکایک ان میں بہت سی خامیاں بہت سی کمزوریاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ اپنی بدلتی سوچ پہ حیران تھا۔ انگلیوں میں دبی راکھ ہوتی سگریٹ نے اس کی انگلیوں کو چھوا تھا تو وہ ایک جھٹکے سے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔

"یہ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اس نے پریشانی سے اپنا سر تھام لیا۔ "پہلے ہر زعم ڈھیر ہوا اور اب۔ اب یہ احساس!... او گاڈ... کیا میں ہر لحاظ سے غلط تھا؟"

نچلا لب دانتوں تلے دبائے اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا تب ہی ایک جھماکے کے ساتھ ذہن کی اسکرین پہ بے ہوشی کی حالت میں دیکھا جانے والا خواب واضح ہونے لگا۔

ویران' تاریک گلیاں' اس کے بھاگتے قدم' خوف ناک بھونکتے کتے' بند دروازے۔ اور ان سب کے درمیان اس کی مدد کے لیے کھلنے والا فقط ایک در... اس کے قدموں کا اس دہلیز کو چھونا۔ اور... اور اندر جانے کے بجائے پلٹ جانا! واپس تاریکیوں میں پلٹ جانا!... حیرت سے سوچتے ہوئے سیم بے اختیار پریشانی کے عالم میں سیدھا ہوا۔

"یہ۔ یہ بھلا کیسا خواب تھا؟" اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔ "اور یہ وہ کس پناہ گاہ کے دروازے کو کھلا چھوڑ آیا تھا۔ وہ بھی اندھیروں کی جانب مشکلات کی جانب..." تعجب سے سوچتے ہوئے اس کا دل سہم گیا تھا۔

نجانے کیوں! لیکن اسے یہ خواب محض خواب نہ لگ رہا تھا بلکہ ایک اشارہ لگ رہا تھا۔ ایسا اشارہ جو اس کی ایک فاش غلطی کی جانب کیا جا رہا تھا۔ اب اتنی بہت سی دریافت ہونے والی غلطیوں میں سے وہ سب سے بڑی غلطی کون سی تھی۔ سیم سمجھنے سے قاصر تھا۔ بالکل قاصر!

☆ ☆ ☆

ڈرائنگ روم میں وہ چاروں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو سمٹ چکی تھی اور اب وقت تھا کہ اصل موضوع کی جانب پیش رفت کی جاتی جس کا ہر پہلو کھلی کتاب کی طرح تھا۔ پھر بھی صغیر قاضی کو بات شروع کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دینے پڑے تھے۔

"بھائی جان اور آپا۔ آج میری آمد کا مقصد صرف مہر اور ہنی کے مسئلے کو حل کرنا ہے... آپ ہی بتائیں آخر آپ دونوں نے اس بارے میں کیا سوچا ہے؟" انہوں نے سامنے بیٹھے ابراہیم صاحب اور انجم بیگم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ابراہیم ملک نے اک گہری سانس لی۔

"سوچنا کیا ہے صغیر' ہر چیز تمہارے سامنے ہے... مہر کی ضد نے جیسے بے بس سا کر دیا ہے۔"

"وہ بچی ہے بھائی جان۔ اس کے پیچھے لگنا کہاں کی عقل مندی ہے۔" صغیر صاحب کی بات پہ زیب بیگم کی پریشان نگاہیں بہن کی جانب اٹھ گئیں۔ دونوں کی نظریں ملیں تو انجم نے اک بے آواز بوجھل سی سانس کھینچی۔

"تو کیا کروں؟ تم ہی بتاؤ؟" ابراہیم صاحب نے تھک کے صغیر قاضی کی جانب دیکھا۔

"میرے خیال میں تو آپ سب سے پہلے' اسے قاضی ولا رخصت کرنے کی تیاری کریں۔" اور شوہر کی بات پہ زیب کا دل اس تیزی سے ڈوب کر ابھرا کہ ان کی سانس ایک پل کو رک سی گئی۔

"لیکن صغیر! مہر ایسا نہیں چاہتی۔" انجم بیگم نے سرعت سے مداخلت کی۔

"جانتا ہوں آپا! لیکن اب تھوڑی سی سختی تو کرنی پڑے گی آپ دونوں کو۔"

"چلو مان لیا کہ ہم یہ سختی کر لیتے ہیں' لیکن اس زور زبردستی سے اس کا دل تو نہیں بدلا جا سکتا نا۔" انجم کی بات پہ زیب بیگم کو تھوڑا حوصلہ ہوا۔

"اس کا دل ان حالات میں بدلے گا بھی نہیں۔ آپ لوگ ذرا حالات کو نیا رخ دینے کی کوشش تو

کریں۔" صغیر صاحب نے رسان سے کہتے ہوئے انجم اور ابراہیم صاحب کو دیکھا۔

"حالات اتنی آسانی سے نیا رخ نہیں لیں گے صغیر۔" ابراہیم ملک کے بوجھل لہجے پہ صغیر قاضی بے اختیار خاموش ہو گئے۔

"تو بس پھر اس نام نہاد رشتے کو ختم کیجئے۔ معاملہ خود ہی پار لگ جائے گا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد صغیر صاحب دوٹوک لہجے میں بولے تو ڈرائننگ روم میں موجود تینوں افراد پہ خاموشی چھا گئی۔

"معذرت کے ساتھ بھائی جان! لیکن میں اب اس بات کو مزید لٹکانے کے حق میں نہیں اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تو پریشان حال زیب بھی شوہر کے انداز پہ اندر ہی اندر خائف ہوتی اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔

"اچھا صغیر! تم بیٹھو تو سہی۔" بہنوئی کا یوں اٹھ جانا' انجم کو بھی پریشان کر گیا' وہ سرعت سے انھیں تو ابراہیم ملک جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ گئے۔

"تم صحیح کہتے ہو۔ اس نام نہاد رشتے کو واقعی اب اپنے انجام تک پہنچ جانا چاہیے۔" ان کی بات پہ صغیر قاضی نے سوائے خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے کے کوئی جواب نہ دیا' لیکن انجم اور زیب کے دل جیسے بیٹھ سے گئے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ' کچھ تو سوچیں۔" انجم نے پلٹ کر دہائی دی۔ ابراہیم صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سوچ لیا ہے۔ مہر کی جان اس رشتے سے چھوٹے گی تو کچھ ہو گا۔" ان کے قطعی لہجے پہ انجم بے بسی سے خاموش ہو گئیں۔

"میں کل ہی اپنے وکیل سے بات کرتا ہوں۔" انہوں نے صغیر قاضی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ ہمیں اب اجازت دیں۔" انہوں نے ایک نظر ساتھ کھڑی بیوی پہ ڈالی جن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ نگاہیں چرائے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے تو زیب کے لبوں سے دبی دبی سی سسکی نکل گئی۔

بے اختیار انجم نے آگے بڑھ کے انہیں خود سے لگا لیا۔

"مجھے معاف کر دو زیبی۔ میں اماں کے بنائے ہوئے رشتے کو بچا نہ سکی۔" آنسو انجم بیگم کی آنکھوں سے ٹوٹ کے بہہ نکلے تو بہن کے سینے سے لگی کھڑی زیب کا ضبط بھی جواب دے گیا۔

جبکہ ابراہیم ملک اپنی چچی کی روح سے شرمندہ ہوتے چور چور دل لیے باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

صبح کے آٹھ بج رہے تھے جب مارک نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اپنے برابر خالی بستر دیکھ کے وہ یہی سمجھا تھا کہ سیم باتھ روم میں ہو گا' مگر جب دس منٹ تک اندر سے کوئی بر آمد نہ ہوا تو وہ تیزی سے اٹھ کر باتھ روم کی جانب گیا اور اسے خالی دیکھ کر وہ یک لخت گھبرا گیا۔

الٹے پیروں کمرے کا دروازہ کھول کے وہ تیز قدموں سے لاؤنج میں چلا آیا اور صوفے پہ نظر پڑتے ہی اس کے سینے سے اک سکون بھری سانس بر آمد ہوئی۔ سیم صوفے پہ لیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔

وہ مطمئن سا چلتا دوسری طرف رکھے کاؤچ پہ آگے کو سا گیا۔ سوئے ہوئے سیم کو بے دھیانی سے تکتے ہوئے وہ سیدھا ہوا تو نظریں صوفے کے ایک جانب' نیچے زمین پہ رکھے درمیانے سائز کے گتے کے ڈبے پہ پڑیں۔

"یہ تو رات تک یہاں نہیں تھا۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس ڈبے کی جانب بڑھا۔ اور اسے کھول کر دیکھنے کو جھکا' لیکن جوں ہی اس کی نظر اندر رکھی چیزوں سے ٹکرائی وہ بے اختیار ٹھٹک گیا۔

وہ سب لورین کا سامان تھا۔ یعنی سیم رات بھر اسی حادثے اور اسی عورت میں پھنسا رہا تھا۔ سیدھے ہوتے ہوئے اس کی متفکر نگاہیں سیم پہ جا ٹھہری تھیں۔ جو نجانے کب سویا تھا؟ اسے جگانے کا ارادہ ترک کر کے وہ باتھ روم میں چلا آیا تھا اور جب فریش

ہو کے واپس آیا تھا تب سیم آنکھیں کھولے صوفے پہ چت لیٹا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" مارک اس کے پیروں کی جانب آرکا۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔ تم نے وہ تصویر کہاں رکھی ہے؟" سیم کی نگاہیں چھت پہ سے ہٹ کے مارک کے چہرے پہ آنکیں جو اس کے سوال پہ بری طرح چونکا تھا۔ یعنی سیم جان گیا تھا کہ اس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے ان دونوں کی تصویر اس نے اٹھائی تھی۔

"اندر الماری میں ہے۔" اس کے بے تاثر چہرے کو تکتے ہوئے مارک نے جواب دیا۔

"لے آؤ پلیز۔" وہ دھیرے سے بولا تو مارک بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔ الماری میں سے تصویر نکال کے وہ واپس آیا تو سیم اٹھ کر بیٹھ گیا اور خاموشی سے اس کے ہاتھ سے فریم پکڑ لیا۔

فریم میں جڑی تصویر پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا' اس نے فریم کو الٹ کر اندر موجود تصویر نکالی' اس کے کئی ٹکڑے کیے اور فریم کو بیٹھے بیٹھے پرے پڑے ڈبے میں اچھال دیا۔ اس کی اس حرکت پہ مارک لحظہ بھر کو حیران رہ گیا' لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے قصداً" نارمل لہجے میں سوال کیا۔

"تم نے اپنی باقی چیزوں کو چیک کیا ہے؟"

"ہوں۔۔۔" اس نے محض ہنکارا بھرا۔

"زیادہ نقصان تو نہیں ہوا نا؟" اور مارک کے سوال سیم کی خالی خالی سی نگاہیں اس کے چہرے پہ آٹھہریں۔ اس کے تاثرات پر مارک پریشان ہو گیا۔

"کیا زیادہ نقصان ہوا ہے؟" وہ اس کے قریب چلا آیا۔

"بہت۔ بہت زیادہ۔" اس نے دل گرفتی سے جواب دیا۔

"مگر تمہارا لاکر تو محفوظ ہے۔" مارک پریشانی سے بولا۔

"بس وہی محفوظ ہے' باقی تو سب ختم ہو گیا۔" سیم نے تھکے ہوئے انداز میں اپنا سر صوفے کی پشت پہ ڈال دیا۔

"تم ایسا کرو ناشتا کر کے غائب ہونے والی ساری چیزوں کی ایک لسٹ بناؤ۔ ہمیں اب یہ معاملہ ہر حال میں پولیس کے حوالے کرنا ہو گا۔" مارک کی بات پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ سیم کے لبوں پہ پھیل گئی۔ اس کی نظریں اوپر چھت پہ جمی نجانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

"ساری رات یہی تو کیا ہے۔"

"اچھا!" مارک نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔ "یہ تو بہت عقل مندی کا کام کیا تم نے۔"

"بس ایک آخری چیز سمجھ میں نہیں آرہی۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کے مارک کو دیکھا۔

"کیا؟"

"یہ کہ میں کس پناہ گاہ کے دروازے کو کھلا چھوڑ آیا ہوں؟" اور مارک کا منہ اس کی بات پہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر پلیز! مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ وہ کبھی بھی میرے ساتھ یہاں آپ کے کلینک نہیں آئے گا۔" شام میں مارک سائیکاٹرسٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ سیم کی حالت اس سے ڈسکس کرنے کے بعد مارک نے ملتجی لہجے میں کہا تو ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا آپ میرے کزن بن کے اس کے گھر میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟" مارک نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر پل بھر کو خاموش ہو گیا۔

"دیکھیں مسٹر مارک ' ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے صرف ایک سٹنگ تو نہیں۔۔۔"

"میں جانتا ہوں سر! لیکن اگر آپ ایک بار اس سے مل لیں گے تو شاید اگلی بار وہ خود آپ سے ملنے کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ پلیز۔ پلیز میری درخواست قبول کرلیں۔ دیکھیں یہ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے مارک التجائیہ انداز میں بولا تو ڈاکٹر جیسے بے بس سا ہو گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں چلوں گا آپ کے ساتھ۔"

"بہت بہت شکریہ سر۔۔۔ میں آپ کی مدد کے لیے ممنون ہوں۔" مارک کا چہرہ کھل اٹھا۔

"آپ بس اتنا خیال رکھیے گا کہ آپ کی باتوں سے اسے یہ شک نہ ہو کہ آپ ایک سائیکاٹرسٹ ہیں۔"

"بے فکر رہیں۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اپنے سامنے کھلے لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلائیں۔

"کل میں پانچ سے چھ کے درمیان فارغ ہوں ' آپ پونے پانچ بجے تک یہاں پہنچ جائیے گا۔" اس نے اپنا شیڈیول چیک کیا۔

"ضرور۔۔۔" مارک مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک بار پھر آپ کا بہت شکریہ۔" وہ ممنون سا بولا تو ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

رات کھانے کی میز پہ وہ تینوں موجود تھے۔ مارک چونکہ جوزفین کو ساری بات سے آگاہ کر چکا تھا۔ اس لیے ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان اس نے قصداً" یوں بات شروع کی جیسے ابھی ابھی کچھ یاد آیا ہو۔

"ہاں میکی تمہارے کزن کا کیا بنا؟" اس نے کھانا کھاتے ہوئے مارک کی طرف دیکھا۔

"پہنچ گیا ہے وہ۔۔۔ کل ملنے کے لیے کہہ رہا ہے۔"

"پھر؟" جوزفین نے جواباً" استفسار کیا۔

"سوچ رہا ہوں اسے کل شام یہاں انوائٹ کرلوں۔ اگر سیم کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔" مارک نے سیم کی طرف دیکھا۔

"کیوں نہیں۔" سیم نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تم اس سے ملو گے نا۔" مارک نے نرمی سے پوچھا تو سیم جھجک سا گیا۔ اس کی جو کیفیت تھی اس میں فی الوقت وہ کسی سے بھی ملنے ملانے کا خواہاں نہ تھا' مگر وہ یوں دو ٹوک انکار مارک کو نہیں کر سکتا تھا۔

"دیکھو۔" وہ محض یہی کہہ پایا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ تمہارا گھر ہے اور تم ہی نہ ملو۔ یہ تو اچھا نہیں لگے گا۔" مارک کی بات پہ وہ لحظہ بھر کو خاموش ہو گیا۔

"ویسے بھی تمہیں اب اپنی نارمل روٹین کی طرف آنا چاہیے سیم۔" جوزی نے بھی مداخلت کی تو وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

"شاید تم صحیح کہہ رہی ہو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ تو مارک بے اختیار مسکرا دیا۔

"زبردست۔ یہ کی نا مردوں والی بات۔۔۔ تمہیں اپنی دل پاور سے خود کو سنبھالنا ہو گا۔" اس کے رسان سے کہنے پر سیم دھیرے سے مسکراتا اپنی پلیٹ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"واقعی۔ مجھے اپنی قوت ارادی سے ہی خود کو ان فضول سوچوں سے نکالنا ہو گا۔" نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

"تمہاری غلطیوں کی نشان دہی کرتی یہ سوچیں

فضول ہیں کیا؟" اندر سے ایک آواز سی آئی تو اس کا نوالہ چباتا منہ رک گیا۔

"فضول نہ سہی، لیکن یہ میرا سوچنے کا انداز نہیں! میں چیزوں کو اس نظریے سے دیکھنے کا عادی نہیں!" اس نے غصے سے اس آواز کو باور کروایا۔

"تب ہی تو منہ کے بل گرے ہو۔" آواز نے ٹھٹھا لگایا تو سیم نے لب بھینچتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا کانٹا پلیٹ میں پٹخ دیا۔

اس کی اس حرکت پہ اپنے دھیان میں کھانا کھاتے مارک اور جوزی نے چونک کر اس کی طرف اور پھر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"سیم! تم ٹھیک تو ہو؟" اور مارک کی آواز پہ اسے بھی جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ وہ بری طرح شرمندہ ہوگیا۔

"آئی ایم سوری۔ سو سوری یار۔" چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے مقابل بیٹھے مارک کی طرف دیکھا۔

"کوئی بات نہیں، لیکن تم ٹھیک تو ہو نا؟" مارک نے نرمی سے اپنا سوال دہرایا۔

"ہاں نہیں۔۔۔ نہیں میں ٹھیک نہیں۔ شاید کل رات کی بے آرامی نے مجھے تھکا دیا ہے۔" مزید بات بنانے کا اس میں حوصلہ نہ ہوا تو تھک کر اس نے قبول کرلیا۔

"میں تمہاری دوائیں لاتی ہوں۔" جوزی سرعت سے اٹھی۔

"نیند کی دوا بھی لاؤ۔ اس کے لیے بھرپور نیند بہت ضروری ہے۔" مارک نے کچھ سوچتے ہوئے باآواز بلند کہا تو جوزی اثبات میں سرہلاتی کمرے کی طرف چل دی۔

جوزی نے دوائیں لا کے اس کے سامنے رکھیں تو سیم نے چپ چاپ انہیں منہ میں رکھ لیا۔

"میں لیٹنے جارہا ہوں۔" کرسی پیچھے دھکیلتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تو دونوں نے اثبات میں سرہلا دیا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے دروازہ بند کیا اور بیڈ پہ گرنے کے انداز میں لیٹ گیا۔ وہ اس وقت کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بھی!

سختی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے چہرے پہ بازو رکھ لیا۔ اب یہ اس کی کوشش تھی یا نیند کی دوا کا اثر کہ جلد ہی اسے اپنے اعصاب پہ غنودگی چھاتی محسوس ہوئی تھی اور اسی سوئی جاگی کیفیت میں اسے دور سے ایک آواز ذہن پہ دستک دیتی محسوس ہوئی تھی۔

"ٹوٹتا ہے جب جامِ آرزو
تب درِ آگہی کھلتا ہے۔۔۔"

"آں۔ یہ۔ یہ کس کی آواز ہے؟" ڈوبتے ذہن نے سوچنے کی کوشش میں آنکھوں کو کھولنے کی سعی کی تھی مگر پپوٹوں پہ گویا منوں بوجھ آدھرا تھا۔ اتنے میں آواز دوبارہ آئی تھی، لیکن مزید دور سے۔

"ٹوٹتا۔۔۔ جام آرزو
در آگہی کھلتا۔۔۔"

"مطلب؟" ایک اور آواز ابھری تھی اور اس کے ساتھ ہی ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ گہرا سناٹا!

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

مہوش افتخار

جاں آرزو

مہر ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ اپنی کزن جائشہ کی منگنی کی تقریب میں اس لیے شرکت نہیں کرنا چاہتی کہ وہ حنان سے سامنا نہیں چاہتی جو جائشہ کا بھائی ہے۔ یہ جان کر حنان ملک سے باہر ہے۔ وہ تقریب میں شرکت کے لیے چلی جاتی ہے۔ لیکن حنان وہاں آجاتا ہے۔ مہر اسے دیکھ کر اپنے گھر واپس آنے کے لیے نکلتی ہے تو حنان سے سامنا ہوتا ہے۔ مہر کے نفرت بھرے رویے پر وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس توہین کو معاف نہیں کرے گا۔ حنان' زیب بیگم اور صغیر صاحب پر زور دیتا ہے کہ اب مہر کی زندگی کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ وہ کب تک اس طرح کی زندگی گزارتی رہے گی۔ مہر کا نکاح بچپن میں ہو چکا ہے۔

انجم بیگم اور زیب بیگم دونوں بہنیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ مہر کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہو' لیکن صغیر صاحب اس کے لیے راضی نہیں۔ زیب بیگم کو حنان کے گندے کردار کا بھی اندازہ ہے۔

سیم اپنے ماں' باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ نازو نعم میں پرورش پائی۔ اس کی زندگی کی اولین ترجیح دولت ہے۔ وہ امریکہ میں تنہا رہتا ہے اور اپنی ذاتی فرم کا مالک ہے جس میں اس کا دوست مارک شریک ہے۔ وہ آزاد زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے

مکمل ناول

سوزی سے اپنی پسند سے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک بار گرل لورین اس کی زندگی میں آئی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتی ہے۔ پھر ایک دن اس کے فلیٹ کا صفایا کر کے اس کو کچرے کے ڈھیر پر پھنکوا دیتی ہے۔ زمین پر اس کے وجود پر ٹھوکریں مارتی ہے۔ سیم ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی آنکھ اسپتال میں کھلتی ہے۔ اس کا پارٹنر اور دوست مارک اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

سیم پر اس حادثے کا گہرا اثر ہے۔ وہ گم صم ہے۔ اسے بار بار وہ خواب یاد آتا ہے جو اس نے بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ تاریک انجان گلیوں میں دو بھوکے کتے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ وہ چلا چلا کر مدد مانگ رہا ہے لیکن سب دروازے بند ہیں۔ تب اچانک ایک دروازہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن اندر نہیں جاتا۔ دوبارہ بھاگنے لگتا ہے۔ تب وہ کچرے کے ڈھیر پر جا گرتا ہے اور تیز بدبو اس کی ناک اور منہ میں گھسنے لگتی ہے۔

اس حادثے کے بعد سیم پہلی بار اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور تب اس کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ کس پناہ گاہ کے دروزا [illegible]

دوسری قسط

مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں، جب جائشہ اور نورینہ نے مہر کو گھر ڈراپ کیا تھا۔ اس کے بے حد اصرار پر بھی وہ دونوں اندر نہیں آئی تھیں۔ ان کے گاڑی آگے بڑھانے کے بعد وہ شاپنگ بیگز اٹھائے گیٹ سے اندر چلی آئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں کے ساتھ بازار میں گھومتے ہوئے اس نے اچھی خاصی خریداری کرلی تھی۔ جو ہمیشہ کی طرح اس کی ذاتی چیزوں سے زیادہ انجم بیگم' ابراہیم صاحب اور گھر کے لیے نت نئی چیزوں پر مشتمل تھی۔

اسے سامان سے لدا پھندا دیکھ کے دل شیر سرعت سے آگے آیا تھا۔ مہر چیزیں اس کے حوالے کر کے سیدھی ہوئی تو نظریں سامنے پورچ میں' اپنی گاڑی کے برابر کھڑی ابراہیم صاحب کی گاڑی سے جا ٹکرائیں۔ وہ بے اختیار چونک گئی۔ یہ وقت ان کے آفس سے واپسی کا تو نہیں تھا۔

"بابا کب آئے؟" اس نے پلٹ کر دل شیر کی طرف دیکھا۔

"آپ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی آگئے تھے بی بی۔" اس کے جواب نے مہر کو پریشان کر دیا۔

"کیوں خیر تھی؟"

"جی... جی... وہ صغیر صاحب اور بیگم صاحبہ آئی تھیں نا۔" اور مہر اس اطلاع پہ ٹھٹک کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"کتنی دیر بیٹھے تھے وہ لوگ؟" اس کے بے تاثر لہجے پہ دل شیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہی کوئی گھنٹہ ڈیڑھ بی بی۔"

مہر کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انجم بیگم کا صبح سے مضطرب اور خاموش انداز گھوم گیا' ساتھ ہی شام میں ان سے ہونے والی اپنی گفتگو اس کے ذہن میں تازہ ہوئی تو جیسے کچھ کھٹک سا گیا۔

"کہیں ان لوگوں نے مجھے قصداً" تو باہر نہیں بھیجا تھا؟" اس خیال کے آتے ہی اس کا چہرہ تن گیا۔ لب بھینچے وہ تیز قدموں سے آگے بڑھی۔ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی انجم بیگم کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"تو آپ لوگ صبح سے یہ سب پلان کیے بیٹھے تھے۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہی تھی۔

"جاؤ جا کے پہلے نماز پڑھو۔" اس کی بات کو نظر انداز کیے انجم بے تاثر لہجے میں بولیں تو مہر کا ضبط جواب دے گیا۔

"میری بات کا جواب دیں مما جان! کیوں کیا آپ لوگوں نے ایسا؟" وہ زور سے بولی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ابراہیم ملک کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ وہ ابھی چند لمحے پہلے ہی گھر لوٹے تھے۔

"ہم نے جو مناسب سمجھا' وہ کیا۔" ان کی آواز اچانک کمرے میں گونجی تو مہر کے ساتھ ساتھ انجم بیگم نے بھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ان کی بات پہ مہر کے چہرے پر دکھ کی کیفیت پھیل گئی۔

"معذرت کے ساتھ بابا جان۔ لیکن میرے حق میں آپ لوگوں نے نہ کل کوئی مناسب فیصلہ کیا تھا اور نہ آج۔" اور ابراہیم صاحب کا چہرہ بے اختیار پھیکا پڑ گیا۔

"ہم اپنی غلطی مانتے ہیں۔ اس لیے آج ہم نے اس رشتے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ ان کی بات پہ مہر کی رنگت زرد پڑ گئی۔ "اس منحوس رشتے سے تمہاری جان چھوٹے گی تب ہی ہم تمہارے مستقبل کا کوئی بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔"

"میرا مستقبل۔۔۔ ہا!" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "ایک بات بتائیں بابا جان۔ کیا ہوں میں آپ سب کے لیے؟ کوئی کٹھ پتلی یا کوئی مذاق؟ میری آبادی' میری بربادی کہیں پہ تو فیصلے کا حق مجھے دے دیں۔" بے بسی کے مارے اس کی آواز چیخ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے تو پھر فیصلہ کرو۔۔۔ یا تو یہ رشتہ ختم ہو گا یا پھر تم قاضی ولا کے لیے روانہ ہو گی۔" ابراہیم صاحب نے آگے کنواں پیچھے کھائی کے مصداق اس کے لیے دو راستے رکھے تو مہر کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے ان کی توقع کے عین مطابق جواب دیا تھا' ابراہیم صاحب نے فوراً" سے پیشتر نتیجہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تو پھر یہ طے ہوا کہ تم یہ رشتہ ختم کرنے والی ہو۔"

"میں ایسا کچھ۔۔۔"

"مہر!" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ اس زور سے دھاڑے کہ مہر اپنی پوری جان سے کانپ کر رہ گئی۔ انجم بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "نہ یہ' نہ وہ۔ تم آخر چاہتی کیا ہو؟ سارا خاندان ہمیں باتیں بنا رہا ہے۔ شک کر رہا ہے ہماری نیت پہ' بولو میں انہیں کیا جواب دوں۔" غصے سے اسے گھورتے ہوئے وہ ایک قدم آگے آئے تو انجم بیگم نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا۔ ان کا سہارا ملتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

"زندگی کو تماشا بنا کے رکھ دیا ہے تم لوگوں نے' لیکن ایک بات کان کھول کے سن لو۔ میں اب یہ بچپنا مزید برداشت نہیں کرنے والا۔ یہ معاملہ اب ہر حال میں نپٹے گا اور اگر کسی نے میرے خلاف جانے کی کوشش کی تو میں اس سے اپنا ہر تعلق ختم کر لوں گا۔" انجم بیگم کی آنکھوں میں ڈولتی نمی نظر انداز کیے وہ پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

دروازے کی زور دار آواز پہ انجم بیگم کے اٹکے ہوئے آنسو چہرے پہ بہہ نکلے تھے۔ بے اختیار روتی ہوئی مہر کو سینے سے لگائے وہ خود بھی پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھیں۔

☼ ☼ ☼

صغیر صاحب اپنی اسٹڈی میں بظاہر فائلیں کھولے بیٹھے تھے۔ لیکن پچھلے ڈھائی گھنٹوں سے ان کا ذہن بہت سی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس معاملے میں حتمی فیصلہ لے کر انہوں نے بہت بڑی ذمہ داری اپنے کندھوں پہ لے لی تھی۔ گو کہ وہ کسی کے آگے جواب دہ نہ تھے۔ مگر پھر بھی اگر آنے والے وقت میں ان کا یہ فیصلہ کسی بہتری کی سبیل نہ بن پاتا تو وہ اپنی ہی نظروں میں معتوب ٹھہر جاتے اور یہی سوچ انہیں مسلسل

مضطرب کیے ہوئے تھی۔

زیب تو سارا راستہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی تھیں۔ وہ ایک لفظ نہ بولی تھیں۔ گھر پہنچ کے وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

وہ کتنی ہی دیر چپ چاپ تنہا لاؤنج میں بیٹھے رہے تھے اور پھر تھک کر اپنا دھیان بٹانے کو اسٹڈی میں آ کر فائلیں کھول کے بیٹھ گئے تھے۔ مگر ذہنی کشمکش پر قابو نہ پا سکے تو کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موندلی تھیں۔ یوں بیٹھے انہیں نجانے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ جب دروازے پہ دستک کے بعد جائشہ کی آواز سنائی دی تھی۔

"ڈیڈی!"

"آ جاؤ بیٹا!" سر اٹھاتے ہوئے انہوں نے جواب دیا تو دروازہ کھول کے جائشہ اندر چلی۔

"کیا بات ہے ڈیڈی! آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ ادھر امی اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی ہیں.... وہاں کوئی بات تو نہیں ہوئی نا؟" انہیں دیکھتے ہوئے اس نے پریشانی سے سوال کیا تو صغیر صاحب نے اک گہری سانس لی۔

"تم نے کھانا لگوایا ہے؟"

"جی میں آپ کو اسی لیے بلانے آئی تھی۔" ان کے بات پلٹ دینے پر جائشہ حیران ہوتی دھیرے سے بولی تو صغیر صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو آؤ، پہلے کھانا کھاتے ہیں۔" اسے اپنے بازو کے حصار میں لیے وہ دروازے کی جانب بڑھے۔ جائشہ بھی خاموشی سے ان کے ساتھ چل دی۔

وہ دونوں لاؤنج میں داخل ہوئے تو حنان شلوار قمیص میں، آستینیں چڑھاتا سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دیتے رک کر اسے دیکھنے لگے۔ جو آج خلاف معمول اپنے سیر سپاٹوں کی بجائے جلدی گھر آ گیا تھا۔

"آج تم اس وقت کیسے گھر آ گئے؟"

"بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" اس نے بہانا بنایا۔ صغیر صاحب اثبات میں سر ہلاتے آگے بڑھ گئے تو حنان بھی ان کے پیچھے چل دیا۔

ڈائننگ روم میں نویرہ پہلے سے ان سب کی منتظر تھی۔

"امی نہیں آئیں؟" اس کے سوال پہ حنان کے کان کھڑے ہو گئے۔

"اوں ہوں، تمہارے کمرے سے نکلنے کے بعد انہوں نے منع کر دیا تھا۔" جائشہ نے کرسی کھینچی۔ اس کی بات پہ نویرہ خاموش ہو گئی۔ اس نے زیب بیگم کی کتنی منتیں کی تھیں کہ وہ تھوڑا سا کھانا کھا لیں مگر...

مزید کچھ کہے بغیر سب نے کھانا شروع کیا۔ تو دونوں بہنوں نے پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پتا نہیں وہاں کیا ہوا تھا جو امی اور ڈیڈی دونوں کو ہی چپ لگ گئی تھی۔

"پھر کیا بات ہوئی وہاں پہ؟" اپنا تجسس دبائے حنان نے چند لمحوں کے صبر کے بعد سوال کیا تو دونوں لڑکیوں نے بے اختیار باپ کی طرف دیکھا۔

"کل بھائی جان کا وکیل آ رہا ہے۔ میں نے یہ نکاح ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا تو سب کا مارے بے یقینی کے منہ کھل گیا۔

"کیا!" نویرہ کے لبوں سے سرسراتا ہوا فقط یہی لفظ نکل پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سیم۔" اپنے شانے پہ کسی کے ہاتھ کا دباؤ اور اپنے نام کی پکار پہ گہری نیند سوئے ہوئے سیم کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"ہوں۔" مندی مندی آنکھوں سے اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا تھا۔ جہاں مارک کھڑا تھا۔ اس پہ نگاہ پڑتے ہی سیم کے سوئے ہوئے حواس قدرے جاگ گئے تھے۔

"ہاں۔"

"سوری یار! میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ لیکن میں آفس جا رہا ہوں۔ تمہیں اس لیے جگا کر جا رہا ہوں کہ جب تم اٹھو تو پریشان نہ ہو۔" مارک نے نرمی سے

کہا۔

"اوکے۔" سیم نے کروٹ لی۔

"ناشتے کا سارا سامان فریج میں رکھا ہے۔" مارک نے مطلع کیا تو آنکھیں بند کیے پڑے سیم کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اوکے مام..." اس کے شوخ انداز پہ مارک بھی خوشگوار حیرت لیے مسکرا دیا۔ رات کے برعکس اس کی طبیعت میں خاصی بہتری محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اس خیال کا اظہار اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

"ہاں ہاں اڑا لو میری محبت کا مذاق۔" مارک نے قصداً" ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ سیم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"قسم سے یوں دہائیاں دیتے ہوئے میری بیوی لگ رہے ہو۔"

"بکومت۔" اس کی پشت کو مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے وہ گھوم کر بیڈ کی دوسری جانب آکھڑا ہوا۔ "کبھی ہاں ہی بیوی۔ تمہیں لگ رہا تو میں جناب کو بزنس پاٹنر نہیں لگ رہا... ذرا یہ تو بتاؤ۔ آفس کب سے جوائن کرنے کا ارادہ ہے؟" اس کے جل کر کہنے پہ سیم نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔

"فی الحال تو میرا صرف ریسٹ کرنے کا ارادہ ہے۔"

"شاباش ہے! اور کام کون کرے گا؟" اس نے استہزائیہ انداز میں سیم کو دیکھا۔

"تم ہو نا۔" سیم نے حظ اٹھایا۔

"ہاں میں ہوں نا' ہر مرض کی دوا!... تمہیں سنبھالوں' تمہارے گھر کو سنبھالوں' تمہارے آفس کو سنبھالوں۔ کیوں نا میں تمہیں گود لے لوں سیم؟" وہ کلس کر بولا تو سیم نے اپنی گہری ہوتی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔

"ہاں یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے ممی۔"

"سیم!" اس کے آنکھیں نکالنے پہ وہ ہنس دیا۔

"اوکے بابا کوشش کرتا ہوں ایک دو دن تک آنے کی۔"

"کوشش نہیں ہر حال میں آنا ہے۔" وہ پلٹ کر اپنی ٹائی لینے کو آگے بڑھا۔

"اور آج شام میرے کزن نے آنا ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟"

"ہاں' یاد ہے۔" وہ سیدھا ہوتا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اٹھا کر دم لیا ہے تم نے۔" اس نے مارک کی پشت کو گھورا جو ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے مسکرا دیا۔

"اچھا کیا ہے۔ دیکھو ذرا کیسا چمکیلا دن نکلا ہے باہر اور تم یہاں بستر میں پڑے ہو۔" ٹائی چھوڑ کے اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو کمرہ چمکتی روشنی سے بھر گیا۔

"زبردست!" سیم کی نظریں نیلاہٹیں چھلکاتے آسمان پہ ایک پل کو جم سی گئیں۔ "یہ تو واقعی باہر گھومنے پھرنے کا دن ہے۔"

"ہاں تو ناشتے کے بعد واک کے لیے نکل جاؤ۔ دیکھو یار غلطیاں سب سے ہوتی ہیں اور ان کے نتائج بھی ہم سب کو جھیلنے پڑتے ہیں۔ تم اس حادثے کو بھول کر باہر نکلنے کی کوشش کرو۔"

"ہوں... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے خود پہ سے لحاف ہٹایا۔

"شکر ہے خدا کا تمہیں میری کوئی تو بات سمجھ میں آئی مارک نے بے اختیار شکر کا کلمہ پڑھا۔

"میں اب جا رہا ہوں تم اگر باہر جاؤ... تو پلیز اپنے بلاک کے پارک تک ہی جانا اور یہ سیل فون اپنے ساتھ لے جانا۔" اس نے قریبی میز پہ اپنا سیل رکھ دیا تو سیم کی آنکھوں میں ممنونیت کا احساس اتر آیا۔ مارک سچ میں ایک بہترین انسان اور باکمال دوست تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کے سیم نے خود کو ذہنی طور پہ تیار کرتے ہوئے اپنے جوگرز پہنے تھے' مارک کا موبائل اٹھا کر اس نے عادتاً" اپنے والٹ کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مارے تو یاد آیا کہ وہ تو اسی رات ہی اس سے چھین لیا گیا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے قصداً" خود کو مزید کچھ سوچنے سے روکا تھا' اور اندر

ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔
الماری میں موجود لاکر کھول کر پیسے نکالتے پر اسے احساس ہوا تھا کہ ہسپتال سے لے کر اب تک مارک ہی تمام اخراجات اٹھائے ہوئے تھا۔ اپنی اس لاپروائی پہ اسے ازحد شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ وہ واقعی مارک اور جوزی کی نا صرف ذاتی بلکہ کاروباری زندگی بھی ڈسٹرب کیے ہوئے تھا اور یہ ناوانی اسے مزید زیب نہیں دیتی تھی۔
دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتے ہوئے اس نے کل سے ہی آفس جوائن کرنے کی ٹھانی تھی۔
وہ اپارٹمنٹ لاک کر کے نیچے آیا بلڈنگ سے نکلنے پر ہوا کے خوشگوار جھونکے نے اس کا استقبال کیا تھا۔
بے اختیار اک گہری سانس کھینچتے ہوئے سیم نے دلچسپی سے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔
آج نجانے کتنے عرصے بعد وہ یوں واک پہ نکلا تھا۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ اسے یہ تفریح بہت اچھی لگ رہی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل وہ ایسی تھکی ہوئی تفریحات کو بزرگوں، بیماروں اور بورنگ لوگوں سے منسوب کیا کرتا تھا۔ مگر آج اسے پارک کی پرسکون اور خوشگوار فضا میں، درختوں کی سبز چھاؤں تلے، پرندوں کی آوازیں سنتے ہوئے احساس ہوا تھا کہ کبھی کبھی ہر ہنگامے سے دور، کچھ نہ سوچنا اور دھیرے دھیرے بے مقصد قدم اٹھانا بھی کتنے لطف کا باعث بن سکتا ہے۔
بالآخر وہ ایک ترتیب سے لگے بنچوں میں سے ایک پہ بیٹھ گیا اور اپنے دونوں بازو بینچ پہ پھیلا دیے تھے۔
وہ اپنے دھیان میں بیٹھا تھا جب قریب ہی کسی نے گٹار پہ بڑی خوب صورت دھن چھیڑی تھی۔ وہ بے اختیار چونک گیا تھا۔ سیدھے ہوتے ہوئے اس نے اپنے دائیں بائیں اور پھر پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا — تبھی اس کی نظر پارک کی حد پہ لگے جنگلے میں سے نظر آتے فٹ پاتھ پہ کھڑے ہوئے ایک لڑکے کی پشت سے ٹکرائی تھی۔ جس کے ہاتھ میں گٹار تھا اور نیچے زمین پہ اس گٹار کا خالی کیس کھلا پڑا تھا۔
چند لمحوں کی اوپننگ کارڈز بجانے کے بعد اس کی آواز شامل دھن ہوئی تو سیم مبہوت ہو گیا۔ لڑکے کی آواز بے حد خوب صورت تھی۔ سیم نا چاہتے ہوئے بھی سُر میں ڈوبے اس گیت کو سننے لگا۔ جو جنگ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ یکجہتی کی داستان سنا رہا تھا۔

"اے پہاڑ کی کہر آلود آنکھوں
میرے بھائی کی روح پر گہری نگاہ رکھنا
اور جب آسمان آگ اور دھوئیں سے بھر جائے
تم ڈیورن کے بیٹوں کی حفاظت کرنا۔
اگر یہیں زندگی کا خاتمہ ہے
تب ہم سب کو ایک ساتھ جلنا چاہیے
اور اگر آج کی رات ہمیں مرنا ہے
تب ہم سب کو ایک ساتھ مرنا چاہیے۔"

سیم بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکے کے سامنے کھڑا ہو کے اسے سنے۔ جواب اگلا بند گا رہا تھا۔

"آہ! اگر میرے لوگوں کو آج گرنا ہے
تو میں بھی یقیناً" یہی کروں گا۔"

سیم نے اپنے قدموں کی رفتار بڑھائی۔

"ہاتھ مضبوطی سے تھام لو اور ہم دیکھیں گے
پہاڑوں کے اس پار بتیوں کو نارنجی ہوتے ہوئے..."

اس کی آواز سنتے ہوئے وہ تیز قدموں سے پارک کا گیٹ عبور کر گیا۔

"اب میں دیکھ رہا ہوں آگ
پہاڑوں کے اندر
میں دیکھ رہا ہوں آگ
درختوں کو جلاتی ہوئی..."

فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے بالآخر سیم اس لڑکے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ لیکن جونہی اس کی نظر لڑکے کے چہرے سے ٹکرائی، وہ ایک پل کے لیے ساکت رہ گیا۔ وہ تیئس، چوبیس سال کا لڑکا اندھا تھا۔ سیم کی آمد سے بے خبر وہ اگلی لائن گا رہا تھا۔

"اور میں دیکھ رہا ہوں آگ
روحوں کو جلاتی ہوئی

میں دیکھ رہا ہوں آگ
ہوا میں پھیلتی ہوئی
اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے۔۔۔"
سیم کے دل کو عجیب سا احساس گھیرنے لگا۔ اس کی نظریں اس لڑکے کے چہرے کو بغور تک رہی تھیں۔
"میں دیکھ رہا ہوں آگ
ایک شہر کو جلاتے ہوئے
اور میں دیکھ رہا ہوں آگ
پہاڑوں کے اس پار نارنجی ہوتے ہوئے
اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے۔۔۔"
اس نے گانا ختم کیا تو سیم کے ہاتھ میکانکی انداز میں بج اٹھے۔ اچانک ملنے والی داد پہ وہ لڑکا پہلے چونکا اور پھر سنبھل کر مسکرا دیا۔
"شکریہ!"
"بہت اچھا گاتے ہو تم۔" سیم کی تعریف پہ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
"یہ میری جانب سے تمہارا انعام۔" سیم نے جیب میں سے سو ڈالر نکال کر نیچے کھلے کیس کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھمائے تو وہ نوٹ کا احساس پا کے مزید خوش ہو گیا۔
"بہت شکریہ سر! آپ بہت اچھے ہیں۔" اس کی سادہ سی تعریف پہ سیم مسکرا دیا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔
"ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مانو تو؟"
"ضرور سر!"
"یہ شاعری تمہاری اپنی ہے؟"
"بالکل سر۔"
"پھر ایک بات بتاؤ۔ تم تو اندھے ہو یار! پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم آگ کو دیکھ رہے ہو' درختوں کو جلاتے ہوئے' روحوں کو جلاتے ہوئے؟" سیم نے اس عجیب سے احساس کو لفظوں میں ڈھالا جو اسے 'اس لڑکے کے الفاظ اور اس کی معذوری دیکھ کر ہوا تھا۔
"میرا مطلب ہے نہ تو تم نے آگ کو دیکھا ہے اور نہ ہی تم یہ جانتے ہو کہ جلنا کس عمل کو کہتے ہیں' پھر تم

یہ مثالیں کیسے دے رہے ہو؟" اس کی بات پہ وہ لڑکا مسکرا دیا۔
"بے شک میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں سنا تو ہے نا سر۔"
"اور اگر بالفرض تم نے آگ کے بارے میں کبھی کچھ نہ سنا ہوتا تو؟"
"تو پھر جب کبھی میرا آگ سے واسطہ پڑتا اور وہ میرے جسم کے کسی حصے کو تکلیف پہنچاتی تو میرا شعور از خود مجھے خبردار کر دیتا کہ یہ چیز جو بھی ہے 'باعث آزار ہے۔ اور اگر مجھے دوبارہ اس درد' اس جلن سے بچنا ہے تو مجھے اس سے دور رہنا ہوگا۔" وہ رسان سے بولا تو سیم چونک گیا۔
"یعنی تمہارا برا تجربہ تمہارے شعور کی آنکھ کھولنے کا باعث بن جاتا؟"
"بالکل سر! جو باتیں عام آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں وہ شعور کی آنکھ دیکھ لیتی ہے اور جب یہ کسی چیز کا تجزیہ کرتی ہے تو پھر عام آنکھوں کی طرح کسی بھی پوائنٹ کو مس نہیں کرتی۔"
"یعنی اس کے تجزیہ میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔" سیم کھویا کھویا سا بولا تو لڑکا مسکرا دیا۔
"بالکل!" اس کی بات پہ سیم ایک پل کو خاموش ہو گیا۔ اس کے ذہن میں اپنی سوچیں' اپنے احساسات گردش کرنے لگے۔ بے اختیار اس کی نظریں پرسوچ انداز میں سامنے کھڑے لڑکے پہ آ ٹھہریں۔ جو شاید اس کی اس معاملے میں مدد کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کو کس پیرائے میں بیان کرے۔
"اچھا ایک مسئلہ ہے۔" اس نے گفتگو کا آغاز کیا اور تبھی ایک طریقہ اسے "فوراً" سے سوجھ گیا۔ کیوں نا وہ اس سارے معاملے کو اپنے کسی دوست سے منسوب کر کے کہہ سنائے؟ اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور اگلے ہی پل اس کی ساری جھجک دور ہو گئی۔
"مجھے اس میں تمہارا مشورہ درکار ہے۔ کیا میری مدد کرو گے؟" سیم نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔
"اس وقت؟"
"ہاں۔ میں تمہیں تمہارے ٹائم کے لیے پے کر دوں گا۔" سیم نے اپنی عادت کے مطابق آفر کی تو وہ لڑکا مسکرا دیا۔
"آپ کہیں سر! پیسے کی کوئی بات نہیں۔"
"ارے اس ہی کی تو ساری بات ہے۔" سیم اس غریب لڑکے کی بڑی بات پہ مسکرایا۔
"معذرت کے ساتھ سر! لیکن پھر آپ نے اپنا مسئلہ پیسے کے ساتھ مل کر کیوں نہیں حل کر لیا؟" اور اس کی بات پہ سیم لاجواب ہو کے اس کا منہ تکنے لگا۔
"آپ بولیں سر۔ میں سن رہا ہوں۔"
"کیوں نا ہم پارک میں بیٹھ کر بات کریں؟" سیم کی تجویز پہ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گلے میں لٹکا گٹار اتار کے وہ زمین پہ جھکا تو سیم بے اختیار ہی اس کی مدد کو نیچے بیٹھ گیا۔
"تمہارا نام کیا ہے؟" گٹار کیس میں بند کرتے ہوئے اس نے ایک نظر اس لڑکے کو دیکھا جو ایک طرف رکھی اپنی وائٹ چھڑی اٹھا کر کھول رہا تھا۔
"مائیکل۔" چھڑی کھول کے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ سیم کیس اسے پکڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر دونوں پارک کی طرف چلنے لگے۔
سفید چھڑی کی ٹک ٹک اور مائیکل کا بنا کسی چیز سے ٹکرائے بڑی سہولت سے آگے بڑھنا' سیم کو حیران کر رہا تھا۔ کسی نابینا شخص کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ اور یہ پہلا اتفاق ہی اس پہ اس تیسری آنکھ کی وضاحت کر گیا تھا' جس کی قوت بینائی اس اندھے کو راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پرکھنے کی طاقت عطا کر رہی تھی۔ یوں کہ وہ اندھا ہو کر بھی اندھا نہیں رہا تھا۔ اور وہ آنکھوں والا ہو کر بھی ٹھوکر کھا گیا تھا۔
پارک میں پہنچ کے سیم اسے لیے ایک بینچ پہ آ بیٹھا تھا۔
"جی سر! اب کہیں۔"

"ایسا ہے مائیکل کہ میرا ایک بہت قریبی دوست ہے۔" سیم نے کھنکھارتے ہوئے بات شروع کی۔

"اس کی زندگی اور شخصیت دونوں میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن پچھلے دنوں اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ جس کے بعد اس کا زندگی کو دیکھنے کا انداز ہی بدل گیا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے اس انداز فکر سے خود ہی گھبرانے لگا۔" مائیکل نے یک لخت ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"آپ اس تبدیلی کو واضح کریں گے؟"

"یعنی اسے اچانک سے ان چیزوں کا بھی احساس ہونے لگا۔ جن کے بارے میں اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ جیسے 'جیسے کہ موت۔" سیم بے اختیار اٹکا۔ وہ اتنے دنوں میں آج پہلی بار اپنے احساسات کو زبان دے رہا تھا۔ اور اسے بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یکایک موت سے خاص کر بے بسی 'بے کسی اور تنہائی کی موت سے خوف آنے لگا۔ اپنے فیصلے جن کے بارے میں اسے کبھی کوئی شبہ نہ رہا تھا ان میں اسے ڈھیروں خامیاں نظر آنے لگیں ۔۔۔ اپنے نظریات 'اپنی ترجیحات 'ہر چیز اسے غلط 'ایک دم بودی لگنے لگیں۔" وہ تھک کر خاموش ہوا تو مائیکل نے گہری سانس لی۔

"یعنی کہ اس کی کامیاب زندگی اچانک گھاٹے کے سودوں سے تعبیر ہونے لگی۔"

"ہاں ایسا ہی ہونے لگا۔" اس نے بوجھل لہجے میں تائید کی۔ مائیکل بے اختیار چونک گیا۔

"ایک بات بتائیں سر۔ یہ سوچیں آپ کے دوست کے لیے پریشان کن سہی۔ لیکن ان کے بارے میں اس کا دل کیا کہتا ہے؟"

"اس کا دل؟" سیم لحظہ بھر کو اٹکا اور پھر جی کڑا کر کے وہ اعتراف کر لیا جو وہ رات تک خود سے کرنے کو تیار نہ تھا۔ "اس کا دل جانتا ہے کہ یہ سوچیں غلط نہیں ہیں۔" اس کی بات پہ مائیکل مسکرا دیا۔

"تو پھر میرے نزدیک آپ کا دوست بہت خوش قسمت ہے سر۔"

"کیا؟" سیم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بالکل سر۔ یہ حادثہ فی الوقت اس کے لیے اذیت کا باعث سہی۔ لیکن یہ وہ برا تجربہ ہے۔ جس نے اسے اس کی غلطیوں کو دیکھنے والی آنکھ عطا کی ہے۔ اسے اس خواب غفلت سے جگایا ہے۔ جس سے اگر وہ نہ جاگتا تو شاید زندگی کی آخری سانس تک غلط راہ پہ چلتا رہتا۔ اپنی غلطیوں کو 'وقت رہتے ہوئے' سدھارنے کا یہ موقع قسمت کتنے لوگوں کو دیتی ہے سر؟" اس نے سوال اٹھایا تو بغور اس کی بات سنتا سیم ساکت ہو گیا۔ اس نہج پہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"ہم اندھوں کو جب ہمارا شعور کوئی سبق سکھاتا ہے سر 'تو ہم اس سبق کو گرہ سے باندھ لیتے ہیں، کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو دوبارہ ٹھوکر کھائیں گے ۔۔۔ ہم خواہشات کے پیچھے بھاگنا فوراً ہی نہیں کر سکتے سر 'ہمارے اندھیرے ہمیں اس بہادری کی اجازت نہیں دیتے اور آپ کی روشنی آپ لوگوں کو ڈرنے نہیں دیتی۔ اور یہی بہادری آپ کی غلطی ہوتی ہے کیونکہ خواہشات کو پانے کی طلب سب سے پہلے عقل کو مارتی ہے اور عقل کا اندھا آنکھ کے اندھے سے زیادہ بری ٹھوکر کھاتا ہے۔ آپ کا دوست غلط تھا اس لیے یہ ٹھوکر کھائی۔ لیکن اس ٹھوکر نے اس کی عقل کی بینائی لوٹا دی جو سب کو واپس نہیں دی جاتی۔ اس لیے وہ سچ میں ایک خوش قسمت انسان ہے۔ بس اسے چاہیے کہ اس سبق کو اب گرہ سے باندھ لے اور اپنی صحیح سمت کا تعین کر لے۔ کیونکہ قسمت اس کے ساتھ ہر بار اتنی ہی نرمی سے پیش آئے یہ ضروری نہیں ہے۔" اور دم سادھے بیٹھے سیم کے ارد گرد 'گزری رات کے اندھیرے میں دستک دینے والی آواز ایک بار پھر گونجنے لگی۔

ٹوٹتا ہے جب جام آرزو
تب در آگاہی کھلتا ہے۔

اور سیم بری طرح چونک گیا۔ "یہ اتنے مشکل الفاظ اسے حرف بہ حرف کیسے اور کہاں سے یاد آ گئے

تھے؟ یہ کہاں کی کوڑی کہاں آملی تھی؟" حیرت سے سوچتے ہوئے اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکی تھیں۔ تبھی ایک اور آواز اس کے آس پاس ابھری تھی۔ اس کی اپنی آواز۔

"مطلب؟"

"جس دن اپنی آرزوئیں ' اپنی خواہشات کے پیالے کو توڑ دو گے 'اس دن زندگی تم پر حقیقت کے دروازے کھول دے گی۔" اور وہ ناسمجھی کے عالم میں بولنے والے کا چہرہ تکتے گیا تھا۔

لیکن آج یہاں اس خالی پارک کے بینچ پہ ایک اندھے شخص کے برابر بیٹھے اسے اچانک ان مشکل جملوں کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کردی گئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے یہ پیالہ خود نہیں توڑا تھا بلکہ قسمت نے خود آگے بڑھ کے اس پیالے کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اس کے ہوش میں آنے کا سامان کردیا تھا۔ تو کیا سچ میں وہ ایک خوش قسمت انسان تھا؟ بے یقینی سے سوچتے ہوئے اس نے مائیکل کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں سر؟" وہ نرمی سے مسکرایا تو سیم کو پہلی بار اس کے چہرے پہ موجود سکون کا احساس ہوا۔ اتنی بڑی محرومی کے باوجود اتنا سکون! ان دونوں کا تل میل وہ بھی ایک ہی چہرے پہ سیم کے اندر بجھے عجیب سے احساسات جگا گیا تھا۔

"اپنی خوش قسمتی کا یقین کرنا چاہ رہا ہوں۔ یہ حساب لگانا چاہ رہا ہوں کہ میں نے اس کی کیا قیمت ادا کی ہے؟" وہ موت کے منہ سے واپس آیا تھا۔ تب کہیں جاکے آگہی نے اپنا در وا کیا تھا۔ اپنے ساتھ برتی جانے والی اس سختی پہ اس کا دل ملال سے بھر گیا تھا۔

اس کی بات پہ مائیکل نے اک گہری سانس لی۔ وہ شروع میں ہی جان گیا تھا کہ یہ اس کے کسی دوست کا نہیں بلکہ خود اس کا مسئلہ ہے۔

"قیمت؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ قدرت غلط کاموں کی تصحیح کن قیمتوں پر کرتی ہے؟" ہنا کچھ جتائے اس نے استفہائیہ انداز میں سوال کیا تو سیم کا سر خود بہ خود نفی میں ہل گیا۔

"نہیں۔"

"اگر آپ کی قسمت میں زندگی بھر کی کوئی معذوری نہیں لکھی گئی۔ آپ کے مال و دولت اور رتبے میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور آپ کے پیاروں کو آپ سے چھینا نہیں گیا تو یقین مانیں سر! آپ کو یہ خوش قسمتی قدرت نے یونہی دان کی ہے۔"

اور اس کی بات سنتا سیم ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"واقعی! اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی تاوان کے طور پہ بھرنی پڑجاتی تو؟" یکایک اسے خود کو ملنے والی تکلیف ایک ہلکا سا جھٹکا لگنے لگی اور ساتھ بیٹھا نوجوان ستر اسی سالہ درویش۔ بھلا اسے یہ آگاہی کہاں سے ملی تھی؟

"اتنی چھوٹی سی عمر میں تم اتنی گہری باتیں کیسے کر لیتے ہو مائیکل؟" وہ اپنی حیرت کو زبان دینے سے خود کو روک نہ پایا تھا۔ اس کے سوال پہ مائیکل ہنس پڑا۔

"شعور کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا سر۔" اور سیم اپنی جگہ پہ خجل سا ہو گیا۔

"صحیح کہہ رہے ہو۔ ورنہ اس وقت میں تمہارے برابر بیٹھا یہ سوال نہ پوچھ رہا ہوتا۔" اور اب کی بار مائیکل کا قہقہہ بے اختیار گونج اٹھا۔ اس کی ہنسی سیم کو بھی مسکرانے پہ مجبور کرگئی۔

"گھبرائیں سر! اور اگر کسی چیز کا حساب لگانا ہی ہے تو اس بات کا حساب لگائیں کہ اگر آپ نے یہ غلط فیصلے نہ کیے ہوتے تب آپ کیا کھوتے اور کیا پاتے۔ مجھے یقین ہے آپ کو بہت سی الجھنوں کے سرے مل جائیں گے۔" وہ نرمی سے بولا۔

"ہوں۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سیم نے اک گہری سانس لیتے ہوئے ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں مائیکل! جن میں 'میں تمہارا شکریہ ادا کرسکوں۔ میری اس تکلیف میں تم نے کس طرح سے میری مدد کی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"آپ کی یا آپ کے دوست کی سر؟" وہ شرارت سے بولا تو سیم لحظہ بھر کو ٹھٹکا اور جیسے ہی اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا' وہ شرمندگی سے سرخ چہرہ لیے ہنس پڑا۔

"میں تمہیں سچ میں کبھی نہیں بھولوں گا بروٹس۔" اس نے مائیکل کے بازو پہ دوستانہ انداز میں مکا مارا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

"میں بھی سر۔" اور زندگی میں پہلی بار سیم کی آنکھوں میں کسی کے لیے حقیقی ستائش آن ٹھہری تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح "قاضی ولا" میں اپنے ساتھ بوجھل سی خاموشی لے کر طلوع ہوئی تھی۔ گزری رات بہت سے لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ ایسے میں اگلے دن نہ تو گھر میں علی الصبح کی چہل پہل تھی اور نہ ہی ناشتے کی میز پر معمول کی رونق۔ ہر کوئی خاموشی سے اپنی اپنی پلیٹ پہ جھکا ناشتے میں مصروف تھا۔

"حنان نہیں اٹھا؟" صغیر صاحب نے ملازم کے ہاتھ سے اخبار لیتے ہوئے سوال کیا۔

"حنان صاحب تو صبح ہی چلے گئے تھے صاحب جی۔"

"کہاں گیا ہے؟" صغیر صاحب کے ساتھ باقی سب نے بھی چونک کر ملازم کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں جی۔" اس کی لاعلمی پہ صغیر صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"یہ لڑکا بھی نا۔۔۔ جاؤ فون لے کر آؤ۔" ان کی ہدایت پہ ملازم اگلے ہی لمحے کارڈلیس لے آیا۔

فون ہاتھ میں لے کر انہوں نے حنان کا نمبر ملایا۔ لیکن متواتر بیل کے باوجود جب دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی تو انہیں غصہ آگیا۔

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔" فون میز پہ پٹختے ہوئے انہوں نے زیب بیگم کی طرف دیکھا۔

"آپ فکر مت کریں۔ مصروف ہو گا کہیں۔"

"ہاں سارا ملک یہی تو چلا رہا ہے۔" خفگی سے بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے چائے کا کپ اپنی جانب سرکایا۔ ان کے چہرے کا غیر معمولی تناؤ ان کی ذہنی کیفیت کا ترجمان تھا' جسے جائشہ اور نویرہ نے باآسانی محسوس کر لیا تھا۔ مگر کچھ کہنے کی ہمت دونوں میں نہ تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کے وہ تیار ہو کر آفس چلے آئے تھے۔ اپنی پی اے سے دن بھر کا شیڈول سنتے ہوئے بھی ان کا دھیان مسلسل ابراہیم صاحب کی طرف تھا۔ ایسے میں حنان اندر داخل ہوا تو ان کا سارا غصہ اس کی جانب منتقل ہو گیا۔

"کہاں تھے تم؟" پی اے کے کمرے سے نکلتے ہی انہوں نے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا جو بوجھل قدموں سے چلتا ان کے مقابل آبیٹھا تھا۔

"سائٹ پر تھا۔"

"اتنی صبح وہاں کیا کرنے گئے تھے؟" ان کے سوال پر حنان کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یونہی۔" وہ آہستگی سے بولا تو صغیر صاحب چونک گئے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے قدرے نرمی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" پیپر ویٹ گھماتے ہوئے اس نے نظریں چرائیں۔

"حنان! مجھے مزید پریشان مت کرو۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کچھ نہیں ہوا۔" جھنجلا کر اس نے پیپر ویٹ کو چھوڑ کے ان کی طرف دیکھا۔

"حنان!" ان کے غصے سے ڈپٹنے پر اس نے ایک گہری سانس لی۔

"میں مہر کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ۔" ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے گویا صغیر صاحب کے اعصاب پہ بم گرا دیا تھا۔

"کیا؟" انہوں نے بے یقینی سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

"میں' میں مہر سے محبت کرنے لگا ہوں ڈیڈ۔" جھجکتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی۔ تو صغیر

صاحب کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" ان کی خشمگیں نظروں کے جواب میں وہ محض شانے اچکا کر رہ گیا۔

"حد ہوتی ہے۔۔۔ کتنی آسانی سے تم نے اتنی بڑی کہہ دی۔ تمہیں معلوم بھی ہے کہ اس فضول گوئی کا کتنا برا نتیجہ نکل سکتا ہے؟" اس کی خود غرضی انہیں مشتعل کر گئی تھی۔

"کوئی برا نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اگر آپ اس بات کو اپنی خواہش کہہ کے سب کے سامنے رکھیں گے۔" حسان نے اپنے ارادے سے انہیں آگاہ کیا تو صغیر صاحب بری طرح بدک گئے۔

"ہاں میرا دماغ خراب ہے نا۔ جو میں یہ بات کہہ کر اگلوں کو اپنی نیت پر شک کرنے پہ مجبور کر دوں۔ وہ تو یہی کہیں گے نا۔۔۔" اچانک ان کا موبائل بجنے لگا تو ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسکرین پہ گھر کا نمبر دیکھ کے انہوں نے فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو!" لیکن دوسری طرف زیب بیگم کی بھرائی ہوئی آواز سن کے وہ پریشان ہو گئے۔

"سب ٹھیک تو ہے زیبی؟" ان کی بات پہ حسان نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

"کیا!" دوسری طرف سے تفصیل سن کر ان کے منہ سے فقط یہی نکل پایا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم دونوں ڈرائیور کے ساتھ نکلو۔ میں سیدھا ہاسپٹل آتا ہوں۔ کون سے ہاسپٹل میں ہے؟" اور حسان پریشانی سے سیدھا ہو بیٹھا۔

"میں پہنچتا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔" انہیں تسلی دیتے ہوئے انہوں نے عجلت میں فون بند کیا۔

"مہر بخار کی حالت میں سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہو گئی ہے۔ اسے ہسپتال لے گئے ہیں کیونکہ اسے ہوش نہیں آ رہا۔" جلدی جلدی ٹیبل کی دراز لاک کرتے ہوئے انہوں نے پوری تفصیل حسان کے گوش گزار کی تو وہ بھی گھبرا گیا۔

"او گاڈ۔ کہاں لے کر گئے ہیں اسے؟" جواباً صغیر صاحب نے شہر کے مشہور ہسپتال کا نام لیا تو وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی آپ کی ساتھ چل رہا ہوں۔" اس نے جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں۔ صغیر صاحب اثبات میں سرہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل دیے۔

وہ دونوں ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچے تو زیب اور جائشہ پہنچ چکی تھیں۔ سب کو کوریڈور میں دیکھ کر وہ تیز قدموں سے ان کی جانب چلے آئے۔ انہیں دیکھ کر ابراہیم صاحب اور روتی ہوئی زیب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"مہر کو ہوش آیا؟" قریب پہنچتے ہی صغیر صاحب نے پریشانی سے سوال کیا تو متفکر سے ابراہیم ملک کا سر نفی میں ہل گیا۔

"ابھی نہیں ڈاکٹرز ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اچھا ہے۔ نہ ہی ہوش میں آئے تو اچھا ہے۔" کرسی پہ بیٹھی انجم اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولیں۔ سب نے بے اختیار پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ آپ دونوں نے میری بچی کو اس حال تک پہنچانے والے صرف اور صرف آپ دونوں ہیں۔" ابراہیم صاحب اور صغیر قاضی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ غصے سے سرخ چہرہ لیے بولیں تو دونوں نے نظریں چرا لیں۔ جبکہ زیب بیگم کے آنسوؤں میں شدت آ گئی۔

"اب کیوں نظریں چرا رہے ہیں آپ لوگ، کہیں نا ڈاکٹرز سے کہ لگائیں اسے زہر کے انجکشن، تاکہ گلو خلاصی ہو ہم سب کی۔" ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ ان کے مقابل آ کھڑی ہوئیں۔

"انجم پلیز۔۔۔" ابراہیم صاحب نے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا، لیکن وہ بے اختیار پیچھے ہٹیں۔

"مت چپ کروائیں مجھے ابراہیم۔ مت چپ کروائیں۔" ان کی آنکھیں پھر سے برسنے لگیں۔ "آپ کو کیا پتا وہ بچی دن رات کس عذاب سے گزر رہی ہے۔ وہ کتنی تکلیف میں ہے آپ کو کیا خبر!"

"کیوں نہیں۔ سب جانتا ہوں میں تب ہی تو۔۔۔"

"کچھ نہیں جانتے۔ یہی تو افسوس ہے کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔" انہوں نے ایک سلگتی نظر حنان پہ ڈالی۔ تو اس کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ لیکن چونکہ وہ اس وقت کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اسی لیے خاموش کھڑا ضبط کرتا رہا۔

"بس میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔۔۔ آج کے بعد مہر کی زندگی کا ہر فیصلہ وہ خود لے گی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس سے کسی بھی معاملے میں زور زبردستی نہیں کرے گا۔"

وہ دوٹوک لہجے میں بولیں تو ابراہیم صاحب سمیت سبھی خاموش ہو گئے۔ لیکن حنان کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ اس نے ایک کھا جانے والی نظر انجم بیگم پہ ڈالی اور لب بھینچے تیز قدموں سے کوریڈور کے دوسری جانب آکھڑا ہوا۔

"یہ لڑکی۔۔۔!" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اندر جا کے سچ میں مہر کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالے۔

☼ ☼ ☼

دونوں بازو سر کے نیچے رکھے وہ بیڈ پہ چت لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اسے گھر آئے گھنٹہ ڈیڑھ ہونے کو تھا مگر اس کا ذہن تا حال پارک میں 'اپنی اور مائیکل کی ہونے والی گفتگو میں پھنسا ہوا تھا۔

اس کے پچھلے کئی دنوں کا ذہنی تناؤ ہوا میں دھواں بن کے غائب ہو گیا تھا۔ اپنی خوش بختی کا احساس اسے اندر سے مضبوط کر گیا تھا۔ اب اسے اپنی سوچ میں آنے والی تبدیلی سے نہ تو گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی انجانا سا خوف۔ بلکہ اپنی اور مائیکل کی گفتگو کو دہراتے ہوئے وہ ماضی کی کتنی ہی باتوں کو بلا جھجک سوچے گیا تھا۔ نکتے سے نکتہ نکلتا گیا تھا۔ اور سوچ کے وہ کھاتے جنہیں مائیکل نے کھولنے کا مشورہ دیا تھا از خود کھلتے چلے گئے تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ آج جس مقام پہ وہ بالکل اکیلا کھڑا تھا وہ وہاں ہر گز نہ ہوتا اگر جو وہ اپنے ماں باپ کے خلاف جا کے سوزی سے شادی نہ کرتا۔ سوزی کے عشق میں اس نے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ اپنے ماں باپ سے لاتعلقی اختیار کی تھی۔ اپنی ایک الگ ریاست قائم کی تھی جس کا وہ تنہا وارث و مختار تھا۔ لیکن کیا یہ سب اس نے سچ میں صرف سوزی کی خاطر کیا تھا؟ کیا سوزی حقیقت میں اسے اتنی ہی پیاری تھی؟ بیٹھے بیٹھے اس کے دل نے سوال کیا تو سیم نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

نہیں۔ اس نے یہ سب اپنے لیے اور اپنی محبت میں کیا تھا۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا، جو اپنا پہلا عشق آپ ہوا کرتے ہیں۔ ان کے لیے اہم ہوتی ہیں تو ان کی خواہشات اور ان کی ترجیحات۔ جن کی اگر نفی کی جائے تو وہ خود سری اور سرد مہری کی انتہاؤں کو پہنچ جاتے ہیں اور ان انتہاؤں پہ انہیں اپنے سوا کوئی یاد نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ سوزی تو بس ایک بہانہ بنی تھی۔ ورنہ اصل جنگ تو اس کی انا کی تھی، جسے اس کے باپ نے چیلنج کرنے کی غلطی کر دی تھی۔ نتیجے میں وہ ہر رشتے کی تمیز بھول گیا تھا۔ وہ بنا سوچے، بنا پرکھے ہر چیز کو برباد کرنے پہ تل گیا تھا۔ صرف اور صرف برباد اور ایسا کرتے ہوئے اسے کتنا سکون، کتنا مزہ آیا تھا۔۔۔ یہ سوچ کر اسے اب شرمندگی ہو رہی تھی۔ بے حد شرمندگی کیا وہ دو انسان جو اس کے ماں باپ تھے اور جنہوں نے اپنی پوری زندگی ۔۔۔ سوائے اس کے گرد چکرانے کے اور کچھ نہ کیا تھا اتنے برے سلوک کے مستحق تھے؟ دل نے دوسرا سوال اٹھایا تو سیم نے مارے اذیت کے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

اور تبھی اس کی بند آنکھوں کے پیچھے اس کا خواب ایک جھماکے سے روشن ہو گیا۔

بھوک، کتے، بھاگتے قدم، مدد کو کھلتا دروازہ، اس کے قدموں کا دہلیز کو چھونا اور اس کا اس مدد کو ٹھکرا دینے کا غلط فیصلہ۔۔۔ یعنی وہ دروازہ۔ وہ پناہ گاہ۔۔۔ آن واحد میں

پزل کا گمشدہ حصہ اپنی جگہ پہ آکے بیٹھا تو سیم کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئیں۔

اس کا مطلب ہے کہ اگر وہ اس دروازے سے اندر داخل ہو جاتا تو خواب اور حقیقت دونوں میں ہر مصیبت سے امان پا جاتا۔ لیکن وہ اس دروازے کو کھلا چھوڑ کے واپس لوٹ آیا تھا۔ بھوکے کتوں کے درمیان، بڑھتے اندھیروں کے درمیان اور بالآخر کچرے کا ڈھیر اس کا مقدر بنا تھا۔ خواب میں بھی اور حقیقت میں بھی۔ یعنی وقت نے اسے اور اس کے فیصلے کو غلط ثابت کر دیا تھا اور اب غور طلب بات یہ تھی کہ اگر وہ غلط تھا تو اس جنگ میں صحیح کون ثابت ہوا تھا؟ اس کے دل نے تیسرا اور اہم ترین سوال اٹھایا تو سیم کو اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"او خدا نہیں! کم از کم یہ نہیں۔" کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے اس جیسا خود پرست شاید اپنے ہوش میں پہلی بار اوپر والے کے سامنے گڑگڑایا تھا۔ لیکن قبولیت کی گھڑی گزر چکی تھی۔ پزل مکمل ہو گیا تھا اور تصویر بند پلکوں کے پیچھے بھی واضح تھی.... اس کی سب سے بڑی غلطی کی تصویر۔ واضح اور شفاف اس کے سامنے رکھ دی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

قریباً" ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹرز مہر کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ اس کی ذہنی حالات انہیں خاصی الجھی ہوئی لگی تھی۔ اس لیے انہوں نے اسے نیند کا انجکشن لگا کے سلا دیا تھا۔ ویسے بھی سیڑھیوں سے گرنے سے اسے اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں، سو ڈاکٹرز نے اسے ایک دن مزید اسپتال میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس کے ہوش میں آنے پر حنان کے سوا سبھی نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ اس اطلاع کے بعد حنان وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس کے لیے مزید وہاں رکنا مشکل ہو گیا تھا۔ سوئی ہوئی مہر کے چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پہ لگی چوٹوں کے نشان اور نیل دیکھ کے بھی کا

ملال بڑھ گیا تھا۔ خاص کر صغیر صاحب کا۔ جو اس سارے حادثے کا ذمہ دار خود کو سمجھتے ہوئے بے حد دلگرفتہ ہو گئے تھے۔ زیب، انجم اور ابراہیم صاحب وہ ان تینوں کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ ان کے احساسات سے زیب باخوبی واقف تھیں۔

وہ ان کے شوہر تھے اور وہ ان کے مزاج کے ہر رنگ سے واقف تھیں۔ اس وقت کون سی بات ان کے دل کو لگی تھی، زیب اچھی طرح جانتی تھیں۔ لیکن اس بار وہ چاہ کر بھی ان کا بوجھ نہیں بانٹنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے اندر اپنے فیصلے کی سنگینی اور بدصورتی کا جو احساس جاگا ہے وہ قائم رہے، تاکہ دوبارہ ان سب کی زندگیاں حنان کے ہاتھوں کھلونا بننے سے محفوظ رہیں۔

☆ ☆ ☆

مارک نے تیسری بار اپنا سیل نمبر ملایا تھا۔ لیکن اس بار بھی مسلسل جاتی بیل کے باوجود جب دوسری طرف سے سیم نے فون نہیں اٹھایا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا ریسیور پریشانی سے کریڈل پہ پٹخ دیا۔

"کیا مصیبت ہے۔" غصے سے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اس نے اپنی سیکریٹری کو بلایا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں جینی۔ تم پلیز بعد میں مینج کر لینا۔" وہ اپنی جگہ سے عجلت میں اٹھا اور پھر اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

سیم کے گھر کی طرف گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ خاصا جھنجلایا ہوا تھا۔ یہ ساری سچویشن دن بہ دن اس کے لیے مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ جہاں ایک پل کو اسے لگتا کہ سیم کی طبیعت سنبھل گئی ہے، وہیں اگلے لمحے کوئی نہ کوئی بات اسے اپنی رائے بدلنے پہ مجبور کر دیتی۔ اب بھی اسے رہ رہ کر سیم کے حوالے سے مختلف واہمے پریشان کر رہے تھے۔ ایسی ہی الجھی ہوئی سوچوں میں گھرا وہ بالآخر منزل پہ آپہنچا تھا۔

سیم کے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے گھنٹی

بجانے کے بجائے جیب سے چابی نکالی تھی اور دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا تھا۔

"سیم!" پریشانی سے اسے پکارتے ہوئے اس نے ایک نظر خالی لاؤنج پہ ڈالی تھی۔ سرعت سے آگے آتے ہوئے اس کی نظر سامنے موجود میز پہ پڑے اپنے سیل فون سے ٹکرائی تھی۔ اور اسے تھوڑا حوصلہ ہوا تھا۔ شاید وہ اندر ہی کہیں تھا۔

وہ تیز قدموں سے سیم کے بیڈ روم کی طرف بڑھا تھا۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا سیم کو کاؤچ پہ بیٹھا دیکھ کے اس کے دل نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا۔ وہ نجانے کس دھیان میں گم بیٹھا تھا۔

"حد ہوتی ہے لاپروائی کی سیم۔ میں کب سے تمہیں..." بولتے ہوئے وہ اس کے سامنے آیا۔ لیکن جونہی اس کی نظر اس کے چہرے پہ پڑی وہ اپنا جملہ پورا کرنا بھول گیا۔

اس کے چہرے اور آنکھوں کی سرخی اس کے رونے کی گواہ تھی۔

"کیا ہوا سیم، تم ٹھیک تو ہو؟" وہ تیزی سے اس کے نزدیک آیا تو اسے سیم کے سامنے کھلے لیپ ٹاپ کا احساس ہوا۔ جو کہ بالکل نیا تھا۔

"یہ کہاں سے آیا؟" وہ چونکا۔ سیم کا اپنا لیپ ٹاپ تو دیگر چیزوں کے ساتھ چوری ہو گیا تھا۔ تو کیا وہ بازار گیا تھا؟

"میں خرید کر لایا ہوں۔" وہ بھاری آواز میں بولا تو مارک پریشان ہو گیا۔

"تم اکیلے بازار کیوں گئے سیم؟"

"فار گاڈ سیک میکی مجھے بیماروں کی طرح ٹریٹ کرنا بند کرو۔" سرعت سے ٹانگیں سمیٹتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ اٹھا کر کاؤچ پہ رکھا۔

"اوکے نہیں کرتا۔" مارک نے اک گہری سانس لی۔ "لیکن مجھے بتاؤ۔ کیا پہلے تم اس طرح بیٹھ کر روئے ہو کبھی؟"

"پہلے زندگی نے میرے منہ پہ حقیقت کا طمانچہ بھی تو نہیں مارا تھا۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا مارک کا ضبط جواب دے گیا۔

"سنو۔ خود سنو۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا یہ نارمل گفتگو ہے؟" اس کے سوال پہ سیم لحظہ بھر کو تھم سا گیا۔

"وہ عورت صرف میرا پیسہ اور میری قیمتی چیزیں چرا کر نہیں بھاگی، بلکہ وہ مجھ پہ میری اوقات اور میری عقل کی حقیقت واضح کر کے بھاگی ہے۔ اس کے جوتے کی نوک نے جب مجھے یہاں۔" سیم نے اپنی پسلیوں کو چھوا۔ "یہاں ضرب لگائی تھی نا تو درد سے زیادہ ذلت کے احساس نے میرے روم روم کو بھگو دیا تھا۔ آنسو، خوف اور درد کا ملا جلا ذائقہ کیا ہوتا ہے یہ اس رات میں نے جانا تھا اور بے بسی کیسی بساند بھری کیفیت کا نام ہے، اس کا احساس مجھے اس کچرے کے ڈھیر پر گر کر ہوا تھا... اور تم کہتے ہو کہ میں پہلے کی طرح نہیں رہا؟"

شدت جذبات سے سیم کی آواز گھٹ سی گئی تھی اور مارک وہ تو جیسے پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

"ہسپتال کے بستر پہ، گھر کی تنہائی میں، سوتے جاگتے ہر لحہ، ہر پل میں نے اپنی سو کالڈ کامیاب زندگی میں کامیابی کو پاگلوں کی طرح تلاش کیا ہے۔ اپنا احتساب کیا ہے اور نتیجہ پتا ہے کیا نکلا؛ ٹوٹل فیلیئر (بالکل ناکام) کمپلیٹ لاسٹ۔ (مکمل نقصان)" اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "میں زندگی میں اپنی آرزوؤں کے پیالے کو بھرنے میں، اتنا مگن، اتنا گم رہا کہ جب یہ پیالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹا تو سوائے تنہائی اور تہی دامنی کے میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ میں نے اپنا ہر قیمتی اثاثہ ان بے معنی خواہشات کی نذر کر دیا... دیکھو تم خود دیکھو۔" اس نے کاؤچ پہ رکھا لیپ ٹاپ اٹھا کے مارک کی نظروں کے سامنے کیا۔ تو اس کی ساکت پتلیوں میں جنبش سی ہوئی اور وہ اسکرین پہ جا ٹھہریں۔ ایک سیکنڈ۔ دو سیکنڈ۔ تیسرے سیکنڈ اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل سی گئیں۔

"یہ، یہ تو..." پہچان کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ وہ

اسکرین پہ موجود چہرے کو دیکھتا حیران رہ گیا تھا۔ حیران اس بات پر نہیں کہ یہ چہرہ اچانک کیسے سامنے آگیا تھا۔ بلکہ اس بات پر کہ وہ چہرہ سیم کے لیپ ٹاپ پہ کیا کر رہا تھا۔

"اور یہ' یہ دیکھو۔" مارک کی بات کا جواب دیے بنا اس نے اسکرین پر تصویر کے برابر انگلی رکھی تو مارک کی نگاہیں میکانکی انداز میں مطلوبہ نقطے پہ جا ٹھہریں اور پھر ساکت ہو گئیں۔

"اب پتا چلا میں آج کیوں بیٹھ کر رو رہا ہوں؟" اس نے دلگرفتی سے پوچھا تو مارک کی خاموش نظریں اسکرین سے ہٹ کر سیم کے چہرے پر آ ٹھہریں۔ اس کا رونا اور اس کی باتیں کچھ بھی اسے اب پہلے کی طرح عجیب اور بے معنی نہیں لگ رہا تھا۔

"میری غلطیوں نے بالآخر مجھے غلاظت کے ڈھیر پہ تنہا لا پھینکا مارک۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں یہ غلط فیصلے نہ لیتا تو بدلے میں کیا پاتا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ حتمی لہجے میں بولتے ہوئے اسے حیران کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب مہر نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ اسے بیدار ہوتا دیکھ کر تسبیح کرتی انجم بیگم کا ہاتھ لحظہ بھر کو ساکت ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے انہوں نے خوشی سے بھرپور آواز میں بہن کو پکارا تھا۔

"زیب! مہر اٹھ گئی ہے۔" اور زیب بیگم کا مرجھایا ہوا چہرہ یک لخت کھل اٹھا تھا۔ دونوں بے چینی سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھی تھیں۔ جو چہرے اور آنکھوں میں الجھن لیے ناسمجھی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"مہو... میری جان۔" انجم نے بے اختیار ہو کے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

"مما جان میں کہاں ہوں؟" اس نے انجم بیگم کا چہرہ تکتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہاری طبیعت تھوڑی خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے تمہیں اسپتال لے کر آنا پڑا۔" محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے نرمی سے جواب دیا تو مہر کی نظریں ان سے ہوتی ہوئی زیب بیگم کے چہرے پر جا ٹھہریں جو آنکھوں میں آنسو لیے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ دفعتاً" کمرے کا دروازہ کھول کے ابراہیم صاحب اندر داخل ہوئے تھے اور ان دونوں کو مہر کے سرہانے کھڑا دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے مہر کی؟" تیزی سے آگے آتے ہوئے انہوں نے سوال کیا لیکن جونہی ان کی نظریں اس کے چہرے سے ٹکرائیں وہ خوشی سے کھل اٹھے۔

"ارے میری بیٹی اٹھ گئی۔" ان کے بے قراری سے آگے بڑھنے پر مہر کی نگاہیں ان کی جانب اٹھی تھیں اور پھر وہیں ساکت ہو گئی تھیں۔

ابراہیم صاحب کا شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پہ آ ٹھہرا تھا اور ایک جھماکے کے ساتھ اس کی خود فراموشی کی کیفیت میں ان کے تند و تیز لہجے کی یاد نے دراڑ سی ڈال دی تھی۔ اس کے دل میں ایک انی سی چبھی تھی۔ اور گزشتہ رات کی ساری اذیت اس کے وجود میں پھر سے آسمائی تھی۔ اس کے چہرے کی بدلتی رنگت نے انجم اور زیب کے ساتھ ساتھ ابراہیم صاحب کو بھی چونکا دیا تھا۔

"کیا ہوا میری جان۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" انہوں نے نرمی سے اس کا گال چھوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو در آئے۔

"کیوں؟ کیوں لائے آپ لوگ مجھے یہاں' کیوں مجھے مرنے نہیں دیا... کیوں؟" ایک جھٹکے سے ان کی جانب سے رخ پھیرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو ابراہیم ملک کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ جبکہ دونوں خواتین کے آنسو بے اختیاری کے عالم میں بہہ نکلے۔

"نہ میری بچی نہ' اللہ تمہیں ہماری زندگی بھی لگا دے... تمہاری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہو گا... سنا تم نے کچھ بھی نہیں ہو گا۔" جھک کر اسے خود

میں سموتے ہوئے انجم بیگم نے تڑپ کر اسے تسلی دی تھی۔ ان کی ممتا بھری آغوش کا احساس پا کے مہر کے آنسو مزید شدت سے بہہ نکلے تھے۔

اسے یوں درد سے نڈھال ’تڑپتا‘ بلکتا دیکھ کر ابراہیم صاحب کے لیے مزید وہاں رکنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ سرعت سے پلٹے تھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ مہر کی خفگی اور تکلیف نے ان کا دل جیسے مسل ڈالا تھا۔ وہ راہداری میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر آ کے گر سے گئے تھے۔

یکایک ان کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اور حلق میں آنسوؤں کا گولا سا آن پھنسا تھا۔ یہ ایک باپ کی بے بسی کی انتہا تھی‘ جسے دنیا کے سامنے آشکار ہو جانے سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنی مٹھی سختی سے لبوں پر جما دی تھی۔ نتیجتاً ”لبوں کی لرزش چھپ گئی تھی‘ بھرم قائم رہ گیا تھا۔ لیکن سینے پر بڑھتے ہوئے بوجھ کے احساس کو خاموشی سے جھیلنا انہیں ضبط کی کڑی منزل پر لے گیا تھا۔ انہوں نے تو صرف مہر کا بھلا چاہا تھا‘ لیکن بہتری کی چاہ میں وہ اسے بری طرح چوٹ پہنچا گئے تھے۔ انہیں رہ رہ کر اپنے رویے کی تلخی کا احساس ستا رہا تھا۔ مگر اس کے علاوہ ان کے پاس دوسرا کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کے بربادی اور بے آبادی کی طرف بڑھتا بھی تو نہ دیکھ سکتے تھے۔

کاش کہ ان کے بس میں ہوتا تو وہ ماضی میں رونما ہونے والے چند بد صورت واقعات کو کسی حرف غلط کی طرح مٹا دیتے اور اپنے حال کا رخ ہی بدل ڈالتے۔ مگر قسمت کے آگے بھلا کسی کی چلی ہے جو ان کی چل پاتی۔ اپنے ہاتھوں اپنے اور اپنی اولاد کے نصیب میں کون تکلیفیں رقم کرنا چاہتا ہے؟

بے شک حال کی جھولی میں ملال کے بہت سے لمحے ہوتے ہیں۔ بہت سے کاش بہت سے اگر مگر ہوتے ہیں‘ لیکن بہرکیف ہونا وہی ہوتا ہے جو اللہ نے لکھ رکھا ہوتا ہے۔ سو یہاں بھی وہی ہوا تھا جو پہلے سے طے شدہ تھا اور جسے کاتب تقدیر نے انہی حادثات کے ساتھ ان کی قسمتوں میں رقم کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مشینوں میں جکڑے وجود کے گرد ڈاکٹرز ‘ اور نرسیں گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ لیکن بستر پہ دراز عورت کی رنگت پل پل بدلتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹرز مایوس ہو کے خود ہی اس کے پاس سے ہٹ گئے تھے۔ انہیں اپنی جگہ چھوڑتا دیکھ کے شیشے کے پار آنسو بہاتی زیب نے پریشانی سے پاس کھڑے شوہر کا بازو تھام لیا تھا۔ جن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

ڈاکٹرز دروازہ کھول کے باہر چلے آئے تھے۔ انہیں دیکھ کے زیب کو اپنی سانس پل بھر کے لیے رکتی محسوس ہوئی تھی۔

”معذرت کے ساتھ صغیر صاحب! لیکن پیشنٹ کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ آپ لوگ ان سے مل لیں۔“ سینئر ڈاکٹر نے تاسف بھرے انداز میں کہتے ہوئے صغیر قاضی کا شانہ تھپتھپایا تھا اور زیب کا ہاتھ اپنے نیم والبوں پہ آن ٹھہرا تھا۔

☆ ☆ ☆

”قاضی ولا“ بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن کے درمیان وہ چپ چاپ بیٹھی تعزیت وصول کر رہی تھیں۔ وہ ہی رسمی جملے ‘ وہی صبر اور حوصلے کی تلقین ‘ وہ ہر آ کر بیٹھنے والے کی باتوں اور سوالوں کا جواب بظاہر بڑے حوصلے سے دے رہی تھیں۔ لیکن اندر ہی اندر ان کا دل اس لمحے کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ جب کل وہ لوگ ہسپتال سے جنازہ لے کر گھر آئے تھے اور اس سے ان کا پہلا سامنا ہوا تھا۔ وہ سامنا جس کے ہونے سے وہ سب سے زیادہ وحشت زدہ تھیں۔ ایک ایسے گیارہ سالہ بچے کا سامنا‘ جو اپنی بیمار ماں کی ہسپتال سے واپسی کا شدت سے منتظر تھا۔ لیکن جسے ایمبولینس سے نکلنے والے کفن میں لپٹے لاشے نے سارے بے یقینی کے گنگ کر دیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں منجمد حیرت اور خوف نے زیب کا دل نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی تھیں تاکہ اسے اپنے سینے سے لگا سکیں۔ لیکن وہ اس وقت ساکت ہو گئی تھیں۔ جب اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"آپ نے مجھ سے پرامس کیا تھا ناکہ آپ میری مما کو صحیح سلامت واپس لائیں گی؟" تنفر سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بولا تو زیب کے اردگرد موجود کتنی ہی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ جبکہ زیب کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ انہوں نے بے اختیار ہاتھ دوبارہ آگے بڑھا کر اسے تھامنا چاہا لیکن۔۔۔

"چھوڑیں مجھے!" اس کے چلا کر پیچھے ہٹنے پر زیب کا خالی ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔ وہ ایک ٹک اس کی آنکھوں سے برستے نفرت کے شعلے دیکھ رہی تھیں۔ "مجھے پتا تھا آپ بہت بری ہیں۔ پھر بھی میں نے آپ سے پرامس لیا تھا۔۔۔ مجھے لگتا تھا کہ آپ میری مما سے پیار کرتی ہیں۔ اس لیے اپنا پرامس ضرور پورا کریں گی۔ لیکن آپ نے مجھ سے اپنا پہلا ہی پرامس توڑ دیا۔ میں آپ سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ چلی جائیں آپ یہاں سے چلی جائیں!"

وہ آگے بڑھ کے ان کی ٹانگوں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے لگا تھا۔ اس کا یہ اظہار نفرت زیب کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر گیا تھا۔ آنسو ان کی آنکھوں سے بے اختیاری کے عالم میں بہنے لگے تھے۔

"نہ میری جان نہ۔ ایسے نہیں کرتے بیٹا۔" کتنے ہی ہاتھ اس چھوٹے سے بچے کی طرف بڑھے تھے۔

"چھوڑو مجھے۔ میں نے مما کے پاس جانا ہے۔ مما! مما!" بری طرح مچلتے ہوئے وہ دھاڑیں مار مار کے رو پڑا تھا۔ تو فنیکہ دو مضبوط اور شفیق بازوؤں نے اس کے بلکتے وجود کو متاع حیات کی طرح خود میں سمیٹ لیا تھا۔ انہوں نے پھر اسے کیسے سنبھالا تھا زیب نہیں جانتی تھیں۔ لیکن کل سے وہ منظر ان کے اندر جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ ان ننھے ہاتھوں کی نفرت بھری طاقت نے ان کے وجود کی ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔ وہ اپنی عزیز دوست سے کیا ہوا وعدہ کیسے ایفاء کرنے والی تھیں۔ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"کیا بات ہے؟ اتنی گم صم سی کیوں ہو؟" رات گئے جب وہ گھر، مہمانوں اور بچوں کی مصروفیت سے فارغ ہو کے کمرے میں آئی تھیں تو ان کے دل گرفتہ چہرے اور مسلسل خاموش لبوں نے صغیر صاحب کو سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں سنی کو کیسے سنبھالوں گی صغیر؟" وہ روہانسی سی ان کی طرف پلٹی تھیں۔ "وہ تو مجھ سے پہلے ہی اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا اور اب تو وہ میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا۔" بے بسی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے زیب کے آنسو ان کے چہرے پہ پھسل آئے تھے۔

"حوصلہ کرو زیبی۔" صغیر قاضی نرمی سے کہتے ان کے پاس آ بیٹھے تھے۔ ان کی جذباتی حالت ان کی اندرونی کشمکش کی غماز تھی۔ صغیر صاحب کا ہاتھ تسلی آمیز انداز میں ان کے شانے پر آ ٹھہرا تھا۔ "وہ بچہ ہے زیب، اس کا روٹھنا، بہلنا اور منانا کوئی مشکل بات نہیں۔"

"آپ نہیں جانتے صغیر! وہ سمجھ داری کی عمر میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کی اپنی پسند ناپسند ہے۔ کہا تھا یاسمین سے کہ بچوں سے کچھ نہ چھپائے مگر۔۔۔ وہ اپنی چیزوں، اپنے رشتوں کو لے کر عام بچوں سے زیادہ پوزیسو ہے۔ اپنی ماں کی جگہ کسی اور کو وہ کبھی بھی اتنی آسانی سے نہیں دے گا اور پھر اس کا مزاج۔ وہ کتنا ضدی اور من مانی کرنے والا بچہ ہے۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔"

وہ ان کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے بولیں تو صغیر صاحب نے اک بوجھل سانس لی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ سنی عام بچوں سے زیادہ اڑیل فطرت رکھتا تھا۔ اس کی ماں کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بے حد بگاڑ دیا تھا۔ ایسے میں زیب کے لیے اسے سنبھالنا سچ میں ایک امتحان ثابت ہونے والا تھا، وہ بھی اس صورت میں جب کہ سنی کسی سچائی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ تو کیا انہیں اسے

ساری حقیقت بتا دینی چاہیے تھی؟ پیشانی سہلاتے ہوئے انہوں نے پریشانی سے روتی ہوئی زیب کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن فی الوقت وہ ان کے کہے کی تصدیق کر کے انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"اچھا روؤ تو مت۔ میں خود اسے آہستہ آہستہ پیار سے سمجھاؤں گا۔" انہوں نے نرمی سے ان کی پشت سہلائی تھی۔ لیکن زیب جانتی تھیں کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہونے والا تھا۔ گزشتہ تین ماہ میں وہ اتنا تو جان ہی گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ایئرپورٹ پہ معمول کے مطابق خاصا رش تھا۔ یہاں سے کچھ ہی دیر بعد کراچی کے لیے فلائٹ روانہ ہونے والی تھی۔ جس میں انجم اپنی فیملی کے ساتھ جا رہی تھیں۔ انہیں چھوڑنے کے لیے زیب اور صغیر صاحب بچوں کے ہمراہ آئے ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ انجم مستقل بنیاد پہ یہاں سے جا رہی تھیں اس لیے قدرتی طور پہ سب ہی کے چہرے ملول اور دل اداس ہو رہے تھے۔ زیب کی آنکھیں تو بار بار آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔ وہ آج کل جذباتی طور پہ ویسے بھی بے حد کمزوری کا شکار تھیں۔ ایسے میں اپنے واحد خونی رشتے کی دوری کا احساس انہیں سخت تکلیف پہنچا رہا تھا۔

"آپا! آپ تب جا رہی ہیں جب مجھے آپ کے ساتھ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔" ان کا ہاتھ تھامے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں تو انجم کی اپنی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔

"اللہ تمہارے شوہر، تمہارے بچوں کو سلامت رکھے۔ تم کیوں اکیلی ہونے لگیں؟" ان کی محبت بھری خفگی پہ صغیر قاصی قصداً" ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔

"لیں۔ وہ شوہر کی شکایتوں کے زمرے میں ہی تو رو رو کے کہہ رہی ہے کہ اب وہ اکیلی رہ گئی اور آپ اسے میرا ہی حوالہ دے کر حوصلہ دے رہی ہیں۔" ان کی بات پر سب ہی ہنس پڑے۔ حتیٰ کہ روتی ہوئی زیب بھی مسکرا دیں۔

"ذرا پتا تو چلے میں نے آپ کی کس وقت شکایتیں کی ہیں؟" آنکھیں صاف کرتے ہوئے انہوں نے شوہر کی جانب دیکھا۔

"یہ کیوں نہیں کہتیں بیگم صاحبہ کہ ہم نے آپ کو شکایت کا موقع ہی کب دیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے ہوشیاری سے سارا کریڈٹ خود لے گئے تو ابراہیم ملک قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔

اسی لمحے کراچی جانے والے مسافروں سے چیک ان کی درخواست کی گئی تو ابراہیم ملک نے آگے بڑھ کے صغیر صاحب کو خود سے لگایا۔

"زیبی کا خیال رکھنا صغیر۔"

"آپ فکر مت کریں بھائی جان۔" وہ مسکرا کر بولے تھے۔

"پریشان نہ ہونا بیٹا، ہم تم لوگوں سے رابطے میں رہیں گے۔" ان کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے جھک کر پاس کھڑی دس سالہ مہر کو چومتے ہوئے گود میں اٹھا لیا تھا۔

"تم سنی اور مہر کے حوالے سے کبھی پریشان مت ہونا۔ وقت آنے پر ہم یہ کام ان شاء اللہ دھوم دھام سے پورا کریں گے۔" ان کی بات پر روتی ہوئی زیب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نیچے جھک کر اس سنہری آنکھوں والے چہرے کو چوم لیا تھا جو بغور سب کو تک رہی تھیں۔

"خالہ کی جان، خالہ کو یاد کرے گی نا؟" اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پہ زیب نے بے اختیار ہو کے اسے پھر سے چومتے ہوئے خود میں بھینچ لیا تھا اور پھر بہت سی دعاؤں کے حصار میں وہ تینوں ان کی نظروں سے دور ہوتے چلے گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

ایئرپورٹ سے واپسی پہ ان کا استقبال ایک ابتر لاؤنج نے کیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے کرسٹل پیسز، پھٹے

ہوئے میگزین اور بکھرے ہوئے کشنوں نے ایک لمحے کے لیے زیب کو دروازے کے پاس ہی بت بنا دیا تھا۔ انہیں راستے میں رکتا دیکھ کے پیچھے آتے صغیر صاحب نے الجھ کر ان کی طرف دیکھا تھا جو جاشی کو گود میں اٹھائے ادھ کھلے دروازے کے وسط میں کھڑی تھیں۔

"کیا ہوا؟" وہ بولتے ہوئے آگے آئے تھے۔ لیکن جونہی انہوں نے ہاتھ بڑھا کے دروازے کو دھکیلا تھا' اندر کے منظر نے انہیں بھی لحظہ بھر کو ساکت کر دیا تھا۔

ان کی موجودگی زیب کا سکتہ توڑنے کا باعث بنی تھی۔ وہ بنا ان کی جانب دیکھے اک گہری سانس لیتی آگے بڑھی تھیں۔ ان کا چہرہ مکمل طور پر پرسکون تھا۔

"شمیم!" انہوں نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں ملازمہ کو پکارا تو صغیر قاضی کی نظریں بے اختیار ان پر آٹھہریں۔ جن کی پیشانی ہر شکن سے بے نیاز تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی انہیں اپنے اندر ملال کے ساتھ ساتھ غصے کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

ان کی پکار پہ پریشان حال ملازمہ دوڑی چلی آئی تھی۔

"سلام بیگم صاحبہ! وہ جی یہ دیکھیں سنی صاحب نے کیا کیا۔"

"کب اٹھا تھا وہ؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے زیب نے بالکل نارمل لہجے میں سوال کیا تو ایک پل کو ملازمہ حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی۔ وہ تو ان کے سخت رد عمل کا سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ لیکن یہاں تو۔ تعجب سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے ایک نظر دروازے میں کھڑے صاحب پہ ڈالی تھی۔

"ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی۔"

"سنی۔!" صغیر صاحب کی با آواز بلند پکار پہ جہاں شمیم کی ڈر کے مارے آواز بند ہوئی تھی۔ وہیں زیب بیگم نے گھبرا کے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"کہاں ہے یہ؟ شمیم فوراً" لے کر آؤ اسے۔" وہ غصے سے دروازہ بند کرتے آگے آئے تھے۔

"کوئی ضرورت نہیں شمیم۔" زیب نے سرعت سے پلٹتے ہوئے آگے بڑھتی ملازمہ کو روکا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ بچہ ہے وہ۔" وہ صغیر صاحب کی جانب آئی تھیں۔

"تمہیں اس وقت بولنے کی ضرورت نہیں!" ان کے قطعی لہجے پہ زیب نے ان کے تنے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر پلٹ کر شمیم کو بلایا تھا۔

"انہیں باہر لان میں لے جاؤ۔" دونوں سہمی ہوئی بچیوں کو اس کے حوالے کر کے وہ صغیر صاحب کے مقابل آکھڑی ہوئی تھیں۔

"کیا کریں گے آپ۔ ڈانٹیں گے یا ماریں گے اسے؟" ان کے سوال پہ صغیر صاحب کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔

"آپ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں صغیر! ہم سب ایک مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔ ایسے میں آپ کے یہ دونوں عمل ہماری مشکل میں سوائے اضافے کے اور کچھ نہیں کریں گے۔ اس بچے کے دل میں اگر ایک بار آپ کے لیے نفرت اور بدگمانی کا بیج جڑ پکڑ گیا نا تو ہم پھر ساری زندگی بھی اگر کوشش کرتے رہیں گے تب بھی اس جڑ کو اس کے اندر سے اکھاڑ نہ پائیں گے۔"

ان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ رسان سے بولیں تو صغیر صاحب کے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ جنہیں محسوس کر کے زیب کا ہاتھ نرمی سے ان کے بازو پہ آٹھہرا۔

"آپ کمرے میں چل کر فریش ہوں۔ میں آپ کے لیے اچھی سی چائے لاتی ہوں۔ پھر ہم مل کر سوچتے ہیں کہ ہمیں اس مسئلے کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔"

ان کے تسلی آمیز انداز پہ صغیر قاضی کے لبوں پہ محبت بھری مسکراہٹ آٹھہری۔ وہ خود دن رات سنی کو لے کر کتنی پریشان تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن فی الوقت صرف ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو وہ کتنے سلجھے ہوئے انداز میں صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے اس درجہ محبت اور

خلوص پہ صغیر صاحب کو ٹوٹ کے پیار آیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے زیب! تم میری زندگی کا بہترین فیصلہ بنتی جارہی ہو۔" ان کے شانوں پہ ہاتھ جمائے وہ محبت پاش نظروں سے ان کا صبیح چہرہ دیکھنے لگے۔ جس پہ ان کی نگاہوں کی حدت نے گلابی رنگ بکھیر دیا تھا۔

"تمہاری اچھائی اور نرمی کا تو میں بہت پہلے ہی قائل ہو گیا تھا۔ لیکن جس خلوص اور حوصلے سے تم اب میرے گھر کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ واقعی قابل تحسین ہے۔"

"اچھا!" وہ ہونٹوں پہ شرگیں مسکان لیے فقط یہی کہہ سکی تھیں۔ صغیر صاحب نے ان کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

"بالکل۔ میں حقیقتاً" اللہ کے بعد یاسمین کا شکر گزار ہوں، جس نے میرے لیے تمہارا انتخاب کیا۔" اور ان کی اس درجہ محبت اور عزت نے زیب کی آنکھیں نم کر دیں۔

"یا اللہ مجھے ہمیشہ میرے شوہر کی توقعات پہ پورا اترنے کی توفیق عطا فرمانا۔" اس پل انہیں اپنے کندھوں پہ ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سنی اپنی حرکت اور گھر پہ صغیر صاحب کی موجودگی دونوں سے باخوبی واقف تھا۔ اسی لیے ساری شام اپنے کمرے کے باہر پھٹکا تک نہ تھا۔ زیب کے کہنے پہ شمیم اسے اس کے کمرے میں ہی رات کا کھانا کھلا آئی تھی۔ لیکن جس وقت وہ اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر جانے لگی تھی تب صغیر صاحب نے اسے منع کر کے خود اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا تھا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں؟" جاشی کو کھانا کھلاتی زیب نے پریشانی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن وہ بنا کوئی جواب دیے ڈائننگ روم سے باہر نکل گئے تھے۔

دروازے پہ دستک کی آواز پر ویڈیو گیم کھیلتے سنی نے پلٹ کر دائیں جانب دیکھا تھا اور شمیم کی جگہ صغیر صاحب کو دیکھ کر اس کی رنگت فق ہو گئی تھی۔ وہ شام میں ان کی غصے بھری پکار سن چکا تھا۔

"دھیان سے بھئی۔ بونا سیڑھیوں سے گر جائے گا۔" وہ اس کے چہرے پہ پھیلا ڈر دیکھ چکے تھے، اسی لیے قصداً" نارمل لہجے میں بولتے ہوئے دروازہ بند کر کے اندر چلے آئے تھے۔

"یہ بونے والا گیم نہیں ہے۔" دھیرے سے کہتا وہ رخ موڑ کے ہاتھ میں پکڑی گیم پر نظریں جما گیا تھا۔

"اچھا تو پھر کون سا گیم ہے؟" دودھ کا گلاس ایک طرف رکھی میز پر رکھ کے وہ بیڈ پہ اس کے برابر آبیٹھے تو سنی نے جھجکتے ہوئے سر اٹھا کے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ مجھے ڈانٹنے آئے ہیں کیا؟" بلاشبہ وہ ایک ذہین بچہ تھا۔

"تو آپ جانتے ہو کہ آپ نے غلط حرکت کی ہے۔" اس کے گول مٹول چہرے پہ نگاہیں جمائے صغیر صاحب نے نرم لہجے میں کہا تو سنی کی معصوم آنکھوں میں شرمندگی پھیل گئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔

"سچ بتاؤں تو میں آپ کو واقعی ڈانٹنے والا تھا۔ لیکن پتا ہے، مجھے کس نے روکا؟" صغیر صاحب نے رک کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"کس نے؟" سنی نے حیرت سے سوال کیا۔

"آپ کی زیب آنٹی نے۔" اور بغور ان کی بات سنتا سنی ایک پل کو خاموش ہو گیا۔ "وہ آپ سے بہت پیار کرتی ہیں بیٹا۔ اس لیے تو آپ کو بھی ان سے پیار کرنا چاہیے۔" انہوں نے اسے بازو کے حلقے میں لیا۔

"لیکن مجھے وہ اچھی نہیں لگتیں۔" اس کے لہجے میں بے زاری در آئی۔

"مگر کیوں؟"

"کیونکہ وہ ہماری فیملی میں گھس آئی ہیں اور اب جاتی ہی نہیں ہیں۔ اوپر سے مما کو بھی مار دیا انہوں نے۔" اس کے چہرے پہ غصے کے ساتھ ملال بھی

پھیل گیا۔
"بری بات سنی ایسے نہیں کہتے۔" انہوں نے ملامتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
"آپ کی مما جب بیمار تھیں تو کتنا خیال رکھتی تھیں وہ ان کا۔"
"ہاں تو پھر ٹھیک کیوں نہیں کیا انہوں نے مما کو؟ کیوں اپنا پرامس توڑا؟" اس نے دوبدو سوال کیا۔ صغیر صاحب اک گہری سانس لے کر رہ گئے۔
"اس لیے بیٹا کہ ٹھیک اللہ پاک کرتے ہیں۔ انسان نہیں۔"
"بس مجھے نہیں پتا۔ آپ ان سے کہیں کہ چلی جائیں یہاں سے۔ ہمیشہ کے لیے چلی جائیں!"
وہ اپنے مخصوص ہٹیلے انداز میں بولا تو صغیر قاضی کتنے ہی لمحے اسے بے بس نظروں سے دیکھتے رہے۔ یوں جیسے سوچ رہے ہوں کہ انہیں کچھ کہنا چاہیے یا نہیں اور پھر آن واحد میں وہ جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ گئے۔
"وہ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتیں بیٹا۔" وہ دھیرے سے بولے تو سنی بری طرح جھنجلا گیا۔
"کیوں؟"
"کیونکہ کیونکہ آپ کی مما انہیں آپ کی نئی امی بنا کر گئی ہیں بیٹا۔"
"کیا؟" سنی کی آنکھیں باپ کے چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔
یہی وہ سچائی تھی جو یاسمین اپنے پیارے بیٹے کو بہت طریقے سے خود بتانا چاہتی تھیں لیکن وقت نے انہیں مہلت ہی نہ دی اور اب یہ چیز زیب کے لیے ایک امتحان بن کر رہ گئی تھی۔
وہ جو اس گیارہ سالہ بچے کے یقین کی کسوٹی پہ پہلے ہی کھری اتر نہ پائی تھیں۔ اس انکشاف کے بعد تو بالکل ہی بے اعتبار ٹھہرا دی گئی تھیں۔ بلکہ ایک وہ ہی کیا سنی تو اپنے باپ تک سے نالاں اور گریزاں ہو گیا تھا۔
ان دو دنوں میں اس نے خود کو کمرے سے اسکول تک محدود کر لیا تھا۔ اسے راضی کرنے کی ہر تدبیر ناکام رہی تھی۔ اس کی یہ ناراضی زیب جیسی نرم اور حساس خاتون کا دل مزید پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ سنی کی شخصیت پہ کسی قسم کے منفی اثرات نہیں چاہتی تھیں۔ کیونکہ وہ یاسمین سے کیا اس کے بچوں کی بہترین پرورش کا وعدہ ہر حال میں نبھانا چاہتی تھیں۔ ایسے میں انہیں دونوں بچوں کا رد عمل الگ ہولائے جا رہا تھا جو تا حال حقیقت سے بے خبر تھیں۔ کاش انہوں نے صغیر صاحب سے یہ شادی ہی نہ کی ہوتی۔ لیکن تب کیا ان کے پاس اس سے بہتر کوئی اور راستہ موجود تھا؟

☆ ☆ ☆

"کیا؟" زیب نے سامنے بیٹھی اپنی بچپن کی سہیلی کو یوں دیکھا تھا گویا ان کی دماغی حالت پہ شک ہو۔
"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" ان کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔
"دماغ ہی تو نہیں ٹھیک۔" یاسمین پھیکی سی مسکراہٹ لیے بولیں۔ تو زیب کو بے اختیار اپنے جملے کی غلطی کا احساس ہوا۔
"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ شرمندہ ہوئیں۔
"جانتی ہوں تمہارے تمام مطلب۔" یاسمین یک لخت نارمل لہجے میں بولیں۔ زیب نے انہیں دیکھتے ہوئے اک گہری سانس لی۔
"تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو یاسمین؟" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
"کیوں؟ کیا برائی ہے اس میں؟" وہ بھی مکمل طور پر سنجیدہ ہو گئیں۔
"بات برائی اچھائی کی نہیں ہے۔ تم تم یہ دیکھو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم اپنے ہی شوہر کی شادی کی بات کر رہی ہو اور وہ بھی مجھ سے! لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"
"خدانخواستہ میں کوئی غلط یا انوکھی بات تو نہیں کر رہی۔۔۔ بہت سی بیویاں اپنے شوہروں کی خود شادیاں

کرواتی ہیں۔۔۔ کبھی اولاد کے لیے، کبھی اولادِ نرینہ کے لیے اور کبھی یونہی ان کی منشاء پہ انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دیتی ہیں۔ اس میں اتنی حیرت یا ناگواری والی بات کیا ہے؟" یاسمین نے سکون سے ان کی طرف دیکھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ لیکن میرے لیے اس میں ناگواری والی بات ہے میں احمد کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔" وہ نظریں چراتے ہوئے قطعیت سے بولیں۔ یاسمین نے اک گہری سانس لی۔

"احمد بھائی کی جگہ اور کوئی لے بھی نہیں سکتا۔ تمہاری اور ان کی گیارہ سالہ رفاقت تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب وہ تمہارے ساتھ نہیں رہے۔ تمہارے غم نے اماں جان کو ختم کر دیا۔ اب تم ہی بتاؤ اتنی لمبی زندگی کیسے گزارو گی؟"

"کسی طور گزر ہی جائے گی۔ میں بھی کوئی انوکھی بیوہ نہیں ہوئی۔" وہ تلخ ہوئیں۔

"وہ کسی طور کیا ہو گا زیب؟ تم جوان ہو۔ اکلوتی اولاد تمہاری چھوٹی۔ ماں کا تمہاری انتقال ہو گیا۔ باپ بھائی تمہارے کوئی نہیں۔ اکلوتی بہن اور بہنوئی تمہارے دور جانے والے ہیں۔ سسرال والے تمہیں پوچھنے کو تیار نہیں۔ ایسے میں وہ کسی طور کیا ہو سکتا ہے زیبی؟" یاسمین حقائق گنوانے پہ آئیں تو پھر بولتی چلی گئیں۔

"پتا نہیں۔ مجھے نہیں پتا۔" وہ بے اختیار گھٹنوں پہ پیشانی ٹکائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں تو یاسمین نے دکھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیوں خود کو بند گلی میں کھڑا کرنے پہ تلی ہوئی ہو زیب۔ دیکھو انجم آپا اور ابراہیم بھائی دونوں تمہاری طرف سے کتنے پریشان ہیں۔۔۔ اماں کے انتقال نے حالات کو یکسر بدل دیا ہے زیبی۔"

"چپ ہو جاؤ یاسمین۔ خدا کا واسطہ ہے چپ ہو جاؤ!" ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے وہ غصے سے چلائیں۔ یاسمین بے اختیار خاموش ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ لیکن میرے پروپوزل پہ غور کرنا اور یہ بات یاد رکھنا کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے زیب۔ اشد ضرورت!" ان کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ دھیرے سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور پیچھے زیب دونوں ہاتھوں میں سر گرائے کتنی ہی دیر روتی رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

ہفتے کا دن تھا۔ انجم آپا اور ابراہیم بھائی اس کی تنہائی کے خیال سے ویک اینڈ گزارنے اماں کی طرف چلے آئے تھے۔ رات کھانے کے بعد لاؤنج میں گپ شپ کرتے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے کافی کا بڑا مزیدار دور چلا تھا۔ جس کے بعد وہ دونوں بہنیں سب کے سونے کے بعد ٹیرس پہ چلی آئی تھیں۔

"ایک بات پوچھوں زیبی؟" ادھر ادھر کی باتوں کے دوران انجم نے اچانک سوال کیا تو زیب قدرے حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"پوچھیں آپا! اس میں بھلا اجازت کی کیا بات ہے؟"

"تم نے یاسمین کے پروپوزل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" ان کے چہرے پر نظریں جمائے وہ دھیرے سے بولیں تو زیب بری طرح چونک گئیں۔

"آپ اس بارے میں جانتی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ تم سے بات کرنے کے بعد وہ میری طرف آئی تھی۔" ان کے جواب نے زیب کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار کر دیں۔

"پاگل ہو گئی ہے وہ تو۔ یہ کوئی بات ہے بھلا۔"

"زیب! اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔" انجم نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"پلیز آپا!" زیب نے خفگی سے بہن کی جانب دیکھا۔ جس کا دوسری طرف کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔

"تم جانتی ہو، اس نے صغیر کو بھی راضی کر لیا ہے۔"

"کیا؟" اس انکشاف نے زیب کا رنگ اڑا دیا۔ وہ

کتنے ہی پل بولنے کے قابل ہی نہ رہیں۔

"اف میرے اللہ! میں اس شخص کا سامنا اب کیسے کروں گی!" سر تھامتے ہوئے ان کی آواز مارے بے بسی کے بھر آئی۔

"اس میں ایسی کیا بات ہے۔ کوئی تم نے خود تو اپنا پیغام اسے نہیں بھجوایا۔"

انجم قصداً "سختی سے بولیں تو زیب نچلا لب دانتوں تلے دبائے رخ پھیر گئیں۔ انجم نے بے اختیار اک گہری سانس لی۔ وہ ان کی دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتی تھیں۔

"دیکھو زیبی! تم ایک بار حالات کو یاسمین کی نظر سے بھی دیکھو۔ وہ ایک ایسی عورت ہے جس کا کینسر آخری اسٹیج پہ پہنچ چکا ہے۔ میکے میں اس کی چار بھاوجوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ صغیر اپنی فیملی میں اکلوتا ہونے کی وجہ سے تن تنہا ہے۔ ایسے میں اگر وہ منطقی ہو کے سوچ رہی ہے اور اپنی زندگی میں ہی اپنے دونوں بچوں کو محفوظ اور قابل بھروسہ ہاتھوں میں سونپنا چاہتی ہے تو کیا غلط ہے؟ کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ چاہے صغیر آج بیوی کا دم کیوں نہ بھرے' لیکن بہرکیف وہ آنے والے وقت میں اتنے چھوٹے بچوں اور گھر کو تنہا تو نہیں سنبھال سکتا؟ اور یاسمین میں کسی انجانی عورت کو اپنے بچے سونپنے کا حوصلہ نہیں۔۔۔ ارے میں تو سلام کرتی ہوں اس کی بہادری اور اس کی ہمت کو' جو اتنے حوصلے سے آنے والے وقت کی تیاریاں کرتی پھر رہی ہے۔ ورنہ کسی عورت میں اتنی دور اندیشی اور دل گردہ ہوا کرتا ہے؟"

زیب کے بازو پہ ہاتھ رکھے وہ نرم لہجے میں تصویر کا دوسرا رخ ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔ تو نا چاہتے ہوئے بھی زیب کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو گیا اور وہ بہن کی طرف دیکھنے لگیں۔

"زیبی میری جان یہ اس کا تمہاری ذات پہ بھروسہ اور محبت ہی ہے جو وہ تم میں اپنا آپ دیکھ رہی ہے۔ سوچو ذرا کتنا کڑا وقت ہے اس پر' جو اپنی زندگی میں اپنے بچوں کے لیے اپنا متبادل ڈھونڈ رہی ہے۔ ایسے میں اگر اس کا دل تمہاری جانب مائل ہوا ہے تو بحیثیت ایک عورت اور انسان کے یہ تمہارے لیے کتنے فخر کی بات ہے۔ ورنہ اس کے خاندان یا صغیر کی فیملی میں بہنوں' بیٹیوں کی کمی ہے کیا؟ اور پھر وہ صرف اپنا ہی نہیں بلکہ تمہارا بھی بھلا چاہ رہی ہے' اس کے گھر کو اگر تمہاری ضرورت ہے تو تمہیں بھی اس گھر کی ضرورت ہے زیبی۔" ان کا ہاتھ تھامے انہوں نے رسان سے کہا۔

زیب کی نظریں بے اختیار جھک گئیں۔

"اور میری اولاد! اس کا کیا ہو گا؟" زیب نے پسپا سے لہجے میں سوال کیا تو انجم کے لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولیں۔

"تم نے کیا انہیں اتنا ہی خود غرض سمجھ رکھا ہے؟ یاسمین اور صغیر دونوں کا یہی کہنا ہے کہ وہ تم سے پہلے تمہاری اولاد کو قبول کریں گے۔" اور زیب خاموشی سے بہن کو تکنے لگیں۔

"اور اگر ہماری اولادوں نے ہی اس تبدیلی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو؟" اور اتنی دیر میں پہلی بار انجم جواباً "کچھ بول نہ پائی تھیں۔

✿ ✿ ✿

"بچوں کو کوئی کچھ نہیں بتائے گا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے یاسمین؟" انجم نے اچنبھے سے یاسمین اور ان کے برابر بیٹھے صغیر قاضی کی طرف دیکھا۔ "بچوں کو ذہنی طور پہ تیار کرنا بہت ضروری ہے۔"

"ایک بات بتائیں آپا' ہم بچوں کو کیا کہہ کر تیار کریں گے۔۔۔ دوسری ماں یا سوتیلا باپ؟ اس تعارف کے بعد آپ ہی کہیں بھلا کوئی بچہ ذہنی طور پہ بھی تیار ہو پائے گا؟" یاسمین نے ان کی جانب دیکھا تو وہاں موجود سبھی افراد خاموش ہو گئے۔

"کہہ تو آپ بالکل ٹھیک رہی ہیں یاسمین۔" ابراہیم صاحب نے بے اختیار ان کی تائید کی۔ "لیکن پھر یہ سب کیسے ہو گا؟"

"بھائی جان میں چاہتی ہوں کہ بچے ایک دوسرے کو اور زیب اور صغیر کو خود پرکھیں اور قبول کریں۔ زیب کا تعارف میں اپنے گھر میں اپنی پیاری دوست کی حیثیت سے کروانا چاہتی ہوں اور میرے خیال سے زیب کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ بچے ایک بار جب سب سے مانوس ہو جائیں گے اور آپس میں گھل مل جائیں گے تو ہمارے لیے انہیں سمجھانا اور ان کے لیے ان رشتوں کو دل سے قبول کرنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔"

"صحیح کہہ رہی ہو۔ ساری بات ہی دل سے قبول کرنے کی ہے۔" انجم نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال میں یاسمین ٹھیک کہہ رہی ہیں... بچے بہت چھوٹے تو ہیں نہیں۔ اس لیے ان پر اتنی بڑی تبدیلی مسلط کرنے کے بجائے انہیں رفتہ رفتہ خود ہی اس کا حصہ بننے دیا جائے۔"

اور پھر یہی ہوا تھا۔ بچوں کے علم میں لائے بغیر زیب، صغیر قاضی اور یاسمین صغیر، تینوں ایک دوسرے کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ اس نئی تبدیلی کو دونوں بچیوں نے بڑی خوشدلی سے قبول کیا تھا اور جلد ہی آپس میں گھل مل گئی تھیں۔ لیکن سنی جیسے ضدی اور یوزیسو بچے کے لیے اپنے گھر میں دو اجنبیوں کی آمد کو قبول کرنا ہرگز آسان نہ تھا۔ وہ ہر چوتھے دن اپنی ماں سے ان کی واپسی کے متعلق سوال کرنے بیٹھ جاتا تھا۔ جواباً یاسمین اسے مسلسل ٹوکتی اور سمجھاتی رہتی تھیں۔ زیب بھی اس کے قریب آنے کے مختلف حیلے بہانے تلاش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن سنی کو قائل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ یاسمین کا بے حد لاڈلا اور بگڑا ہوا تھا۔

پھر ایک روز یاسمین کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ ان کا مرض دنوں میں شدت اختیار کر گیا تھا۔ ہر چیز پس پشت چلی گئی تھی۔ یاد رہ گئی تھی تو صرف یاسمین کی ذات جو بہت تکلیف میں تھی۔ ایسے وقت میں زیب نے ایک بہن کی طرح اپنی سہیلی کو سنبھالا تھا۔ ان کی دن رات کی خدمتوں نے خاندان کے ان تمام لوگوں پر یاسمین کے فیصلے کی درستی کو ثابت کر دیا تھا، جنہوں نے صغیر قاضی کی دوسری شادی کی مخالفت کی تھی۔

ماں کی طبیعت خرابی سے سہم کر سنی نے بھی زیب کی ممتا بھری آغوش میں پناہ لی تھی۔ اس نے زیب سے وعدہ لیا تھا کہ وہ جلد اس کی ماں کو ہسپتال سے ٹھیک کروا کے گھر لے آئیں گی وہ ماں کے مرض کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن یاسمین کی موت نے زیب کو اپنا وعدہ نہیں نبھانے دیا تھا۔ وہ سنی کی خواہش پوری نہ کرپائی تھیں اور اس کی معصوم نظروں میں جھوٹی اور بے اعتبار ٹھہری تھیں۔ لیکن صغیر صاحب کے اس انکشاف کے بعد کہ وہ اس کی ماں کے عہدے پہ فائز ہو چکی، زیب کو اس کی معصوم نگاہوں سے چھلکتی نفرت میں اپنے لیے ایک اور ٹائٹل نظر آیا تھا۔ وہ ٹائٹل جو وہ جانتی تھیں کہ اب ساری زندگی نہیں بدلنے والا۔ خواہ وہ کچھ بھی کرلیتیں۔ اور وہ لقب تھا ایک غاصبہ کا۔ ایک ایسی عورت جس نے اس کی ماں کے بعد اس کے باپ اور اس کے گھر پہ قبضہ کرلیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہمت رکھو زیبی، اللہ نے چاہا تو آہستہ آہستہ حالات نارمل ہو جائیں گے۔" زیب فون کان سے لگائے انجم سے بات کر رہی تھیں۔ ان کی تسلی پہ انہوں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔

"مجھے نہیں لگتا آپا۔ پندرہ دن ہو گئے ہیں اس بچے نے مجال ہے، جو مجھ سے ایک جملہ بھی کہا ہو... اتنے چھوٹے سے بچے کا اتنا شدید رد عمل، اتنی ضد، میں تو حیران رہ گئی ہوں۔"

"صغیر کیا کہتا ہے اس بارے میں؟"

"وہ تو خود پریشان ہو گئے ہیں اس کے رویے کی قطعیت سے۔ بڑی مشکل سے جا کے تو اس نے ان سے بات چیت شروع کی ہے۔" زیب کی بات پہ انجم بھی پریشان ہو گئیں۔

"تم لوگ کسی سائیکالوجسٹ کی مدد کیوں نہیں لیتے؟"

"میں تو یہ بات صغیر سے نہیں کہہ سکتی آپا!" وہ دھیمے لہجے میں بولیں تو انجم بھی چپ ہو گئیں۔

"اچھا چھوڑیں ان باتوں کو۔ آپ وہاں کی سنائیں؟ دل لگ گیا آپ کا؟"

"کیسا دل اور کہاں کا لگنا۔ ابراہیم جو صبح سے جاتے ہیں تو شام میں اور کبھی کبھار تو رات میں واپس آتے ہیں۔ ہم دونوں سارا دن گھر میں ہوتے ہیں۔ بہت ہوا تو پارک تک چلے گئے۔ یا قریبی مارکیٹ تک نہ کوئی جان نہ کوئی پہچان۔ ہاں ویک اینڈ پہ ابراہیم ہمیں گھمانے پھرانے لے جاتے ہیں۔"

"اس کے ایڈمیشن کا کیا بنا؟" زیب نے سوال کیا۔

"ابھی فارمیلٹیز ہیں۔ کچھ ٹائم لگے گا۔ تب تک میں اسے گھر پہ ہی پڑھا رہی ہوں۔"

"یہ اچھا کر رہی ہیں۔ اس کے کوئی دوست وغیرہ بنے؟"

"ہاں ایک دو بچے ہیں آس پڑوس میں۔ لیکن یہاں کا ماحول اُف میری توبہ! میں تو کہتی ہوں ابراہیم سے پتا نہیں کہاں آ پھنسے ہیں ہم۔" انجم کے لہجے کی بیزاری نے زیب کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

"آپ جہاں پھنسی ہیں نا وہاں پھنسنے کے لوگ خواب دیکھتے ہیں۔"

"چھوڑو، ہوں گے کوئی سطحی قسم کے لوگ۔ میرے تو نہ ایسے کوئی خواب تھے اور نہ آرزو۔ یہ تو تمہارے بھائی کو دوست کے ساتھ کاروبار کی دُھن یہاں تک کھینچ لائی ورنہ اگر میرا بس چلے تو منٹ نہ لگاؤں واپسی میں۔"

"کسی نے صحیح کہا ہے انسان کسی حال میں خوش نہیں۔" زیب بے اختیار ہنس پڑیں۔

"یہ تو ہے۔" انجم بھی مسکرا دیں۔ "اچھا زیبی باہر دروازے پہ دستک ہو رہی ہے۔ میں رکھتی ہوں۔"

"اوکے آپا! اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔" دوسری طرف سے بھی الوداعی کلمات کہنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا گیا تو زیب کریڈل پہ فون رکھتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تب ہی لاؤنج کا داخلی دروازہ کھول کے صغیر قاضی اندر چلے آئے۔ وہ خاصی عجلت میں تھے۔

"زیبی! فٹافٹ میرا بلیک ڈنر سوٹ نکال دو۔ مجھے ایک بزنس ڈنر پہ جانا ہے۔"

"اچھا جی آپ فریش ہوں، میں نکالتی ہوں۔" وہ ان کے پیچھے چلتی سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

انہیں کمرے میں گئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی، جب بچوں کی چیخ و پکار پہ وہ دونوں گھبرا کے باہر نکل آئے۔ شور کی آوازیں سنی کے کمرے سے آتی سن کر وہ اس کے کمرے کی جانب بھاگے۔ جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے کی؟" سنی، جاشی کے ساتھ کھڑی دس سالہ بچی کو گھور رہا تھا۔ جس کی رنگت مارے خوف کے زرد پڑ گئی تھی۔ بے اختیار صغیر صاحب نے آگے بڑھنا چاہا تھا۔ لیکن نجانے کس احساس کے زیر اثر زیب نے ان کا بازو تھام کر انہیں سر کے اشارے سے اندر جانے سے منع کر دیا تھا۔

"وہ بھائی! لاؤنج میں آپ کا گیم پڑا تھا۔ ہم وہ آپ کو دینے آئے تھے۔" اس نے اٹکتے ہوئے کہا تو سنی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نہیں ہوں میں تمہارا بھائی، سمجھیں!" دانت پیستے وہ آگے آیا تو وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بے اختیار آنسو جمع ہونے لگے۔

"مت کریں بھائی۔ کیوں ڈانٹ رہے ہیں آپ اسے؟" سات سالہ جاشی نے سنی کی پیچھے سے شرٹ کھینچی۔

"تم چپ کرو!" اس نے پلٹ کر غصے سے جاشی کو گھر کا۔ "خبردار جو تم نے اس گندی لڑکی کی سائیڈ لی!"

"لوں گی وہ فرینڈ ہے میری۔" جاشی بھاگ کے دوسری طرف اس کے برابر آ کھڑی ہوئی۔

"کوئی فرینڈ نہیں ہے یہ تمہاری۔ یہ تمہاری اسٹیپ سسٹر ہے۔" سنی نے غصے سے بہن کو گھورتے

ہوئے کہا تو اس کے منہ سے "اسٹیپ سسٹر" کا لفظ سن کے جہاں زیب ہکابکا رہ گئیں' وہیں صغیر صاحب کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"جھوٹ بول رہے ہیں یہ۔ میں تمہاری کوئی اسٹیپ سسٹر نہیں ہوں جاشی۔" اس نے تڑپ کر اس گندے الزام کو خود پہ سے ہٹایا تھا۔ بھلا وہ کوئی سنڈریلا کی اسٹیپ سسٹرز جیسی تھی ..... بدصورت' چالاک اور بری۔

"ہونہہ! بلکہ صرف تم ہی نہیں بلکہ تمہاری امی بھی اسٹیپ مدر ہیں ہماری!" سنی کی بات پہ زیب اور صغیر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پلٹ کے دیکھا تھا۔ جبکہ اندر موجود بچی اس نئے الزام پر تڑپ اٹھی تھی۔

"کوئی نہیں جی۔ میری امی بہت اچھی ہیں۔ وہ کسی کی اسٹیپ مدر نہیں۔" اس نے غصیلی نظروں سے سنی کو دیکھا۔

"ہاں جی' زیب آنٹی بہت اچھی ہیں۔" جاشی نے فوراً" تائید کرتے ہوئے اپنی سہیلی کا بازو تھاما۔ دوست کا سہارا ملتے ہی وہ بچی یک لخت بہادر ہو گئی۔

"آپ خود ہوں گے اسٹیپ برادر گندے' برے اور....." اگلے ہی پل غصے میں کھولتے سنی کا ہاتھ گھوما اور اس کے چہرے پہ چٹاخ کی آواز سے تھپڑ پڑا۔ تھپڑ لگتے ہی وہ پھپک کے رو پڑی اور صغیر صاحب ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑاتے سرعت سے اندر چلے آئے۔

"سنی!" تنبیہی انداز میں اسے پکارتے ہوئے انہوں نے آگے بڑھ کے اس روتی ہوئی گڑیا کو گود میں اٹھا لیا۔ "آپ کی ہمت کیسے ہوئی بہن پہ ہاتھ اٹھانے کی؟" وہ اسے گھورتے ہوئے دھاڑے تو جاشی بھاگ کر زیب کی ٹانگوں سے جا لپٹی۔ زیب کا ہاتھ بے اختیار اس کے سر پہ آ ٹھہرا۔ جبکہ نگاہیں اندر کمرے میں جمی تھیں۔

"کوئی نہیں ہے یہ میری بہن۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ ڈھٹائی سے بولا تو صغیر صاحب کا ضبط جواب دے گیا۔

"بدتمیزی کرتے ہو!" انہوں نے آگے بڑھ کے اس کے بازو کو ایک جھٹکا دیا تو وہ بے اختیار رو دیا۔ زیب فوراً" جاشی کو ایک طرف کرتی اندر چلی آئیں۔

"صغیر! کیا کر رہے ہیں آپ؟" انہوں نے سرعت سے روتے ہوئے سنی کو اپنی جانب کھینچا۔ لیکن وہ ان کی گرفت میں بری طرح مچلنے لگا۔

"چھوڑیں مجھے۔ نہیں آنا میں نے آپ کے پاس۔"

"سنی!" صغیر صاحب غصے میں کھولتے آگے کو آئے۔ انہیں بڑھتا دیکھ کے زیب نے سنی کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ روتا ہوا کمرے سے باہر بھاگ گیا اور پیچھے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"لائیں اسے مجھے دیں۔ آپ کو دیر ہو رہی ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد زیب نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا تو صغیر صاحب نے ان کے ہاتھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے گود میں اٹھائی گڑیا کا چہرہ چوما۔

"میں فی الحال اپنی بیٹیوں کو آئس کریم کھلانے لے جا رہا ہوں۔ تم چلوگی؟" اور زیب نے اپنے شریک سفر کے پرخلوص چہرے کو تکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"لیکن سنی کے لیے یاد سے پیک کروا کے لائیے گا۔" وہ دھیرے سے بولیں تو صغیر قاضی بے اختیار مسکرا دیے۔ وہ واقعی ان کے بچوں کی بہترین ماں تھیں۔

✲ ✲ ✲

وقت چند ماہ آگے سرکا تھا اس تکلیف دہ انکشاف کے بعد کہ سنی کے ذہن میں سگے اور سوتیلے کا فرق واضح طور پہ موجود ہے' صغیر صاحب اور زیب نے خود بٹھا کے دونوں بچیوں کو ان دونوں کے درمیان موجود ایک اور پیارے سے رشتے کا احساس دلایا تھا۔ انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی صرف سہیلیاں ہی نہیں بلکہ بہنیں بھی ہیں اور وہ سب ایک ہی فیملی کا حصہ ہیں۔ جس میں صغیر صاحب سب کے ڈیڈی اور زیب سب کی امی ہیں۔

زیب کے مشورے پہ صغیر قاضی شہر کے مشہور سائیکالوجسٹ کے پاس منی کا مسئلہ لے کر گئے تھے۔ ان کے مشوروں سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ باپ اور بہن کے ساتھ ٹھیک سلوک کرنے لگا تھا جبکہ زیب کے لیے اس کے انداز میں خاموشی اتر آئی تھی۔ اس کی اتنی سی تبدیلی پر ہی ان دونوں نے سکھ کا سانس لیا تھا اور ابھی ان کے درمیان ایک اور خبر ہلچل مچانے آ گئی تھی۔

"کیا؟" صغیر صاحب نے خوشگوار حیرت سے منہ لٹکائے بیٹھی زیب کی طرف دیکھا۔

"جی۔ میری رپورٹ پازیٹو ہے۔"

"او میرے خدا! اتنی خوشی کی خبر۔ اور تم اتنا بُرا سا منہ بنا کے بیٹھی ہو؟" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ان کے قریب چلے آئے۔

"آپ سمجھ نہیں رہے۔ میں بہت عجیب سا فیل کر رہی ہوں۔ اتنے عرصے بعد۔"

"اوں ہوں۔" صغیر صاحب نے بے اختیار ان کے لبوں پر انگلی رکھ دی۔ "اللہ پاک ہم پہ مہربان ہوا ہے زیب۔ اس کی ناشکری مت کرو۔" اور زیب چاہ کر بھی مزید کچھ نہ کہہ پائیں۔

"ہمارا ساتھ مکمل کرنے کے لیے شکریہ۔ میں سچ میں بہت، بہت خوش ہوں۔" فرط جذبات میں انہوں نے مسکراتے ہوئے انہیں خود سے لگا لیا تھا۔ ان کی اس درجہ خوشی اور اطمینان پر زیب صغیر کا دل بھی اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نیویارک شہر میں یہ ایک عام سا نائٹ کلب تھا۔ جہاں قانونی اور غیر قانونی سبھی کام ہوتے تھے اور اس جیسے ایڈونچر کے شوقین کم عمر لڑکے کو یہاں کی غیر قانونی شہرت ہی کھینچ کے لائی تھی۔ وہ اپنے تینوں دوستوں کے بلاوے پہ، جن کی عمریں تیرہ چودہ کے لگ بھگ تھیں۔ آج پہلی بار اپنے ماں باپ سے چھپ کے ایسے کسی ایڈونچر پہ نکلا تھا اور اندر پہنچ کے

اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں' وہاں موجود حسیناؤں کے حلیے دیکھ کے وہ کتنی دیر کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے کھلے منہ اور پھٹی آنکھوں کو دیکھ کے بغور اس کی حالت زار کا جائزہ لیتے اس کے تینوں دوست ہاتھ پہ ہاتھ مار کر قہقہہ لگا کے ہنس پڑے تھے۔

"منہ تو بند کرلو یار' کہیں مکھی نہ چلی جائے۔" اس کے ایک دوست نے شرارت سے آگے بڑھ کے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے اوپر کیا تو باقی دونوں لڑکے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ جبکہ وہ خود اپنے حواسوں میں لوٹ آیا۔

"واؤ!" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکتے ہوئے پہلے اپنے دوستوں کی طرف اور پھر دوبارہ سامنے اسٹیج کی جانب دیکھا۔ "میرا مطلب ہے۔۔۔" اس نے نگاہیں ہٹائے بغیر کوئی اور تعریفی کلمہ سوچنا چاہا۔ مگر جب ذہن ساتھ نہ دے پایا تو فقط کندھے اچکا کر ہی کہہ سکا۔

"جسٹ واؤ مین!" اور وہ تینوں ایک بار پھر گلا پھاڑ کے ہنس پڑے۔

"ابھی سے واؤ مت کہو' ابھی تو تمہیں بہت کچھ دکھانا اور چکھانا ہے۔" اور سیم کی آنکھوں میں انوکھی چمک اتر آئی۔ وہ کسی کٹی پتنگ کی طرح اپنے دوستوں سے بندھا کھنچتا اور بہکتے لوگوں کو مشتاق نظروں سے تکتا' ایک جانب بنے لمبے سے بار کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"کیا لو گے تم؟" وہاں موجود پینے والوں کو ایک طرف ہٹاتے' وہ چاروں کاؤنٹر کے ساتھ آ لگے تو اس کے دوست نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے کیا پتہ۔ میں نے پہلے کب پی ہے۔" اور اس کا دوست تاسف سے سر ہلاتا بیرے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جبکہ سیم دلچسپی سے سامنے دیوار کے ساتھ سجی بوتلوں کو دیکھنے لگا۔ تبھی ایک خیال آنے پر وہ اپنے دوسرے دوست کی جانب جھکا۔

"یہ لوگ ڈرگز وغیرہ کہاں رکھتے ہیں؟" تیز میوزک کی وجہ سے وہ اس کے کان میں گھسا۔

"وہ اندر چھپا کے بیچی جاتی ہیں۔"

"ہم بھی لیں؟" اس نے اشتیاق سے کہا تو اس کے دوست نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ کوئی نادان بچہ ہو۔

"تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں؟" اور سیم بے اختیار شرمندہ ہو تا سیدھا ہو گیا۔

بیرے نے ان کا آرڈر لا کے ان کے سامنے رکھا۔ تو سیم کی پوری توجہ' سارا اشتیاق شیشے کے اس بڑے سے گلاس پہ مرکوز ہو گیا' جس کی باہری سطح پہ مشروب کی ٹھنڈک کے باعث پانی کے قطرے پھسل رہے تھے۔ جبکہ اندر بھرے سنہری براؤن مائع پر اسے لحظہ بھر کو کہانیوں میں سنے طلسماتی سنہری پانی کا گمان ہوا تھا۔۔۔ برائی واقعی بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ اس کے دل نے بے اختیار اس کے باپ کے منہ سے سنے جملے کی تصدیق کی تھی۔ اس سے نظریں چرانا بڑے بڑوں کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تو پھر ایک کچی عمر کا بچہ تھا۔

"واؤ! کتنا خوب صورت ہے یہ۔" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا تھا۔ اس نے بھلا یہ نظارہ کب دیکھا تھا۔

"کیا یہ گلاس؟" اس کے دوست نے حیرت سے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پہ وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"پاگل ہو تم۔ بالکل پاگل!" اس کے شانے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کے سامنے پڑا گلاس اٹھا کر ہوا میں بلند کیا۔

"ٹو سیم!" اس کے پرجوش نعرے پہ ان تینوں نے بھی اپنے اپنے گلاس اٹھا کے ہوا میں اونچے کیے۔

"ٹومی!" مسکراتے لبوں کے ساتھ اس کی آواز ان تینوں کی آواز میں شامل ہوئی تھی۔ اور پھر اس نے اس چمکتے مشروب کا بڑا سا گھونٹ اپنے اندر اتارا تھا۔ مشروب کی تیزی نے بڑی سرعت سے اس کے حلق میں سفر کیا تھا۔ اسے بڑی زور کا ٹھسکا لگا تھا۔ اس کی حالت زار پہ ایک بار پھر اس کے دوستوں کی ہنسی بے اختیار گونجی تھی۔

"ویلکم ٹو دا ورلڈ آف یور ڈریمز مائی فرینڈ!"

(تمہارے خوابوں کی دنیا میں تمہیں خوش آمدید میرے دوست!) ہنستے ہوئے اس کے دوست نے بری طرح کھانستے سیم کی پشت پہ ہاتھ مارا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح کاذب کا وقت تھا جب زیب کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ صغیر صاحب نے ایمرجنسی میں اپنی خالہ کو فون کرکے بچوں کے پاس آنے کے لیے کہا تھا اور خود زیب کو ہسپتال لے کر بھاگے تھے۔ ایسے میں سنی جب اسکول کے لیے اٹھا تھا تو گھر میں دادی جان اور ملازموں کے سوا کسی کو نہ پاکے وہ فردوس بیگم کے پاس چلا آیا تھا۔

"سب کہاں ہیں دادی جان؟"

"تمہاری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیٹا۔ اس لیے تمہارے ڈیڈی انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں۔" فردوس بیگم نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ہسپتال اور طبیعت خرابی کا سن کے سنی کی آنکھوں میں یک لخت چمک سی اتر آئی۔

"کیا وہ بھی مرنے والی ہیں دادی جان؟" اس نے اشتیاق سے سوال کیا تو فردوس بیگم بے اختیار دہل گئیں۔

"اللہ نہ کرے بیٹا۔ وہ تو تمہارے لیے نئے بہن بھائی لینے گئی ہیں۔" انہوں نے اسی سوال کو اس کے اندر کا خوف جان کر شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ ان کے انکار نے سنی کے اشتیاق پر اوس گرادی تھی۔

"انہیں کس نے کہا ہے کہ نئے بہن بھائی لائیں۔ ہمیں نہیں چاہئیں۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ یہ تحفہ تو اللہ تعالیٰ خود بھیج رہے ہیں تمہارے لیے۔ تمہارے ڈیڈی کے لیے۔"

ان کی بات پہ وہ بے اختیار چونکا۔

"ہماری فیملی کے لیے؟" اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "یعنی میرے لیے جاشی کے لیے اور ڈیڈی کے لیے؟" اس نے اپنے تئیں اپنی ذاتی فیملی کی وضاحت کی تو اس کے اصل مفہوم سے بے خبر فردوس بیگم ہنس پڑیں۔

"ہاں بھئی تم تینوں کے لیے۔ اب جاؤ اور جا کے منہ دھولو۔" انہوں نے اس کا چہرہ سہلایا تو دادی جان سے تصدیق پاکے سنی مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

زیب اور صغیر قاضی کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بیٹی سے نوازا تھا۔ ننھی پری کی آمد نے "قاضی ولا" میں رونق کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ سنی بھی اپنی چھوٹی بہن کو پاکے خاصا خوش تھا، وہ اور بات تھی کہ کسی کو بھی اس کے اطمینان اور خوشی کی اصل وجہ معلوم نہ تھی۔ اس کے ردعمل نے زیب اور صغیر دونوں کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ورنہ اس تمام عرصے میں سنی کے ردعمل کو لے کے زیب بے حد پریشان رہی تھیں۔ لیکن اب اسے دیکھ کر انہیں لگتا تھا جیسے اللہ نے ان کی اس مشکل کو آسان کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ گنگناتے ہوئے جس وقت گھر میں داخل ہوا دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ اپنا اسکول بیگ صوفے پہ اچھالتے ہوئے اس نے ایک نظر خالی پڑے کچن میں ڈالی تھی۔

"مام! کہاں ہیں آپ؟" پلٹ کر اپنی ماں کو پکارتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھا تھا۔

"میں نیچے ہوں بیٹا۔" ان کا جواب تہہ خانے سے آیا تو اس کے بڑھتے قدم پل بھر کو رکے اور پھر نیچے جاتے زینے کی جانب اٹھنے لگے۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" وہ سیڑھیاں اتر کر ان کے پاس آکھڑا ہوا جو ایک جانب رکھی الماری میں سے کچھ چیزیں نکال رہی تھیں۔

"میں..." سیدھی ہوتے ہوئے وہ اپنے خوبرو بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"میں نے یہاں کچھ گفٹ آئیٹمز رکھے تھے وہ نکال رہی تھی۔ تم بتاؤ آج اتنی دیر کیوں ہو گئی آنے میں؟" انہوں نے اپنی سانس برابر کی۔

"آج کوچ نے پریکٹس رکھ لی تھی۔ اس لیے دیر ہو گئی۔" وہ اپنے اسکول کی باسکٹ بال ٹیم میں تھا۔ "اس بیگ میں کیا ہے؟" اس نے باہر نکالے گئے سامان میں سے ایک بڑے سے نیلے بیگ کی طرف اشارہ کیا تو اس کی ماں اس بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگیں۔

"اس میں تمہارے بچپن کی چیزیں ہیں۔"

"دکھائیں..." وہ اشتیاق سے آگے بڑھا تو انہوں نے بیگ اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔ وہ وہیں کارپٹ سے ڈھکے فرش پہ ایک جانب بیٹھ کر بیگ کھولنے لگا۔

"او! یہ میرے فراک ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے تہہ کیے ہوئے بالکل چھوٹے چھوٹے فراکوں کا ایک ڈھیر نکالا تو اس کی ماں ہنستے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھیں۔

"ہاں۔"

"لیکن میں تو لڑکا ہوں۔" اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"جسٹ بارن بے بیز کو فراک ہی پہناتے ہیں۔ اب چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔" ان کی وضاحت پہ وہ مسکراتے ہوئے پرشوق نظروں سے ایک ایک کر کے انہیں دیکھنے لگا۔ پھر بیگ میں ہاتھ ڈال کر اور چیزیں نکالتا چلا گیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے لکڑی کا ایک منقش باکس نکال کر اسے اشتیاق سے دیکھا۔

"یہ تمہاری نانی اماں کا ڈبا تھا۔" اس کی ماں نے ڈبا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"اس میں کیا ہے مام؟" ماں کے تاثرات پہ وہ قریب کھسک آیا۔

"خود کھول کے دیکھ لو۔" انہوں نے مسکراتی نظروں سے ڈبا اس کے حوالے کیا تو وہ سامنے رکھ کے اسے کھولنے لگا۔ چھوٹا سا لاک کھول کے اس نے ڈھکن اٹھایا تو اندر تصویروں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔

"یہ تو فوٹوگرافز ہیں۔" اس کی بات پہ اس کی ماں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کے تصویریں اٹھا لیں اور ایک ایک کر کے انہیں دیکھنے لگا۔ اس کی مام بھی تصویروں پہ جھک آئیں۔ لیکن جوں جوں تصویریں آگے بڑھتی گئیں اس کی مسکراہٹ سمٹنے لگی۔ حتیٰ کہ اس نے بیچ میں ہی ہاتھ روک دیا۔

"رک کیوں گئے بھئی؟" اس کی مام نے حیرت سے نظریں ہٹا کے اس کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے کو ہر تاثر سے عاری پا کے وہ بے اختیار ٹھٹک گئیں۔

"وہ مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ مال جانا تھا۔" تصویریں ڈبے میں رکھتے ہوئے وہ یک لخت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "آپ کو کچھ منگوانا تو نہیں؟" اس نے ماں کی طرف دیکھا تو بغور اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"او کے پھر شام میں ملاقات ہوتی ہے۔" وہ جھک کر ان کا گال چومتا سیڑھیاں پھلانگ گیا تو وہ پرسوچ نظروں سے سامنے پڑی تصویروں کو تکتے ہوئے اس کی اس عجیب حرکت کے بارے میں سوچنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

قائداعظم کی تصویر سے آراستہ، مختلف ٹرافیوں اور شیلڈز کو دیوار گیر الماری میں سجائے یہ بڑا بارعب سا کمرہ اسکول پرنسپل کا تھا۔ جہاں صغیر قاضی اسے داخلے کی غرض سے لائے ہوئے تھے۔ ان کے برابر کرسی سنبھالے وہ دلچسپی سے اردگرد کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔ ساتھ ہی کبھی کبھار ان دونوں کی گفتگو بھی سن رہی تھی جو کافی دیر سے جاری تھی۔

"آپ جانتے ہیں صغیر صاحب! سال کا مڈ چل رہا ہے۔ ایسے میں نیو ایڈمشن لینا ہمارے لیے خاصی دقت کا باعث ہے۔" پرنسپل صاحب نے مسکراتے ہوئے دبے الفاظ میں معذرت کی کوشش کی کیونکہ صغیر قاضی کے نا صرف دونوں بچے یہاں پڑھتے تھے بلکہ وہ ان کے اس مہنگے اور معروف تعلیمی ادارے کے ڈونر بھی تھے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری یہ بیٹی بھی اس سال سے ہی آپ کا اسکول جوائن کرے۔" انہوں نے اپنی بات دہرائی تو پرنسپل صاحب نے اک گہری سانس لی۔

"آپ نے اپنے دونوں بچوں کی طرح شروع سے ہی اسے یہاں داخل کیوں نہیں کروایا؟۔۔۔ انفیکٹ میرے تو آج ہی علم میں آیا ہے کہ آپ کی ایک اور بیٹی بھی ہے۔"

ان کی بات پہ جہاں صغیر صاحب پل بھر کو مشکل میں پڑ گئے وہیں اس کا دھیان بھی ٹیبل پہ رکھے پاکستان کے جھنڈے سے ہٹ کر ان کی جانب مبذول ہو گیا۔ اسکول کا ڈونر ہونے اور بچوں کے یہاں پڑھنے کی وجہ سے پرنسپل صاحب ان کے ساتھ ساتھ اسکول میں بچوں کے سلسلے میں زیب کی آمدورفت ہونے والی تھی تو ان کا کم از کم پرنسپل صاحب سے تعارف تو ضروری تھا۔

"ایسا ہے کہ ان کی مدر کی خواہش تھی کہ یہ اس سکول میں پڑھے۔" سوچ کر بولتے ہوئے وہ لحظہ بھر کو رکے تھے۔ "ایکچولی شی از مائی اسٹیپ ڈاٹر۔" پل کے توقف کے بعد انہوں نے قصداً انگلش میں جملہ کہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ ان کے ساتھ بیٹھے وجود نے "اسٹیپ ڈاٹر" پہ ٹھٹھک کے ان کی جانب دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی!" زیب کچن میں رات کے اس وقت اکیلی کھڑی چھوٹی کے لیے پانی ابال رہی تھیں۔ جب وہ خاموشی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔

"جی بیٹا۔" انہوں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا تھا جو اپنے رات کے پاجامہ سوٹ میں ننگے پاؤں شاید بستر سے اٹھ کر آئی تھی۔

"امی! آپ نے اور ڈیڈی نے تو کہا تھا کہ ہم سب ایک فیملی ہیں۔ پھر سنی بھائی مجھے سسٹر کے بجائے اسٹیپ سسٹر اور ڈیڈی خالی ڈاٹر کے بجائے اسٹیپ ڈاٹر کیوں کہتے ہیں؟" ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے بوجھل لہجے میں سوال کیا تو زیب بیگم کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور نظریں اس کے معصوم پریشان چہرے پہ جم سی گئیں۔

"بتائیں نا امی۔۔۔ کیا میں واقعی سنڈریلا کی گندی اور بری بہنوں جیسی ہوں جو یہ لوگ مجھے "اسٹیپ" کہتے ہیں؟" ان کی خاموشی پہ وہ بے چینی سے دو قدم آگے آئی تو زیب نے دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتے ہوئے اسے خود سے لگا لیا۔

"نہیں میری جان! ایسا بالکل نہیں ہے۔ آپ بہت اچھی بہت پیاری ہو بیٹا!" ان کی آواز کوشش کے باوجود بھر آئی تھی۔

"پھر یہ سب مجھے "اسٹیپ" کیوں کہتے ہیں؟" وہ زور لگا کے ان کے بازوؤں سے نکلی تھی۔ اس کی تکرار پہ زیب کے ذہن سے ایک ایک کر کے سارے مناسب لفظ کہیں دور بھاگ نکلے تھے۔ نجانے دنیا بہت سی چیزوں کو اتنے کڑوے کسیلے نام کیوں دے دیتی ہے کہ پھر اگر کوئی چاہے بھی تو ان کے تلخ معنوں کو کسی بھی محبت بھرے لفظ کی چاشنی سے کم نہیں کر سکتا۔ ان کا نام ہی ان کا تعارف ہوتا ہے۔۔۔ نام لیا خاکہ واضح! پھر چاہے کوئی اس خاکے سے دور تک میل نہ کھاتا ہو، اسے اس لیبل کی تلخی کو تاعمر جھیلنا پڑتا ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مہر ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ اپنی کزن جائشہ کی منگنی کی تقریب میں اس لیے شرکت نہیں کرنا چاہتی کہ وہ حنان سے سامنا نہیں چاہتی جو جائشہ کا بھائی ہے۔ یہ جان کر حنان ملک سے باہر ہے۔ وہ تقریب میں شرکت کے لیے چلی جاتی ہے ۔ لیکن حنان وہاں آجاتا ہے۔ مہر اسے دیکھ کر اپنے گھر واپس آنے کے لیے نکلتی ہے تو حنان سے سامنا ہوتا ہے۔ مہر کے نفرت بھرے رویے پر وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس توہین کو معاف نہیں کرے گا۔ حنان' زیب بیگم اور صغیر صاحب پر زور دیتا ہے کہ اب مہر کی زندگی کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ وہ کب تک اس طرح کی زندگی گزارتی رہے گی۔ مہر کا نکاح بچپن میں ہوچکا ہے۔

انجم بیگم اور زیب بیگم دونوں بہنیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ مہر کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہو' لیکن صغیر صاحب اس کے لیے راضی نہیں۔ زیب بیگم کو حنان کے گندے کردار کا بھی اندازہ ہے۔

سیم اپنے ماں' باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ نازو نعم میں پرورش پائی۔ اس کی زندگی کی اولین ترجیح دولت ہے۔ وہ امریکہ میں تنہا رہتا ہے اور اپنی ذاتی فرم کا مالک ہے جس میں اس کا دوست مارک شریک ہے۔ وہ آزاد زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے

سوزی سے اپنی پسند سے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک بار گرل لورین اس کی زندگی میں آئی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتی ہے۔ پھر ایک دن اس کے فلیٹ کا صفایا کرکے اس کو کچرے کے ڈھیر پر پھنکوا دیتی ہے۔ زمین پر اس کے وجود پر ٹھوکریں مارتی ہے۔ سیم ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی آنکھ اسپتال میں کھلتی ہے۔ اس کا پارٹنر اور دوست مارک اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

سیم پر اس حادثے کا گہرا اثر ہے۔ وہ گم صم ہے۔ اسے بار بار وہ خواب یاد آتا ہے جو اس نے بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ تاریک انجان گلیوں میں دو بھوکے کتے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ وہ چلا چلا کر مدد مانگ رہا ہے لیکن سب دروازے بند ہیں۔ تب اچانک ایک دروازہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن اندر نہیں جاتا۔ دوبارہ بھاگنے لگتا ہے۔ تب وہ کچرے کے ڈھیر پر جا گرتا ہے اور تیز بدبو اس کی ناک اور منہ میں گھسنے لگتی ہے۔

اس حادثے کے بعد سیم پہلی بار اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور تب اس کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ کس پناہ گاہ کے دروازے کو کھلا چھوڑ آیا ہے؟

تیسری قسط

مگر وہ اپنی بیٹی کے بچپن کو ان تلخیوں کے سپرد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ سگے سوتیلے کے کڑواہٹوں بھرے چکر میں پڑ کے نا صرف اپنی شخصیت کھو دے۔ اسی لیے انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس لفظ کے مثبت متبادل نہیں بلکہ مثبت معنی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یہاں آؤ میری جان۔" اس کا ہاتھ تھامے وہ اسے کچن میں ہی ایک جانب رکھی کرسیوں میں سے ایک پر لے کے بیٹھ گئی تھیں۔ "ایک بات یاد رکھنا بیٹا۔ اسٹیپ سسٹر یا اسٹیپ ڈاٹر ہونا کوئی بری بات نہیں ہے۔ بُری بات ہوتی ہے کہ آپ سنڈریلا کی بہنوں کی طرح ایک گندی اسٹیپ سسٹر ہوں ایک بُری انسان ہوں۔ کسی کو آپ کی وجہ سے دکھ پہنچے یا تکلیف ہو یہ غلط بات ہوتی ہے میری جان۔"

"مگر امی! یہ اسٹیپ ہوتا کیا ہے؟" ان کی گود میں بیٹھے اس نے منہ اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"کچھ نہیں ہوتا بیٹا۔ بس جب آپ کی امی یا ابو میں سے کوئی ایک آپ کے پاس نہیں رہتا اور ان کی جگہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایک نئی امی یا نئے ابو دے دیتے ہیں تو پھر ان کے ساتھ جو آپ کا رشتہ ہوتا ہے وہ اسٹیپ ہوتا ہے۔"

"آپ نے بس ہمیشہ ایک اچھی بہن اور ڈیڈی کی پیاری بیٹی بن کر رہنا ہے۔ آپ نے جاثی اور چھوٹی کا ہمیشہ خیال رکھنا ہے۔ رکھو گی ناں؟" اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"جی۔" اس کی معصوم آنکھوں کی چمک پھر سے لوٹ آئی تھی۔

"شاباش! مجھے پتا تھا میری بیٹی میری بات ضرور مانے گی۔" اسے خود میں سموتے ہوئے انہوں نے بے اختیار اس کا سر چوما تھا۔

ان کا یہ مان اور اعتبار غلط ثابت نہ ہوا تھا۔ ان کی تینوں بیٹیوں میں بے مثال پیار تھا۔ وقت چند سال آگے سرکا تھا۔ زینب اور صغیر صاحب کی محبت اور محنت رنگ لائی تھی۔ مگر صرف بچیوں کی حد تک۔

سنی جوں جوں بڑا ہوتا گیا تھا۔ اس کی ذات میں آنے والی خود مختاری' اُسے زیب سے مزید دور کرتی چلی گئی تھی۔ ان دونوں ماں بیٹی کے لیے سنی کی سرد مہری اور ناگواری میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

وہ احمد حسن اور زیب احمد کی بیٹی "مہر احمد" کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھا....

☆ ☆ ☆

سنی نے انٹر کا امتحان شان دار نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اس کی کامیابی کی خوشی میں صغیر صاحب اور زیب نے اپنے پورے خاندان اور سنی کے دوستوں کی فیملیز کو کھانے پر انوائیٹ کیا تھا۔ دعوت چونکہ آج رات کی تھی' اس لیے "قاضی ولا" میں صبح سے ہی خاصی ہلچل تھی۔

نیچے کے پورشن کی اپنی نگرانی میں صفائی کروانے کے بعد مہر سکینہ کے ساتھ اوپر چلی آئی تھی۔

سکینہ کو اپنے کمرے کی صفائی کا کہہ کر وہ سنی کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ دستک دے کر وہ چند ثانیے رکی تھی مگر جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ تو اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کے اندر جھانکا اور کمرہ خالی دیکھ کے اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

"سکینہ آنٹی! آپ پہلے ادھر آجائیں۔ بھائی کا کمرہ خالی ہے۔" پلٹ کر ملازمہ کو پکارتے ہوئے وہ دروازہ کھول کے اندر چلی آئی تھی۔ ادھر ادھر بکھری چیزوں کو اپنی سمجھ کے مطابق ان کی جگہ پہ رکھتے ہوئے وہ ملازمہ سے صفائی کروا رہی تھی جب اسٹڈی ٹیبل پہ رکھے کچھ نوٹوں اور سنی کی گھڑی پر اس کی نظر پڑی تھی۔

اس نے زیب کو ملازموں کی موجودگی میں ہمیشہ قیمتی چیزوں اور نقدی کو باحفاظت رکھتے دیکھا تھا۔ اب جو سنی کے پیسے اور گھڑی اسے یوں لاپروائی سے رکھے نظر آئے تو اس نے میکانکی انداز میں انہیں اٹھا لیا اور اس کی الماری کی جانب چلی آئی۔

الماری کھول کر وہ ہاتھ میں پکڑی دونوں چیزیں اندر رکھ رہی تھی جب کمرے کا دروازہ اچانک کھلا تھا اور سنی اپنے دھیان میں اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر الماری کھولے کھڑی ماہم پہ پڑی تھی وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ پہ رک گیا تھا۔ تب ہی مہر نے بھی پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا اور سنی کو کمرے میں پا کے وہ بری طرح گھبرا گئی تھی اس نے تیزی سے مڑ کے الماری بند کی تھی۔ لیکن تب تک غصے سے کھولتا سنی اس کے سر پہ آپہنچا تھا۔

"کیا کر رہی تھیں تم؟ ہاں؟" اس کی گھورتی نگاہوں نے بے اختیار مہر کو خائف کر دیا تھا۔ ملازمہ بھی ہاتھ روک کے ان دونوں کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

"میں آپ کے کمرے کی صفائی کروا رہی تھی بھائی! وہ ٹیبل پہ آپ کی...."

"صفائی کروا رہی تھیں یا صفایا کر رہی تھیں؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے سنی نے مشتعل لہجے میں کہتے ہوئے مزید آنکھیں نکالیں تو مہر اس الزام پر پلکیں جھپکنا تک بھول گئی۔

"سنی بھائی!" مارے دکھ اور بے یقینی کے اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"میرے ساتھ یہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس کے آنسوؤں کو غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بے اختیار آگے بڑھا تو مہر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

سنی کے تیور دیکھ کے سکینہ سرعت سے دونوں بچوں کی طرف چلی آئی۔

"سنی صاحب! مہر بیٹا نے کچھ نہیں کیا۔ وہ تو صرف بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔"

"کس کی اجازت سے؟" وہ یک لخت دھاڑا تو سکینہ بھی گھبرا کے چپ ہو گئی۔ "میں نے ہزار بار اسے منع کیا ہے کہ میرے کمرے میں نہ آیا کرے۔ لیکن یہ۔" وہ دانت پیستے ہوئے پل بھر کو رک کر مہر کو گھورنے لگا۔ "اپنی ماں کی طرح ڈھیٹ ہے۔"

"سنی بھائی!" اس کے طرز تخاطب نے روتی ہوئی

مہر کو جھلسا دیا تھا۔

"آواز نیچی کرو۔ تمہارے باپ کا نہیں' یہ میرا گھر ہے۔" اور مہر کے چھوٹے سے دل کی حد جواب دے گئی تھی۔ ملازمہ کے سامنے اس درجہ ذلت اسے پھوٹ پھوٹ کے رونے پر مجبور کر گئی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھی تھی لیکن دہلیز پہ زیب کو ایستادہ دیکھ کے اس کے آنسوؤں میں شدت در آئی تھی۔ بے اختیار وہ بھاگ کر ماں سے آلپٹی تھی۔

اپنے سینے سے لگائے زیب نے فہمائشی نظروں سے سنی کو دیکھا تھا۔ جو اچانک انہیں اپنے سامنے پا کے خفیف سا ہو گیا تھا۔

"سکینہ! تم جاؤ یہاں سے۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آج سنی کے الفاظ پر آگے بڑھ کر اس کے منہ پہ لگائیں۔ لیکن انہوں نے کمال حوصلے سے خود پر قابو پاتے ہوئے پہلے ملازمہ کو وہاں سے باہر کیا تھا۔

"آج تم نے بدتمیزی کی حد پار کر لی ہے سنی۔" اسے دیکھتے ہوئے وہ سپاٹ لہجے میں بولیں تو چند لمحوں کی شرمندگی کے بعد وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ میں نے صرف وہی کہا ہے جو سچ ہے۔" ڈھٹائی اور بے خوفی سے ان کی جانب دیکھتا وہ زیب کو صحیح معنوں میں آگ لگا گیا تھا۔

"اپنے بے ہودہ سچ اپنے پاس رکھو سمجھے! اور دوبارہ اگر گھر میں اس قسم کی بکواس کی تو میں تمہارے ڈیڈ کو بتانے میں ایک لمحہ نہیں لگاؤں گی" انگلی اٹھائے انہوں نے سختی سے اسے متنبہ کیا۔

"جائیں بتائیں میں کوئی ان سے ڈرتا ہوں کیا۔" وہ دوبدو بولا۔

"سنی!" مہر کو ایک جھٹکے سے ہٹاتی وہ آگے بڑھیں تو سنی بے اختیار چپ ہو گیا۔

"اپنے ڈیڈی کے بارے میں اگر تم نے اس بدتمیزی سے دوبارہ بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" گھورتے ہوئے وہ انتہائی سختی سے بولیں۔ وہ تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کر رہے اور تم؟... تم واقعی اس لائق نہیں ہو کہ کوئی تم سے بات بھی کرے سنی۔"

"نہ کرے۔ بالکل بھی نہ کرے۔ مجھے ویسے بھی کسی کی ضرورت نہیں۔" مارے غصے کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کی زبان درازی زیب کو خاموش ہونے پر مجبور کر گئی تھی۔ مزید کچھ کہے بنا جانے کے لیے پلٹی تھیں کہ سنی کی آواز نے ان کے قدموں کی رفتار دھیمی کر دی تھی۔

"ایک بات اور آج کے بعد مجھے کوئی سنی نہیں کہے گا۔ میں صرف اپنی مما کا سنی تھا۔ آپ سب کے لیے میں حنان ہوں۔ صرف حنان!" اور زیب لب بھینچے مہر کو ساتھ لگائے کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

باسکٹ بال کا میچ اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ اسکور بورڈ پہ دونوں ٹیموں کا اسکور برابر چل رہا تھا۔ ایسے میں دونوں کو ایک ایک پوائنٹ کی اشد ضرورت تھی۔ اردگرد بیٹھے مہمان اور میزبان کالجوں کے سپورٹر اسٹوڈنٹس کا جوش و ولولہ ان آخری لمحات میں اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ ایسے میں جب اس کے ساتھی نے اسے بال پاس کیا اور وہ مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کو ڈاج کرتا ان کے درمیان میں سے مہارت سے بال نکال کر باسکٹ کی جانب بڑھا تو سارا کورٹ تالیوں اور شور سے گونجنے لگا۔

"گو سیم گو!" سائیڈ لائن پہ کھڑی اس کے کالج کی لیڈرز نے ناچتے ہوئے اس کے نام کا نعرہ بلند کیا تو ان کے سارے سپورٹرز شامل آواز ہو گئے۔

ان نعروں نے اس کے لہو کو مزید گرما دیا۔ وہ اور جوش سے آگے بڑھنے لگا۔ اس کے اور باسکٹ کے درمیان دو کھلاڑی مزید رہ گئے تھے۔ یکایک اس نے بال کو ایک زوردار ٹپا دے کر خود کو ہوا میں اچھالا تھا۔ بال اس کے ہاتھ سے نکل کر' کھلاڑیوں کے اوپر سے گزرتی باسکٹ کے بیچ میں سے گزر گئی تھی۔ تب ہی

میچ کا اختتامی بزر زور و شور سے بجنے لگا تھا۔ اس کے ساتھی کھلاڑی دیوانہ وار اس کی جانب بھاگے تھے اور کچھ یہی حال شائقین کا بھی ہوا تھا۔ لڑکوں نے اسے کندھوں پہ اٹھا لیا تھا۔ اردگرد تالیاں بجائی جا رہی تھیں۔ نعرے لگ رہے تھے۔ ایسے رنگا رنگ اور پرجوش ماحول میں اس کے ماں باپ کی خوشی دیدنی تھی۔

"آئی ایم پراؤڈ آف مائی سن۔ دیکھو اپنے فیلوز کے درمیان کیسے ہیرو بنا ہوا ہے۔" کورٹ پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس کے باپ نے ہنستے ہوئے ساتھ کھڑی بیوی کی طرف دیکھا تھا۔ جو خود بھی دور کھڑے بیٹے کو نہار رہی تھیں۔

"وہ ہے ہی ہیرو.... خدا میرے بچے کو نظر بد سے بچائے۔ ہم بھی چلیں نیچے؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

"ہاں، ہاں چلو۔" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھے تھے لیکن ابھی چند قدم ہی چلے تھے جب وہ انہیں اسٹوڈنٹس کے جمگھٹے سے نکل کر سائیڈ لائن کی طرف آتا دکھائی دیا تھا۔

"وہ خود ہی آ رہا ہے ہمارے پاس۔" مسکراتے ہوئے اس کے باپ کی نظریں اس پر جم گئی تھیں۔ جو بے چینی سے قدم اٹھاتا آگے آ رہا تھا۔ اس کی ماں کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔ وہ بغور اپنے لاڈلے کو تک رہی تھیں جو چلتا ہوا لوگوں کے درمیان کھڑی منی اسکرٹ اور انتہائی مختصر بلاؤز میں ملبوس سنہری بالوں والی، ایک خوب صورت سی لڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ نجانے کیوں اس کی ماں کی مسکراہٹ پھیکی پڑنے لگی تھی اور پلکیں جنبش کرنا بھول گئی تھیں۔

ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے بیٹے نے اس لڑکی کو اپنی بانہوں میں لے لیا تھا اور پھر اس کے چہرے پہ جھک گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

گھر میں ہونے والی تقریب کے پیش نظر زیب نے

صغیر صاحب کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہاں لیکن بری طرح روتی اور اکھڑی ہوئی مہر کو انہوں نے بامشکل تمام چپ کروا کے رات کی تقریب کے لیے منایا تھا جو کسی طور حنان کے فنکشن میں شرکت کے لیے تیار نہ تھی۔

ماں کی زور زبردستی اور جاشی کی منتوں پہ اس نے فقط کپڑے تبدیل کر کے بال بنائے تھے۔

سنی کا اپنے ساتھ ناروا سلوک تو وہ اپنے بچپن سے جھیلتی آئی تھی۔ لیکن آج جو تحقیر کا احساس اس کے انداز اور الفاظ نے مہر کے اندر جگایا تھا۔ اس نے مہر کو بہت گہری چوٹ پہنچائی تھی۔

"ارے میری بیٹی ابھی تک تیار نہیں ہوئی؟" دروازے پہ دستک کے بعد صغیر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تھے اور مہر کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں آئینے کے آگے بیٹھا دیکھ کے اپنی جگہ پہ رک گئے تھے۔ انہیں روبرو پا کر مہر سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تیار ہوں ڈیڈی۔" ان کی طرف دیکھتی وہ بامشکل تمام مسکرائی تو صغیر صاحب کی نظر اس کے سادہ سے حلیے سے ہوتی اس کے ستے ہوئے چہرے پہ آ ٹھہری۔

"آپ روئی ہو مہر؟" بغور اسے دیکھتے وہ آگے آئے۔

"نہیں ڈیڈی! مجھے صبح سے فلو کی شکایت ہو رہی ہے۔" اس نے نوک زبان پہ مچلتے سچ کو زبردستی پیچھے دھکیلتے ہوئے ماں کا سمجھایا ہوا سبق دہرایا۔

"اوہو... دوائی ہے آپ نے؟" انہوں نے پریشانی سے اس کی پیشانی چھوئی۔ "اس وقت تو بخار نہیں ہے۔"

"جی لی تھی ٹیبلٹ اسی لیے طبیعت ٹھیک ہے اب۔" وہ قصداً مسکرائی۔

"چلو پھر نیچے چلتے ہیں۔ سارے مہمان آ چکے ہیں۔" انہوں نے اس کے شانے کے گرد بازو پھیلایا تو جاشی نے جھٹ سے ان کا دوسرا بازو تھام لیا۔

مسکراتے ہوئے دونوں بیٹیوں کے ہمراہ باہر لان میں آئے تو بے اختیار ہی کتنی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔

"یہ تیرے ڈیڈی کے ساتھ کون ہے یار؟" حنان کے دوست علی نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے دلچسپی سے سامنے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو زید سے بات کرتے حنان نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور صغیر صاحب کے پہلو میں کھڑی مہر کو دیکھ کے اس کا منہ بن گیا۔

"کوئی نہیں ہے یار۔" بے زاری سے کہتے ہوئے اس نے رخ پھیرا۔

"اتنی حسین لڑکی اور تو منہ بنا رہا ہے؟" علی نے تعجب سے اسے دیکھا۔ تو سارا گروپ مارے تجسس کے مہر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"واقعی یار۔ شی از ویری بیوٹی فل!" ارحم نے علی کی تائید کی۔

"کوئی بیوٹی فل نہیں۔ میری اسٹیپ مدر کی پہلی بیٹی ہے یہ۔ اینڈ آئی جسٹ ہیٹ ہر!"

"او! تو یہ وجہ ہے تیری ناپسندیدگی کی۔" علی کی مسکراتی نگاہیں حنان پہ آ ٹھہریں "ایک بات بتا تو کب بڑا ہو گا؟" اس نے مذاق اڑاتے لہجے میں سوال کیا تو حنان کی نظروں میں ناگواری اتر آئی۔

"فضول بکواس نہ کر۔" اس نے غصے سے علی کو دیکھا۔

"بکواس نہیں کر رہا، صحیح کہہ رہا ہوں... تو ایک خوب صورت لڑکی کو صرف اس لیے خوب صورت نہیں مان رہا کہ وہ تیری اسٹیپ مدر کی بیٹی ہے۔ بچپنا نہیں تو اور کیا ہے یار۔" علی نے وضاحت کی۔

"قسم سے اگر میری اتنی حسین دشمن ہوتی اور وہ میرے گھر میں رہتی ہوتی تو میں کبھی بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

ارحم کی بات پہ نہ چاہتے ہوئے بھی حنان کی نگاہ مہمانوں کے درمیان گھومتی مہر پہ جا ٹھہری جو باٹل گرین فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ضرورت سے زیادہ ہی گلابی لگ رہی تھی۔

"اور نہیں تو کیا دشمنی کی دشمنی اور مزے کے مزے ہو جاتے۔" زید نے ہنستے ہوئے لقمہ دیا تو مہر کو

تلملا حنان بری طرح چونک گیا۔
"کبھی کبھی تو بھی عقل مندی کی بات کر جاتا ہے زید ریاض۔" حنان نے مسکراتے ہوئے کہا تو زید نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب اچھا آئیڈیا ہے یہ دشمنی نکالنے کا۔۔۔ خاصا رنگین اور دلچسپ!" اس نے دور کھڑی مہر کے وجود کو سراپا ایک نئی نظر سے دیکھا۔
"ڈونٹ ٹیل می کہ تو سیریس ہے۔" علی کرسی پہ آگے کو ہوا۔
"کیوں نہیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔" اس نے مہر سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے علی کو دیکھا۔
"حرج ہے۔ تیرے ڈیڈی کو پتا چلا تو ساری دشمنی ناک کے راستے نکال دیں گے تیری!" علی کے استہزائیہ انداز پہ حنان کے چہرے پہ سنجیدگی پھیل گئی۔
"مجھے اتنی سی بھی پروا نہیں۔ یہ ماں بیٹی مجھ سے ڈریں، مجھ سے خوف کھائیں۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر سکون کا احساس اور کوئی نہیں۔" اس کے لہجے کی بے خوفی اور آنکھوں کے تنفر نے وہاں بیٹھے تینوں لڑکوں پہ سکوت ساطاری کر دیا۔
وہ اپنے اندر، اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی کے لیے کس درجے کی نفرت لیے ہوئے تھا، اس حقیقت کا ادراک انہیں اسی پل ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے گھر آئے دس سے پندرہ منٹ ہوئے تھے اور ان پندرہ منٹوں میں اسے اپنی غلطی کے فاش ہونے کا احساس کوئی بیسیوں بار ہو چکا تھا۔
میچ کے بعد دوستوں کے ساتھ کی گئی تین چار گھنٹے کی سیلیبریشن کا سارا مزا دھواں بن کر اڑ گیا تھا اور اس وقت وہ آنسو بہاتی ماں اور گرجتے برستے باپ کے درمیان کھڑا انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں بابا! وہ میری اچھی فرینڈ ہے۔ میں نے اسے صرف گلے لگایا تھا لیکن اس نے آگے سے مجھے ۔۔۔" باپ کے گھورنے پہ وہ بے اختیار جھجک کے خاموش ہو گیا۔
"میں نے تم سے کہا تھا ہنی میرے اعتبار کو ٹھیس مت پہنچانا مگر تم نے ۔۔۔"
"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا بابا۔ یہ یہاں کا ٹرینڈ ہے۔" اس نے بے زاری سے ان کی بات کاٹی۔
"تم یہ کیوں بھول گئے ہنی کہ تمہاری ذات کسی سے منسوب ہے۔ یو آر آ میرڈ مین!"
"ایکسکیوز می! میں میرڈ نہیں بلکہ چائلڈ میرج کیس ہوں۔ شادی کے نام پہ جو مذاق آپ لوگوں نے میرے ساتھ کیا ہے وہ مجھے کسی طور قبول نہیں!" اندر ہی اندر کھولتے ہوئے اس کے جی میں آیا تھا کہ وہ یہ حقیقت اپنے دقیانوسی ماں باپ کے منہ پہ دے مارے مگر فی الوقت وہ اتنی جرات دکھانے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔
"او کے آئی ایم سوری۔۔۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔" اس لیکچر بازی سے جان چھڑانے کا اسے اس وقت یہی طریقہ سوجھا تھا۔ لیکن اسے اندازہ نہ تھا کہ اس کے چہرے پہ چھائی بے زاری کو اس کی ماں نے بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ کچھ غلط ہو جانے کا ہولناک احساس ان کے اندر پکڑ دھکڑ مچانے لگا تھا۔
"ایک بات یاد رکھنا ہنی۔ تم ایک مسلم ہو۔ تمہارے مذہب نے تمہارے لیے کچھ حدیں (Limits) رکھی ہیں۔ جنہیں تم کسی بھی حال میں پار نہیں کر سکتے۔" اس کے باپ نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائی۔
"آئی نو۔" وہ منہ بناتا صوفے پہ گر سا گیا۔ اس کے باپ نے اک گہری سانس لی اور کچھ سوچتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھے۔
"برائی میں بہت کشش ہوتی ہے بیٹا! اس سے دور رہنا بہت بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا بیٹا صرف "آن دا فیلڈ" ہی ہیرو نہیں بلکہ

"آف دا فیلڈ" بھی ہیرو ہے۔ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔"

رسان سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی تو ایک لمحے کو وہ ساری برائیاں اس کے ذہن میں گھوم گئیں جو وہ آف دا فیلڈ اپنے ماں باپ سے چھپ چھپ کے کرتا رہا تھا اور کر رہا تھا۔ جن کی اسے لت لگ چکی تھی۔ اور جن کے بارے میں اسے اس پل سوچ کر شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

"آئندہ کوئی بھی غلط کام کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ تم سیم نہیں بلکہ ثمروز ابراہیم ہو۔ ابراہیم ملک اور انجم ابراہیم کی ریاضتوں اور دعاؤں کا اکلوتا ثمر۔ ہماری امیدوں کا واحد مرکز اور مجھے یقین ہے کہ تم ہماری امیدوں کو نہیں توڑو گے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے مان سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو ثمروز کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

"میں پوری کوشش کروں گا بابا۔" اس نے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ ابراہیم ملک کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اتنی ڈری سہمی کوشش سے کام نہیں چلے گا ینگ مین۔ تمہیں مضبوط ہونا پڑے گا۔ قدم قدم پہ بکھری برائی کو دیکھ کر اپنے اندر سر اٹھاتی خواہشات کو کچلنا قطعی آسان کام نہیں۔ لیکن جو لوگ یہ پل صراط' بنا ڈگمگائے پار کر جاتے ہیں نا بیٹا' وہی حقیقی سورما اور اصل ہیروز ہوتے ہیں۔ زندگی اپنے اصل رموز ایسے ہی قابل فخر لوگوں پر کھولتی ہے۔ وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے نا۔

ٹوٹتا ہے جب جام آرزو
تب در آگاہی کھلتا ہے۔

"کیا مطلب؟" بغور ان کی ناقابل فہم باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے سیم کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"جس دن اپنی آرزوؤں' اپنی خواہشات کے پیالے کو توڑ دو گے' اس دن زندگی تم پر حقیقت کے دروازے کھول دے گی۔" اور وہ ناسمجھی کے عالم میں ان کا چہرہ تکنے لگا تھا۔

"پلیز بابا' میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ بے چارگی سے بولا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے ابراہیم صاحب کو مسکرانے پہ مجبور کر دیا۔

"آجائے گا۔" انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"بس تم وعدہ کرو کہ تم اس معاشرے میں پھیلی گندگی سے خود کو بچانے کی صرف کوشش نہیں بلکہ بھرپور کوشش کرو گے۔"

"اوکے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔" ان کی باتوں کے زیر اثر اس نے میکانکی انداز میں اپنا عہد اپنے باپ کے پھیلے ہوئے ہاتھ پہ رکھ دیا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ وعدے برف کے گولوں کی طرح ہوتے ہیں' جنہیں بنانا بہت آسان لیکن سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

حنان جم سے واپس آیا تو گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ وہ اوپر کے پورشن کا ایک چکر لگا کے لاؤنج میں آ کھڑا ہوا تھا۔ کچن سے کھٹر پٹر کی آواز پہ اس کا دھیان ملازمہ کی طرف گیا تھا۔

"سکینہ!" اس نے وہیں سے آواز دی تھی۔ لیکن سکینہ کو کچن کے بجائے اسٹڈی سے برآمد ہوتا دیکھ کے وہ چونک گیا تھا۔

"تم یہاں ہو تو کچن میں کون ہے؟"

"مہر بیٹا ہے سنی صاحب۔" اور مہر کی موجودگی کا سن کے اس کے دل میں ایک چنگاری سی روشن ہو گئی تھی۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" اس نے ایک نظر کچن کی طرف دیکھا۔

"جاشی بی بی تو ٹیوشن گئی ہیں۔ اور بیگم صاحبہ' صاحب جی کے ساتھ نویرہ بیٹا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔" اس کی بات پہ حنان کو یاد آیا کہ نویرہ کو صبح سے بخار تھا۔ سب کی غیر موجودگی کے احساس نے یک لخت حنان کے اندر ایک کمینہ سا اطمینان پھیلا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اس کی اجازت پا کے سکینہ داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ جونہی اس کے

پیچھے دروازہ بند ہوا تھا۔ حنان کے لبوں پہ ایک کاٹ دار مسکراہٹ اپنی چھب دکھا کے غائب ہو گئی تھی۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا کچن کے دروازے میں آ کھڑا ہوا تھا۔

مہر کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ کوکنگ رینج کے آگے کھڑی کچھ بناتے ہوئے دھیمی آواز میں گنگنا رہی تھی۔ حنان نے ایک گہری نظر اس کی پشت پہ جھولتی نرم چمکیلی چوٹی پر ڈالی تھی۔

"ذرا اونچی آواز میں گاؤ۔ میں بھی تو سنوں، کیسی آواز ہے تمہاری۔" اور اپنے دھیان میں کھڑی مہر، حنان کی اچانک مداخلت پہ، بری طرح ڈر کر اچھلی تھی۔

دھک دھک کرتے دل پہ ہاتھ رکھے وہ سرعت سے پلٹی تھی اور دروازے میں حنان کو استہزائیہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے کھڑا دیکھ کے اس کے چہرے پہ ناگواری پھیلی تھی۔ وہ پارٹی والے دن سے اس سے کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے تھی۔

"ابھی سے ڈر گئیں؟" اس کے رنگ بدلتے چہرے کو بغور تکتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولا تو مہر بنا کوئی جواب دیے رُخ موڑ گئی۔ اس کی یہ بے نیازی حنان کو سلگا گئی۔

"ایک جگ شیک بناؤ میرے لیے۔" وہ حکمیہ انداز میں کہتا کچن میں رکھی چھوٹی میز اور کرسیوں کی جانب بڑھا۔

"میں چپس بنا رہی ہوں۔ آپ سکینہ سے کہہ دیں۔" اس کے انداز نے مہر کو کھولا ہی تو دیا تھا۔ وہ اپنا غصہ دبائے بے تاثر لہجے میں بولی تو حنان کے بڑھتے قدم رک گئے۔ اس نے تیز نظروں سے مہر کو دیکھا۔

"میرے لیے تم ہی سکینہ ہو۔" اور مہر کا پورا وجود اہانت کے احساس سے جل اٹھا تھا۔ اس نے پلٹ کر غصیلی نظروں سے حنان کی جانب دیکھا۔

"میں چپس بنا رہی ہوں۔" وہ مضبوط لہجے میں کہتی پلٹ کر فرائنگ پین میں چمچ چلانے لگی تو حنان کا چہرہ سرخ ہو گیا، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے سر پہ آ کھڑا ہوا۔ اسے یوں اپنے قریب آتا دیکھ کے مہر بے اختیار ڈر کر دو قدم پیچھے کو ہٹی تھی۔ اسی وقت حنان نے ہاتھ بڑھا کر چولہا بند کر دیا۔

"اب بناؤ چپس۔" اس نے چپس کو چبا کر ادا کرتے ہوئے مہر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو در آئے۔

"سنی بھائی! آپ کیوں۔"

"شیک بناؤ!" وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ مہر پورے وجود سے کانپ گئی۔

اگلے ہی لمحے وہ آنسو بہاتی، کاؤنٹر پہ رکھی فروٹ باسکٹ کی طرف بڑھ گئی تھی اور حنان اسے فاتحانہ نگاہوں سے دیکھتا، ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک پر جا کے بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نظریں مسلسل گھٹ گھٹ کے روتی ہوئی مہر پہ جمی تھیں۔

دس منٹ بعد اس نے شیک کا جگ اور گلاس لا کے حنان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"یہاں بیٹھ کر مجھے ڈال کر دو۔" اور مہر کی آنکھوں میں بے بسی پھیل گئی تھی۔ جگ اٹھا کے اس نے گلاس بھرا تھا اور حنان کے کرسی کی طرف اشارہ کرنے پہ وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی تھی۔ اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اس سے چھپانے کو مہر نے بے اختیار جھکالی تھیں۔ یہ جانے بغیر کہ اس کے روئے ہوئے چہرے پر گہری نم پلکوں کی جھالر اور کپکپاتے لبوں کی سرخی نے ایک پل کو حنان کو سچ میں مبہوت کر دیا تھا۔ وہ گم صم سا اسے کتنے ہی لمحے دیکھے گیا تھا۔ اور پھر ہاتھ بڑھا کے اس نے گلاس اٹھا لیا تھا۔

گلاس ختم کر کے اس نے ٹیبل پہ رکھا تو مہر نے میکانکی انداز میں جگ اٹھا لیا تھا، حنان کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اس کے لمبی لمبی انگلیوں سے سجے نرم و نازک ہاتھوں پر آ ٹھہری تھیں۔

"ہاتھوں میں خاصا ذائقہ ہے تمہارے۔" اس نے ذو معنی لہجے میں کہتے ہوئے مہر کی طرف دیکھا تو وہ نا سمجھی کے عالم میں اپنی روئی ہوئی آنکھیں حنان کے چہرے پہ جما گئی اور حنان کا دل بے اختیار ڈول گیا۔

"اچھا شیک بنایا ہے۔" اس کے چہرے پر نظریں

گاڑے حنان نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا تو مہر کو تھوڑا حوصلہ ہوا۔

"میرے چپس۔"

"ہاں جاؤ۔" دوسری کرسی کی پشت پہ بازو پھیلائے اس نے شاہانہ انداز میں اجازت دی تو وہ سرعت سے اٹھ کر کوکنگ رینج کی جانب بڑھی۔ لیکن پین پہ نظر پڑتے ہی اس کا منہ اتر گیا۔ چپس ٹھیک ٹھاک جل چکے تھے۔ اسے ساکت کھڑا دیکھ کے حنان سمجھ گیا کہ چپس کا کام تمام ہو چکا ہے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"چچ چچ۔ یہ تو جل گئے سارے۔" اس کی بات پہ مہر کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئی تھیں۔ اس نے حنان کی طرف پلٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"آئندہ اگر مجھے انکار کرنے کی غلطی کی نا مہر احمد! تو تمہارے ہر کام کا یہی حشر کروں گا!" اس کی پشت پہ سے حنان کی سرد آواز ابھری تھی۔ اور پھر وہ پلٹ کر کچن سے باہر نکل گیا تھا۔

اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی مہر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

سات سال، پورے سات سال بعد انجم کو پاکستان جانے کی نوید سننے کو ملی تھی اور وہ مارے بے یقینی کے پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ کچھ یہی کیفیت ان کے برابر بیٹھے ہنی کی بھی تھی۔ مگر مارے شاک کے۔ وہ کھانے سے ہاتھ روکے باپ کو دم سادھے تک رہا تھا۔ جنہوں نے اپنے طور پہ اپنی فیملی کو ایک خوشگوار سرپرائز دیا تھا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں ابراہیم؟" انجم نے خوشی سے کانپتی آواز میں پوچھا تو ابراہیم صاحب ہنس پڑے۔

"ٹھیک بائیس دن بعد ہماری فلائٹ ہے۔" خوشگوار لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے ٹکٹ انجم کے ہاتھ پہ رکھ دیے تھے۔ اور ہنی کا مارے غصے کے برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے سامنے پڑی پلیٹ پیچھے دھکیل دی تھی۔

"آپ بھی بابا... کم از کم بتا تو دیتے کہ پاکستان جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔" اس نے بگڑے موڈ سے باپ کی طرف دیکھا۔ تو انجم ٹھٹک کر اس کا چہرہ تکنے لگیں۔

"کیوں کیا ہوا؟" ان کے برعکس ابراہیم صاحب نہ تو چونکے تھے اور نہ ہی انہوں نے اس کے خراب موڈ کو ٹھٹک کر غور سے دیکھا تھا۔ وہ بالکل نارمل لہجے میں بیٹے سے مخاطب ہوئے تھے۔

"پتا نہیں مجھے چھٹی ملے گی یا نہیں۔" باپ کے سوال پہ ہنی بے اختیار اٹکا تھا۔ اس کی بات پر جہاں انجم نے سکون بھری سانس لی تھی۔ وہیں ابراہیم صاحب بھی مسکرا دیے تھے۔

"مل جائے گی۔ تم پریشان مت ہو۔" اور ہنی بے بسی سے نگاہوں کا رخ پھیر گیا تھا۔

"یہی تو مجھے بھی ڈر ہے۔" کوفت سے سوچتے ہوئے اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان لوگوں کی پاکستان آمد کی اطلاع نے قاضی ولا میں رنگ بکھیر دیے تھے۔ خوشی کے مارے زیب بیگم کے پاؤں زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔ سات سال بعد وہ اپنے پیاروں سے ملنے والی تھیں۔

پہلے پانچ سال تو گرین کارڈ کے حصول کی نذر ہو گئے تھے۔ انہیں کہیں آئے جائے بغیر امریکہ میں پانچ سال کے لیے مستقل اپنی رہائش رکھنی تھی۔ جبکہ گزشتہ دو سال سے ابراہیم ملک اپنی کاروباری مصروفیات میں کچھ ایسے پھنسے تھے کہ چاہ کر بھی پاکستان آنے کا پروگرام نہ بنا پائے تھے۔

زیب بیگم نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ بچپن کے اس نکاح کے بارے میں مہر سے بات کی جائے۔

"تمہیں یاد ہے مہو۔ جب نانو زندہ تھیں تو ایک دن تمہیں اور ہنی کو بہت اچھے سے کپڑے پہنا کر بہت

بڑا فنکشن کیا تھا ہم نے۔" رات کو وہ مہر کے کمرے میں آئی تھیں۔

"جس دن وہ قاری صاحب بھی آئے تھے ناامی؟" وہ قدرے جوش سے بولی تو زیب دھیرے سے ہنس پڑیں۔

"وہ قاری نہیں، قاضی صاحب تھے بیٹا۔ اس دن انہوں نے تمہارا اور ہنی کا نکاح پڑھایا تھا۔"

"کیا؟" اس کی آنکھیں پھٹی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"ہاں میری جان۔ تم دونوں کا نکاح، نانو کی خواہش پہ بچپن میں ہی کر دیا تھا ہم نے۔" انہوں نے پیار سے اس کے چہرے پر جھولتی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑسیں۔ "آئی ایم سوری بیٹا۔ لیکن تم سے اب تک ذکر اس لیے نہیں کیا تھا کہ تم بغیر کسی ڈسٹربنس کے اپنا میٹرک کلیئر کر لو۔ تھوڑی سمجھ دار ہو جاؤ۔" انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ تو دم سادھے بیٹھی مہر نے اپنی ساکت پلکیں جھپکیں۔

"امی! لیکن یہ سب... او خدا۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

"جانتی ہوں کہ یہ تمہارے لیے بہت بڑا شاک ہے۔ لیکن بیٹا! انجم آپا نے بچپن میں ہی تمہیں ہنی کے لیے مانگ لیا تھا۔ پھر جب اماں کی طبیعت بہت زیادہ بگڑی تو مجبوراً" ہمیں ان کی خواہش کا احترام کرنا پڑا۔ وہ تم دونوں کی یہ خوشی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھیں۔" بات کرتے کرتے بے اختیار زیب بیگم کی آنکھیں بھر آئیں تو مہر نے پریشان نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھا۔

"ٹھیک ہے امی! آپ لوگوں نے جو مناسب سمجھا وہ کیا۔ لیکن امی مجھے بہت عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔" اس کے بے بسی سے کہنے پر زیب نے پیار سے اس کا گال سہلایا۔

"میں سمجھ سکتی ہوں جان کہ تم اس وقت کیا محسوس کر رہی ہو۔ لیکن پریشان مت ہو۔ میں نے اللہ کے حکم سے تمہارے لیے بہترین فیصلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ انجم آپا میری بہن نہیں بلکہ میری ماں کی جگہ ہیں۔ ان کی ذات پر مجھے خود سے زیادہ بھروسہ ہے۔ وہ تم سے کتنا پیار کرتی ہیں تم اچھی طرح جانتی ہو۔ رہا ہنی تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھی تمہیں پھولوں کی طرح رکھے گا۔"

اور بغور ان کی بات سنتی مہر نچلا لب دانتوں تلے دبائے نظریں جھکا گئی۔ "اور امی اگر ایسا نہ ہو سکا تو؟"

"اللہ نہ کرے۔ ہمیشہ اچھی بات سوچتے ہیں بیٹا۔ بیٹیوں کی قسمتیں تو ویسے بھی تقدیر کے ان دیکھے ہاتھوں میں چھپی ہوتی ہیں۔ بس میری دعا ہے کہ خدا میری تینوں بیٹیوں کا نصیب بہت اچھا، بہت بلند کرے۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے لگا لیا تھا اور نجانے اسے کیا ہوا تھا کہ وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔ اس کا رونا انہیں بھی جذباتی کر گیا تھا۔

"بس۔ بس میری جان۔" زیب نے اپنے بہتے آنسو سمیٹتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

"اس بات کو فی الحال اپنے تک ہی رکھنا۔ تمہارے ڈیڈی نہیں چاہتے کہ اس حوالے سے گھر میں ہر وقت بات ہو اور تمہاری پڑھائی ڈسٹرب ہو۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو صاف کیے تو مہر نے خالی الذہنی کے عالم میں دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

سیم کو کالج کی طرف سے صرف پندرہ دنوں کی چھٹیاں ملی تھیں۔ کیونکہ ٹھیک سولہویں دن ان کے کالج کی باسکٹ بال ٹیم آل اسٹیٹس ٹور کے لیے روانہ ہو رہی تھی اور ٹیم میں اس کی موجودگی لازمی تھی۔

"یہ دیکھو میں نے مہر کے لیے تمہاری طرف سے ڈائمنڈ رنگ لی ہے۔" انجم نے ہاتھ میں پکڑی ڈبیا کھول کے بیٹے کے سامنے کی تو سیم کا موڈ بری طرح آف ہو گیا۔

"اس... کی کیا ضرورت تھی مام۔" اس نے بمشکل تمام لفظ تماشے کو زبان پر آنے سے روکا۔

"کیوں ضرورت نہیں تھی۔ ویسے تو بڑے کلچرڈ

بنے پھرتے ہو۔ اپنی بیوی کے لیے کچھ لینا ہے۔ یہ نہیں پتا تمہیں!" انہوں نے فہمائشی نظروں سے اسے گھورا تو لفظ بیوی پہ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا خاموش ہو گیا۔

"تمہارے تیور، تمہاری بے نیازی سب میری نظروں میں ہے ہنی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم نے کسی ایسی ویسی حرکت کے بارے میں سوچا بھی تو میں مرتے دم تک تمہارا منہ نہیں دیکھوں گی!"

"کیسی فضول باتیں کر رہی ہیں۔ میں نے کبھی آپ کو کچھ کہا ہے؟" وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کہا نہیں لیکن کوئی انٹرسٹ بھی کبھی شو نہیں کیا۔"

"ہاں تو کیا میں سارا وقت اس کی تصویر سینے سے لگا کے پھرتا رہوں یا آپ کے پاس بیٹھا مہر مہر کرتا رہوں۔" وہ انتہائی بدتمیزی سے بولا تو انجم بیگم کا خون کھول گیا۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو ہنی؟"

"تو آپ جو غصہ دلانے والی باتیں کر رہی ہیں۔" وہ دو بدو بولا۔ انجم کی سخت نظریں دو منٹ کو اس کے چہرے پر جم سی گئیں۔

"میں نے تو کوئی غلط بات نہیں کی۔ ہاں تمہیں کیوں اتنا غصہ آ رہا ہے یہ غور طلب بات ضرور ہے۔" ان کی نگاہوں کے جتاتے تاثر نے ہنی کا خون کھولا دیا۔

"آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" اس کے تپ کر نگاہوں کا زاویہ بدلنے پر انجم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"سو دفعہ نہ کرو بیٹا۔ لیکن ایک بات اپنے ذہن میں بٹھا لو۔ تمہارے یہ تیور کسی کام نہیں آنے والے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم ہر فضول بات کو دماغ سے جھٹک کر دل سے اس فیصلے کو قبول کر لو!" قطعی لہجے میں اپنی بات مکمل کرتی وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ تو غصے سے کھولتے ہنی نے پاس پڑا تکیہ پوری طاقت سے سامنے دیوار پہ دے مارا۔

"آئی ہیٹ یو مہر احمد۔ آئی رئیلی ہیٹ یو!" اس کی سنہری آنکھیں نفرت کے احساس میں ڈوبی چنگاریاں اڑا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ لیکن مہر کی آنکھوں میں نیند دور تک نہ تھی۔ یہ کیسا انکشاف تھا جس نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل ڈالا تھا۔ وہ محض چند ہی لمحوں میں مہر احمد سے مہر تموز بن گئی تھی۔

تموز ابراہیم کی امانت۔ وہ اس کی زندگی کا لازمی جز بن گیا تھا۔ اور کسی سے یوں اچانک جڑ جانے کا احساس اس کے دل و دماغ کو اس حد تک حیران کر گیا تھا کہ وہ تاحال بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔ رہ رہ کر اس کی آنکھوں میں ہنی کی تصویریں گھوم رہی تھیں۔۔۔ اونچا لمبا گورا چٹا۔ سنہری آنکھوں والا۔ جس کی کھڑی ناک کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا گویا اسکیل رکھ کر سیدھی لکیر کھینچی گئی ہو۔ اس کے بائیں گال پر ایک واضح سیاہ تل تھا۔

مہر نے جب کبھی اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اسے یہ تل ہنی کے چہرے پہ بہت بھلا، بہت پرکشش محسوس ہوا تھا۔ لیکن وہ کبھی اس تل کو چھونے کا اختیار رکھ پائے گی، ایسا تو اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اور رات کے اس پہر بھی اس بات کو سوچ کر اس کے نادان دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئی تھیں۔ وہ بے اختیار گھبرا کر لیٹے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

اس نے پانی پینے کے ارادے سے سائیڈ ٹیبل کی طرف رخ موڑا تھا۔ لیکن وہاں جگ اور گلاس نہ پا کے اسے اپنی بے دھیانی کا احساس ہوا تھا۔ خود کو ملامت کرتی وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اس نے ایک نظر اپنے برابر سوئی جاثی پر ڈالی تھی اور بنا کوئی آواز کیے، احتیاط سے دروازہ کھول کے باہر چلی آئی تھی۔

باہر نکل کر اس نے راہداری کی لائٹ جلائی تھی اور اسی روشنی میں چلتی سیڑھیاں اتر کر نیچے لاؤنج میں داخل ہونے کو تھی جب اچانک بائیں طرف موجود

اندھیرے میں ڈوبے ڈرائنگ روم سے نکل کر کوئی اس سے بری طرح آ ٹکرایا تھا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چیخ طویل ہوتی ایک مضبوط ہاتھ سختی سے اس کے لبوں پہ جم گیا تھا۔

"شش میں ہوں۔" مہر کی متوحش نگاہیں خود سے بے حد قریب کھڑے حنان کے چہرے سے ٹکرائی تھیں۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنا پورا زور لگا کر خود کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا تھا۔ ہانپتے ہوئے اس نے ایک گھبرائی ہوئی نظر سامنے کھڑے حنان پہ ڈالی تھی۔ جس کی ہتھیلی مہر کے چہرے کی نرماہٹ پا کے سنسنا اٹھی تھی۔ بے اختیاری کے عالم میں اس کی نظریں مہر کے وجود کی طرف اٹھی تھیں اور پھر گویا پلٹنا بھول گئی تھیں۔ رات کے اس پہر دوپٹے سے بے نیاز اپنے گھنے بالوں کی چوٹی سینے پہ ڈالے وہ حنان کا دل دھڑکا گئی تھی۔

"آپ یہاں کیا کر رہے تھے؟" اپنے کانپتے دل کو سنبھالے اس نے سوال کیا تو حنان کی نگاہیں اس کے حواس باختہ چہرے پہ آ ٹھہریں۔

"اسموکنگ کر رہا تھا۔" وہ بنا کسی تامل کے پرسکون لہجے میں بولا تو مہر کا منہ کھل گیا۔

"کیا؟"

"کوئی مسئلہ ہے کیا؟" حنان نے ابرو اچکائے تو مہر کا سر خود بہ خود نفی میں ہل گیا۔

"گڈ... تم کیا کر رہی ہو اس وقت؟" اس کی نظروں کے ارتکاز نے مہر کے اندر عجیب سی سنسناہٹ پیدا کر دی تھی۔ بے اختیار اسے اپنے حلیے کا احساس ہوا تھا۔

"میں پانی پینے آئی تھی۔" گھبرا کر اس نے لاشعوری طور پہ اپنے بازو اپنے گرد لپیٹے تھے۔

"ہاں، مجھے بھی بہت پیاس لگ رہی ہے۔" حنان اپنی سلگتی نظریں اس کے چمکتے چہرے پہ جمائے ایک قدم آگے آیا تو مہر سرعت سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"م میں پانی لاتی ہوں۔" کچن میں داخل ہوتے ہی مہر نے سب سے پہلے لائٹ جلائی تھی۔ اور اپنا دل تھامے وہیں کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ آج حنان کی نظروں میں کیسا احساس تھا جو اس کے رونگٹے کھڑا کر گیا تھا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے بھائی کی جگہ ہیں۔" اپنی سوچ کی نفی کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر لاؤنج کی طرف دیکھا تھا اور پھر اپنے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیرتی فریج کی جانب چلی آئی تھی۔

دو گلاس پانی پینے کے بعد اس نے ایک صاف گلاس اور بوتل اٹھائی تھی اور بنا بتی بند کیے لاؤنج کی طرف بڑھی تھی۔ حنان صوفے کی پشت سے سر ٹکائے نیم وا آنکھوں سے کچن کی ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مہر نے ایک چور سی نظر اس پہ ڈالی تھی اور ہاتھ میں پکڑا۔ گلاس اور بوتل درمیانی میز پر رکھنے کو آگے آئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے وہ دونوں چیزیں وہاں رکھتی حنان نے اسے ٹوک دیا۔

"مجھے پکڑا دو۔" مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مہر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی آئی تھی۔ حنان نے سیدھے ہوتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھائے تھے۔

لیکن جوں ہی اس نے گلاس اور بوتل کو تھاما تھا مہر اپنی پوری جان سے کانپ گئی تھی۔ حنان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں نے مہر کی انگلیوں کو اچھا خاصا مس کیا تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچے تھے۔ نتیجتاً گلاس اور بوتل دونوں گرتے گرتے بچے تھے۔

"دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ ابھی گر تیں دونوں چیزیں۔" حنان کے شاطر دماغ نے صورت حال کو فوراً بھانپ لیا تھا۔ اس نے آن واحد میں تیور بدلے تھے۔

"لگتا ہے، کچھ زیادہ ہی نیند آ رہی ہے۔ جاؤ جا کر سو جاؤ" اس کے گھور کر ڈپٹنے پہ مہر سرپٹ سیڑھیوں کی جانب بڑھی تھی اور سیدھا اپنے کمرے میں آ کر دم لیا تھا۔

"یا اللہ یہ میرا وہم تھا یا..." تھوک نگلتے ہوئے وہ اپنے کمبل میں آ دبکی تھی۔

"ہو سکتا ہے، غلطی سے ایسا ہو گیا ہو۔ کیونکہ پہلے تو ایسا کبھی بھی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ تو مجھ سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتے۔" حنان کی ڈانٹ نے اسے الجھا دیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر خود سے سوال جواب کرتی رہی تھی اور پھر اسی گومگو کی کیفیت میں اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

آنے والے دن تیزی سے پر لگا کے اڑے تھے مہر کو اس رات کے بعد حنان کے رویے میں کوئی قابل گرفت بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔ سو اس نے بھی اس بات کو اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے نکال دیا تھا۔ ویسے بھی جوں جوں ہنی کی آمد کے دن قریب آ رہے تھے۔ مہر کا دل و دماغ سوائے اس کے خیال کے کسی بھی اور چیز پر مرکوز نہ رہ پا رہا تھا۔ بالآخر انتظار تمام ہوا تھا اور وہ دن بھی آ گیا تھا جب ثمروز ابراہیم مجسم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"کیسی ہو مہر؟" اس کے بھرے بھرے سے لب دھیرے سے مسکرائے تھے اور ساکت کھڑی مہر کی نظریں اس کے گال کے تل پہ جا ٹھہری تھیں۔ جو لبوں کے مسکراتے ہی مہر کو باقاعدہ کھلکھلا کر ہنستا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں؟" بامشکل تمام اس شرارتی تل سے نظریں چھڑاتے ہوئے اس نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھنا چاہا تھا۔ لیکن ان سنہری کانچ کے ٹکڑوں کو پوری طرح خود پہ مرکوز پا کے وہ نگاہیں چرانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"یا اللہ! میں کہاں دیکھوں؟" سٹپٹا کر سوچتے ہوئے اس نے اپنی نظروں کے لیے کوئی مرکز تلاش کرنا چاہا تھا۔ اور سامنے ناقدانہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے سیم نے اس کے چہرے پر پھیلتے بلاوجہ کے گلال کو دیکھ کر ایک کوفت بھری سانس لی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہنی میری جان! یہ شامی کباب لو نا۔ مجھے پتا ہے میرے بیٹے کو بچپن سے بہت پسند ہیں۔" زیب نے کبابوں کی پلیٹ اٹھا کے بھانجے کی طرف بڑھائی تھی۔ ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ ایک ایک چیز اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے اسے کھلائیں۔ ٹیبل پہ موجود ساری ڈشز انہوں نے خاص ان تینوں کی پسند کو سامنے رکھتے ہوئے بنائی تھیں۔ ان کی بے پناہ خوشی ان کے چہرے ان کے ایک ایک عمل سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"میں لیتا ہوں خالہ۔" سیم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پلیٹ ان کے ہاتھ سے لے کر واپس میز پہ رکھ دی تھی۔ اسے زیب کے اس درجہ پیار اور توجہ سے الجھن ہو رہی تھی۔

"اوف! میرا تو جی نہیں بھر رہا اپنے بچے کو دیکھ دیکھ کے۔ ماشاء اللہ کتنا ہینڈسم ہو گیا ہے آپا!" اس کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے تکتے ہوئے وہ مسکرا کر بہن کی طرف پلٹیں تو سب کے سامنے اس تعریف پہ سیم سچ میں شرمندہ ہو گیا۔ اس کی رنگت میں یک لخت سرخی سی گھل گئی تھی۔ جسے دیکھ کے جاشی نے مسکرا کے ساتھ بیٹھی مہر کو ٹہوکا دیا تھا۔

"دیکھو تو ہنی بھائی کیسے بلش ہو گئے ہیں۔" اور مہر کے لیے مقابل بیٹھے سیم کے گلابیاں چھلکاتے چہرے پہ ایک کے بعد دوسری نگاہ ڈالنا محال ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ اپنی تصویروں اور مہر کے تصور سے بڑھ کر شاندار شخصیت کا مالک نکلا تھا۔ اس سے مل کر مہر کے لیے اپنے دل کو سنبھالنا ناممکن ہو گیا تھا۔

"بس بھی کرو زیبی! تمہاری حد سے بڑھی محبت اب بچے کو پریشان کر رہی ہے۔" صغیر صاحب کے مسکرا کر ٹوکنے پہ سوائے حنان کے سب ہی ہنس پڑے تھے۔ حنان نے جل کر ایک نظر ہنستے ہوئے سیم پہ ڈالی تھی۔

وہ آج شام سے ہی گھر سے غائب ہو گیا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے واپس لوٹا تھا۔ مہمانوں سے سرسری انداز میں مل کر وہ اپنے کمرے میں چلا آیا تھا اور اب کھانے میں شریک ہونے کے لیے سب کے ساتھ آ کر بیٹھا تھا کہ یہاں اس کا خون کھولانے کو یہ نئے ڈرامے دیکھنے

کومل گئے تھے۔

"اگر زحمت نہ ہو تو مجھے بھی کوئی چاولوں کی ڈش پکڑا دے۔" سیم سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے اس نے قصداً" باآواز بلند کہا تو جہاں زیب بیگم نے شرمندہ ہو کر ڈش کی طرف ہاتھ بڑھائے وہیں اس کے لہجے کی تلخی پہ ایک پل کو ٹیبل پر خاموشی چھا گئی۔ بے اختیار صغیر صاحب نے خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھا' جو سب سے بے نیاز اپنی پلیٹ میں چاول نکالنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

"کیا کرتے ہیں آپ؟" وہ کھانا ڈال کر فارغ ہوا تو سیم نے یونہی بات کرنے کو پوچھ لیا۔ اسے حنان سے مخاطب ہوتا دیکھ کے مہر اور جاشی دونوں کے چہروں پہ گھبراہٹ نمودار ہو گئی۔

"میں فی الحال کمال کرتا ہوں۔" وہ مسکرا کر طنزیہ لہجے میں بولا تو سیم کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔

"جی؟"

"بھائی آج کل فارغ ہیں' ہنی بھائی۔ لیکن انہوں نے لندن میں اے سی سی اے میں داخلے کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے۔" حنان کے بجائے جاشی نے گھبرا کے سرعت سے جواب دیا تو سیم کی آنکھوں میں ناگواری اتر آئی۔ اس نے ایک سرد نظر اس بدتمیز لڑکے پہ ڈالی اور اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کھانے کے بعد انجم' زیب اور ہنی تینوں لان میں چلے آئے تھے۔ جبکہ دونوں مرد حضرات لاؤنج میں حالات حاضرہ سے متعلق کوئی پروگرام دیکھنے بیٹھ گئے تھے۔ جاشی کا اگلے دن ٹیسٹ تھا' سو وہ کمرے میں چلی گئی تھی اور مہر صغیر صاحب کی فرمائش پہ کچن میں سبز چائے بنانے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ کیسا نمونہ آیا ہے بھئی؟" وہ چائے پیالیوں میں نکال رہی تھی جب حنان کی تمسخرانہ آواز پہ اس کے پیروں سے لگی اور سر پہ بجھی۔ اس نے پلٹ کر غصے سے حنان کی طرف دیکھا جو دروازے سے کندھا ٹکائے' لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔

"اتنا غصہ؟ خیر تو ہے؟" اس نے بھنویں سکیڑتے ہوئے بغور مہر کو دیکھا تو وہ بمشکل تمام خود پہ ضبط کرتی رخ موڑ گئی۔ چائے کپوں میں ڈال کر وہ ٹرے اٹھائے اپنے دھیان میں پلٹی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ حنان اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا' باہر والوں سے پہلے گھر والوں کا حق ہوتا ہے۔" اس کے چہرے پہ نظریں جمائے اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کپ ٹرے میں سے اٹھا لیا تو مہر نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی اور پھر سائیڈ سے نکل کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

وہ ٹرے اٹھائے لان میں داخل ہوئی تو زیب اور انجم کرسیوں پہ بیٹھی باتوں میں مشغول تھیں۔ جبکہ سیم لان کے انتہائی سرے پہ ٹہلتے ہوئے فون پہ کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔

"کیا لائی ہے میری بیٹی؟" اسے دیکھ کر انجم مسکرائیں۔

"گرین ٹی خالہ۔" اس نے جھک کر ٹرے ان کے سامنے کی تو دونوں نے اپنے کپ اٹھا لیے۔ مہر کی نگاہیں بے اختیار دور ٹہلتے ہنی پہ جا ٹھہریں۔

"جاؤ اسے دے آؤ۔" اس کی نظروں کے جواب میں انجم بیگم اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولیں۔ ان کی بات پر مہر کے چہرے پہ گھبراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھی تو دونوں بہنیں مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگیں۔

"ایکسکیوز می۔" سیم اپنے دھیان میں اپنے دوست سے بات کر رہا تھا جب ایک نرم سی آواز اس کی پشت سے ابھری تھی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور مہر کو ٹرے اٹھائے دیکھ کر اس نے سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائی تھیں۔

"گرین ٹی۔" اس کی بات پہ سیم نے آگے بڑھ کر کپ اٹھا لیا تھا اور پھر سے ٹہلتے ہوئے اپنی باتوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس کی اس بے نیازی پہ نجانے کیوں مہر کو مایوسی سی ہوئی تھی۔ اس کا دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ وہ چپ چپ سی ماں اور خالہ کے قریب چلی آئی تھی۔ بیٹے کی یہ حرکت انجم کی زیرک نگاہوں سے

محفوظ نہ رہ سکی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کھولتی، مسکرا کر مہر کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"مہو میری جان! جاؤ میرے کمرے سے میرا پرس لے کر آؤ۔" ان کی بات پہ مہر اثبات میں سر ہلاتی اندر چل دی تھی اور چند ہی لمحوں بعد ان کا پرس لیے ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ انجم نے ایک نظر مصروف گفتگو سیم پہ ڈالی تھی اور اگلے ہی لمحے اسے پکار لیا تھا۔

ماں کی پکار پہ سیم نے پلٹ کر دیکھا اور ان دونوں کے ساتھ مہر کو بیٹھا دیکھ کے اس کا دل بے زاری سے بھر گیا تھا۔

"اوکے ڈیوڈ! میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔" ان تینوں پہ نگاہیں جمائے اس نے اپنے دوست سے کہا تھا اور پھر فون بند کرتا ان کے قریب چلا آیا تھا۔

"جی مام؟"

"مہر کو اس کا گفٹ نہیں دو گے؟" انجم نے مسکراتے ہوئے بیٹے کی طرف دیکھا تو ان کی بات پہ جہاں مہر کا چہرہ یک لخت سرخ پڑ گیا۔ وہیں سیم کی سٹی گم ہو گئی۔

"آپ۔۔۔ آپ خود دے دیں نا۔" اس کے جواب پہ زیب اور انجم دونوں ہنس پڑیں۔ مہر بھی اپنی مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ جھکا گئی۔

"لو گفٹ تمہارا اور دوں میں۔" انجم نے سر جھٹکتے ہوئے پرس کھول کے اندر رکھی مخملی ڈبیہ نکالی۔

"یہاں بیٹھو اور خود پہناؤ اپنے ہاتھوں سے۔"

انہوں نے اس کے فرار کی ساری راہیں مسدود کر دی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سیم کو آگے بڑھنا پڑا تھا۔ اسے ماں کی اس درجہ ہوشیاری پہ شدید غصہ آ رہا تھا۔ لیکن چونکہ اس وقت وہ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس لیے خاموشی سے ڈبیہ تھامے مہر کے برابر جا بیٹھا تھا۔

"پتا ہے مہو! یہ رنگ ہنی خاص طور پہ خود جا کر تمہارے لیے لایا تھا۔" انجم نے مسکراتے ہوئے بتایا تو مہر کی ساری مایوسی ہوا ہو گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو کر اس کی پلکوں کو جھکنے پہ مجبور کر گئی تھیں۔ جبکہ سیم کا چہرہ مارے غصے کے سرخ پڑ گیا تھا۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ اس کی ماں اتنے فراٹے سے جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔

اس نے مزید کچھ کہے سنے بغیر ڈبیہ کھول کے اندر موجود انگوٹھی باہر نکالی تھی اور اپنا بایاں ہاتھ مہر کے آگے پھیلا دیا تھا۔ اس کی مضبوط چوڑی ہتھیلی پہ نگاہ پڑتے ہی مہر کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنا یخ پڑتا ہاتھ جھجکتے ہوئے سیم کی طرف بڑھایا تھا۔ دونوں کی انگلیاں مس ہوئی تھیں اور مہر کے پورے وجود میں کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔

اس نے میکانکی انداز میں انگوٹھی مہر کی انگلی میں منتقل کی تھی اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"اللہ میرے بچوں کی جوڑی سلامت رکھے۔"

اس خوب صورت منظر نے زیب کو آبدیدہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور آگے بڑھ کر انہوں نے سیم کا سر چوم لیا تھا۔

"میری مہو کا خیال رکھو گے نا ہنی؟" اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انہوں نے بڑی آس سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور سیم اس پل سوائے اثبات میں سر ہلانے کے اور کچھ نہ کر سکا تھا۔

✡ ✡ ✡

ہنی کے فقط بارہ دن کے پروگرام نے سب کو ملول کر دیا تھا۔ رہ رہ کر ان کے لبوں پر اس کے چند دنوں کی آمد کا گلہ آ ٹھہرتا تھا۔ جو مہر کے دل کی آواز تھا۔

آج وہ سب صبح سے "دلی تنگی" کی حسین وادی میں پکنک منانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اتوار کی چھٹی کی وجہ سے صغیر قاضی بھی اس پروگرام میں شامل تھے سوحنان کو نہ چاہتے ہوئے بھی ساتھ آنا پڑا تھا۔ ورنہ اتنے دنوں میں وہ ان کے کسی پروگرام میں شامل نہ ہوا تھا۔

موسم کی جولانی آج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بادلوں نے صبح سے ہی آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا، لہراتے درخت، چشموں کا بہتا ہوا شفاف

پانی اور ارد گرد کھڑے بلند و بالا پہاڑ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سیم کا موڈ بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔ اسے یوں قہقہے بکھیرتا دیکھ کے مہر کو خوشگوار حیرت نے آن گھیرا تھا۔ وگرنہ وہ تو اسے اب تک خاصا کم گو سمجھے ہوئے تھی۔

اتنے دنوں میں اس کی شخصیت مہر کے سامنے ایک ڈیسنٹ اور سلجھے ہوئے انسان کے طور پہ ابھر کر آئی تھی۔ جسے اپنے جذبات اور اپنی آنکھوں پہ کمال کا کنٹرول حاصل تھا۔ اس نے ایک پل کے لیے بھی اپنے اور مہر کے درمیان موجود رشتے کا فائدہ اٹھا کر کوئی اخلاق سے گری ہوئی بات یا حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ امریکہ جیسے کھلے ملک کا پروردہ تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے مہر کو کسی بھی غیر معمولی بات کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اور اس چیز نے مہر احمد کے معصوم سے دل میں تموز ابراہیم کی عزت بڑھا دی تھی۔ وہ اپنے بڑوں کے اس فیصلے پہ اب صحیح معنوں میں خوش اور مطمئن تھی۔ ہنی کی شخصیت سے لے کر اس کی عادات اور مزاج تک سب اس کے سامنے تھا اور اسے اب کسی بات کی کوئی پریشانی نہیں رہی تھی۔

کھانے کے بعد ہائی کنگ کا پروگرام تھا۔ لیکن موسم کے تیور دیکھتے ہوئے سب ہی بڑے انہیں منع کرنے لگے تھے۔ بارش کی آمد بادلوں کے سرمئی ہونے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ ایسے میں اگر وہ لوگ پہاڑوں کا رخ کرتے اور بیچ راستے بارش شروع ہو جاتی تو ان کے لیے ڈھلوان راستوں پہ اترنا مشکل ہو جاتا۔ مگر سیم اور جاشی کسی کی سننے کو تیار نہ تھے۔ **نتیجتاً** ”بڑوں کو انہیں اجازت دیتے ہی بنی تھی۔

وہ چاروں، چھوٹی نوریہ کے ساتھ قریبی پہاڑ پہ چڑھائی کرنے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن ابھی آدھے راستے بھی نہ پہنچے تھے کہ بونداباندی شروع ہو گئی تھی۔

”میرے خیال میں مسٹر ہنی! بہت ہو گئی ہائی کنگ۔ ہمیں اب واپس چلنا چاہیے۔“ حنان نے ایک نظر آسمان پہ ڈالتے ہوئے طنزیہ نظروں سے سیم کی طرف دیکھا تو اس کا لب و لہجہ سیم کی تیوریاں چڑھا گیا۔

”ہاں تو جاؤ۔ کس نے روکا ہے۔“ اس نے پلٹ کر حنان کو ناگواری سے دیکھا تھا۔ اس کا جواب حنان کو سلگا گیا تھا۔ اس نے ایک تیز نگاہ سیم کے چہرے پہ ڈالی تھی۔ اور رخ موڑ کر جاشی سے مخاطب ہوا تھا۔

”چلو جاشی اور نوریہ۔“

”بھائی! ہم ہنی بھائی کے ساتھ ــــ“ جاشی نے لجاجت سے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ حنان نے اپنا سارا غصہ اس پہ نکال دیا۔

”تم نے سنا نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ اس کی بلند آواز پہ جاشی پہلے سہم کر چپ ہوئی تھی اور پھر مارے شرمندگی کے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ اس نے خفگی سے بھائی کی طرف دیکھا تھا اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر تیز قدموں سے نیچے اترنے لگی تھی۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ اس بلاوجہ کے رعب نے سیم کا دماغ گھما دیا تھا۔ وہ سرعت سے دو قدم نیچے کو آیا تھا کہ مہر نے سہم کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”پلیز ہنی!“ اس کی التجا پہ ناچار سیم کو خود کو روکنا پڑا تھا۔ اگر مہر اور نوریہ ساتھ نہ ہوتیں تو آج وہ سارا لحاظ بالائے طاق رکھ کے اس بد دماغ لڑکے کا مزاج ٹھکانے لگا دیتا۔ لب بھینچے اس نے ایک کڑی نگاہ حنان پہ ڈالی تھی۔ جو چبھتی ہوئی نظروں سے مہر کے ہاتھ میں دبے ہوئے سیم کے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔

”چلو نوریہ۔“ اس نے آگے بڑھ کر نوریہ کا ہاتھ تھاما اور پلٹ کر نیچے اترنے لگا تھا۔ بارش کی بوندوں میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ لیکن سیم کو بھی جیسے ضد سوار ہو گئی تھی۔

”تم نے جانا ہے تو تم بھی چلی جاؤ۔“ مہر کی طرف دیکھتے ہوئے وہ غصے سے بولا تو مہر کا سر خود بہ خود نفی میں ہل گیا۔ سیم ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتا اوپر کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ اور مہر خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

تقریباً" دس منٹ بعد وہ دونوں پہاڑ کے انتہائی سرے پر پہنچ گئے تھے۔ اس دوران بارش پھوار میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"واؤ! کیا خوب صورت نظارہ ہے۔" چوٹی پہ پہنچ کے نیچے بارش میں بھیگتی وادی کا منظر ایک پل کو انھیں مبہوت کر گیا تھا۔

"دیکھو مہر! وہ سامنے پھیلے باغات کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں۔" ہنی جوش سے بولتا اس کے قریب آیا تو مہر کا دل دھڑک اٹھا۔

"جی۔" اس کے ساتھ کھڑے ہوئے مہر کو اس پل وہ بے حد اپنا اپنا سا لگا تھا۔ تب ہی بادل زور سے گرجے تھے۔ دونوں کی نظریں ایک ساتھ آسمان کی جانب اٹھی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔

سیم نے فوراً" سے پیشتر مہر کا ہاتھ تھاما تھا اور بھاگتے ہوئے ایک طرف نصب شیڈ کے نیچے آ کھڑا ہوا تھا لیکن اتنی پھرتی کے باوجود دونوں ٹھیک ٹھاک بھیگ چکے تھے۔ پہاڑ پہ بارش کس بلا کا نام تھا۔ اس کا احساس انھیں اس لمحے اپنی آنکھوں کے آگے تنی پانی کی دبیز چادر کو دیکھ کر ہوا تھا۔ جس کے پار کچھ بھی دیکھنا ناممکن تھا۔ بادلوں کی گھن گرج الگ دل دہلائے دے رہی تھی۔ وہ دونوں ہی بری طرح خوف زدہ ہو گئے تھے۔

"اب ہم کیا کریں گے ہنی؟" مہر روہانسی سی اس کے قریب کھسکی تو سیم نے غیر ارادی طور پہ اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ اسے اپنی ضد کے غلط ہونے کا احساس بہت شدت سے ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ ساتھ مہر کو بھی مشکل میں پھنسا دیا تھا۔

"پریشان نہ ہو۔ ابھی رک جائے گی۔" ڈوبتے ابھرتے دل کے ساتھ اس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی تھی۔ تب ہی بجلی کی چمک سے اردگرد کا علاقہ روشن ہو گیا تھا اور اگلے ہی پل بادل اس زور سے گرجے تھے کہ مہر تو جو کانپی سو کانپی تھی۔ سیم کا اپنا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ مہر کے لبوں سے نکلنے والی چیخ بے اختیار تھی۔ وہ سیم کے سینے میں منہ دیے بے اختیار رو پڑی تھی۔

"شش۔۔۔ اٹس آل رائٹ۔" سیم نے پریشانی سے طوفانی انداز میں برستی بارش کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں اس وقت کیا کر رہے تھے، کس پوزیشن میں کھڑے تھے۔ ان میں سے کسی کو احساس تک نہ ہوا تھا۔

تقریباً" دس منٹ تک بارش یونہی چھاجوں چھاج برستی رہی تھی اور سیم اسے نرمی سے خود سے لگائے کھڑا رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد بارش کا زور کچھ ٹوٹا تو سیم کو بہتری کی امید نظر آئی تھی۔

"میرے خیال میں بارش رکنے والی ہے۔"

"رک بھی گئی تو ہم نیچے کیسے اتریں گے؟" مہر نے خوف زدہ نظروں سے ڈھلان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہمت تو کرنی پڑے گی۔ دعا کرو ہم جب اتر رہے ہوں تب بارش دوبارہ نہ شروع ہو جائے۔" اور مہر نے صدق دل سے اپنے رب کی مدد کو پکارا تھا۔

اس کی دعا قبول ہوئی تھی اور بارش معجزاتی طور پہ مکمل بند ہو گئی تھی۔ سیم نے وقت ضائع کیے بغیر مہر کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور اللہ کا نام لے کر نیچے اترنا شروع کیا۔ وہ پتھروں اور مٹی کو پہلے اپنے جاگرز کی ٹو سے ٹھوک کر دیکھتا تھا اور پھر وہاں پر مہر کو پاؤں رکھنے کے لیے کہتا تھا۔ اس کے باوجود دونوں کتنی ہی بار لڑکھڑائے تھے۔ کتنی ہی بار پھسلے تھے مگر ایک دوسرے کے ساتھ نے انھیں گرنے نہ دیا تھا۔ بالآخر یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا سفر بھی تمام ہوا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بھاگتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی طرف آئے تھے۔ جس کے برآمدے میں سب ہی گھر والے پریشان حال کھڑے تھے۔ زیب اور انجم بیگم کا رو رو کے برا حال ہو چکا تھا۔

ان پہ نظر پڑتے ہی سب بے اختیار دونوں کی طرف بڑھے تھے۔ جی بھر کے پیار کرنے کے بعد سب ہی نے سیم کی اچھی خاصی کلاس لی تھی۔ جو ہنستے ہوئے خندہ پیشانی سے اپنی غلطی قبول کرتا مہر کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں اس کا محافظ ثابت ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی اپنی بے اختیاری اور اس کا محبت بھرا انداز مہر

کے چہرے پہ رنگ ہی رنگ بکھیر گیا تھا۔ وہ ان لمحوں میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اسے حنان کی خود پہ جمی نظروں کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ جو کینہ توز نگاہوں سے اس کے لبوں پہ کھیلتی دھیمی سی مسکراہٹ سے لے کر اس کی پلکوں کے بوجھل پن تک کو نوٹ کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دن چٹکی بجاتے میں تمام ہوئے تھے۔ اور پھر وہ وقت بھی آ گیا تھا۔ جب سیم اپنی روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اسے فردا "فردا" سب سے ملتا دیکھ کر مہر کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئی تھیں۔ وہ آج صبح سے ہی کتنی بار چپکے چپکے آنسو بہا چکی تھی۔ مگر دل تھا کہ کسی طور ٹھہرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"او کے مہر۔" سب سے مل کر وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو بے اختیار مہر کی نگاہیں اس کے تل پہ جا ٹھہریں۔ لیکن محض لمحہ بھر کو۔ اگلے ہی پل اس کا تل اور چہرہ دونوں دھندلانے لگے تو اس نے تیزی سے نظریں جھکالیں۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو سامنے کھڑے سیم نے چونکتے ہوئے اب کے بغور اس کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو رہا تھا۔

"یہ نوبت کیسے آئی؟" حیران نظروں سے مہر کو تکتے ہوئے اس نے پریشانی سے سوچا تھا۔ اسے تو کوشش کے باوجود بھی ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ جب اس نے آس کا کوئی جگنو اس لڑکی کو تھمایا ہو۔ پھر بھلا یہ کیسے اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس کا دور جانا مہر کی آنکھوں میں آنسو بھر گیا تھا۔

"پتا ہے ہنی! میں نے اپنے اللہ سے اپنے لیے ایک مخلص اور باکردار شریک سفر کی دعا مانگی تھی اور میں اس کی شکر گزار ہوں کہ اس نے میری دعا رد نہیں کی۔" اس نے یک لخت اپنی نگاہیں اٹھاتے ہوئے سیم کے چہرے پہ جما دی تھیں اور سیم کا پورا وجود ایک پل کو ساکت ہو گیا تھا۔

"مجھے اپنے اللہ اور اپنے ماں باپ کا فیصلہ دل کی گہرائیوں سے قبول ہے۔ مجھے آپ کا ساتھ قبول ہے ہنی۔"

وہ آنکھوں میں نمی لیے دھیرے سے مسکرائی تھی۔ اور سیم کے لیے اس سچے موتیوں سے پاکیزہ اظہار کے سامنے رکنا محال ہو گیا تھا۔ وہ پاگل لڑکی اپنے اور اس کے درمیان اللہ کو لے آئی تھی۔ اب بھلا وہ اسے کیا جواب دیتا؟

"تم بھی اپنا خیال رکھنا۔" اس عجیب سے احساس سے دامن چھڑاتے ہوئے اس نے گھبرا کے الوداعی کلمات ادا کیے تھے اور اس کے معصوم چہرے سے نظریں ہٹاتا پلٹ کر تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

"اللہ کی امان میں۔" اس کی پشت پر نظریں جمائے کھڑی مہر کے لب دھیرے سے ہلے تھے۔

☼ ☼ ☼

رات دھیرے دھیرے اپنا زرتار آنچل پھیلا رہی تھی۔ سب گھر والے لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھتے ہوئے باتوں میں مشغول تھے۔ لیکن مہر کے اداس دل کو یہ آوازیں، یہ شور ایک آنکھ نہ بھا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھی تھی اور داخلی دروازہ کھول کے باہر لان میں آ بیٹھی تھی۔ ہنی کا خیال اس کی ذات سے جیسے لپٹ سا گیا تھا۔ وہ کیسے اتنی جلدی اس کے دل و دماغ پہ قابض ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی سمجھ نہ پائی تھی۔ یا پھر یہ اس رشتے کا اعجاز تھا جس کے تناظر میں اس نے تموز ابراہیم کو دیکھا تھا۔ یا یہ اس کی بھرپور شخصیت کا کمال تھا جو آئی اور اس کے دل پہ چھاتی چلی گئی تھی۔ جو بھی تھا وہ گرفتار محبت ہو گئی تھی۔ اور اب یہ محبت اسے بری طرح ستا رہی تھی اداس کر رہی تھی۔ وہ جب تک انجان تھی مکمل طور پہ پرسکون تھی۔ لیکن اب تو جیسے جان کو نیا روگ لگ گیا تھا۔ وہ کیسے اس ماہ و سال پہ پھیلنے والی دوری کو برداشت کرنے والی تھی ہم اس کی

سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"یہ مراقبہ ہے یا ڈیئر کزن کے جانے کا سوگ۔ مہر احمد؟" حنان، جو ابھی ابھی گھر لوٹا تھا۔ اسے لان میں تنہا بیٹھا دیکھ کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ لیکن مہر اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی کہ اسے حنان کی آمد کا احساس بھی نہیں ہوا تھا اور اس چیز نے نا چاہتے ہوئے بھی حنان کو پتنگے لگا دیے تھے۔ وہ خود کو طنز کرنے سے روک نہ سکا تھا۔

اس کی آواز پہ مہر بے اختیار چونکی تھی اور پھر دھیرے سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ۔ اس دن پہاڑ پہ کون سا گل کھلایا تھا جو..." معنی خیزی سے کہتا وہ دھیرے سے مسکرا کر بات ادھوری چھوڑ گیا تو مہر کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پتھرا سی گئیں۔

"سنی بھائی!" دکھ کی شدت سے وہ بس یہی کہہ پائی تھی۔

"واہ! میں سنی بھائی اور وہ صرف ہنی۔ عجیب بات ہے نا؟" کاٹ دار لہجے میں کہتے ہوئے وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا تو مہر کی ہمت جواب دے گئی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ کبھی ایسی بات بھی کر سکتے ہیں۔" شاکڈ سی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ "آپ نے ساری زندگی مجھ سے سوتیلوں والا سلوک کیا۔ کبھی مجھے قبول نہیں کیا مگر میں نے اف تک نہیں کی۔ لیکن آپ میرے دامن پہ یوں کیچڑ اچھالیں گے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا!" بات کرتے کرتے اس کی آواز بھر آئی تھی۔

"یہ آنسوے وہاں بہانا جہاں ان سے تم جیسوں کا کام نکل سکتا ہو۔ میں تمہاری اوقات سے اچھی طرح واقف ہو چکا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں جھانکتا وہ بنا کسی لحاظ کے بولا تو مہر کا دل مارے غم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ "پتا نہیں کون سا دن تھا جو تم اور تمہاری ماں میرے باپ کے سر منڈھی گئی تھیں۔"

"سنی بھائی!" مہر کے لیے مزید برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ مٹھیاں بھینچے بے اختیار چلا اٹھی تھی۔

"آواز نیچی کرو!" وہ دانت پیستے ہوئے غرایا تھا۔ "اور میرے سامنے اپنی معصومیت کا یہ ڈھونگ اب کبھی مت رچانا۔" انگلی اٹھائے وہ اسے وارننگ دیتا اندر کی جانب بڑھ گیا تھا اور پیچھے مہر کرسی پہ گر کر پھوٹ پھوٹ کے روتی چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نیویارک ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی آزادی کا بڑا گہرا اور پرکیف احساس تھا جس نے سیم کو سراپا اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ چودہ دنوں کی تھکن چند ہی لمحوں میں ہوا ہو گئی تھی۔ وہ پاکستان اور اس سے جڑا ہر غنا پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب آنے والے کئی سالوں کے لیے آزاد تھا۔

"یا ہو! آئی ایم فری!" گھر پہنچتے ہی اس نے آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا تحفوں سے بھرا بیگ دور اچھال دیا تھا۔

اگلی صبح مہر کے لیے جتنی بوجھل تھی۔ حنان کے لیے اتنی ہی خوشگوار ثابت ہوئی تھی۔ اس کا ایڈمیشن لندن یونیورسٹی میں کنفرم ہو گیا تھا۔ اس خوش خبری نے پورے گھر میں ہلچل مچا دی تھی۔ اتنی شان دار کامیابی پر حنان کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔

نیویارک پہنچ کر صرف ایک دن کا وقفہ بیچ میں آیا تھا اور اس کے اگلے دن سیم اپنی باسکٹ بال ٹیم کے ساتھ آل اسٹیٹس ٹور کی پہلی منزل کیلی فورنیا کی طرف فلائی کر گیا تھا جہاں کے ساحل سمندر، سرخ درختوں کے جنگل، لاس اینجلس کے وسط میں واقع ہالی وڈ اور ڈیتھ ویلی سمیت بہت سی جگہوں نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ وہ سچ میں جیسے اپنے خوابوں کے سفر پہ نکل کھڑا ہوا تھا۔ جہاں صرف وہ تھا اور اس کی آزادی۔

ایسے میں انٹر اسٹیٹس ٹورنامنٹ کھیلتے ہوئے اس کی ملاقات بہت سی حسیناؤں سے ہوئی تھی۔ لیکن کیٹ کے جادوئی حسن نے اس پہ گویا سحر طاری کر دیا تھا۔ وہ بلا کی حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی بولڈ بھی تھی اور سیم اس کے سامنے دم مارنے کی جرات بھی نہ کر پایا

تھا۔ دو دن محض دو دن اور وہ سیم کی پوری ٹیم سے اتنی فری ہو گئی تھی کہ تمام سب لڑکوں کے ساتھ اتوار کی چھٹی گزارنے ساحل سمندر پہ چلی آئی تھی۔ جہاں ایک بھرپور اور سنسنی خیز دن گزارنے کے بعد وہ واپسی کے وقت ایک بار پھر سیم کے بازو سے لٹک گئی تھی۔

"اب کہاں جاؤ گے تم لوگ؟" اس نے اپنی نیلگوں آنکھیں سیم کے چہرے پہ جماتے ہوئے پوچھا تو سیم کے لیے اپنے ذہن کو حاضر رکھنا دشوار ہو گیا۔

"آ... تمہیں ڈراپ کر کے واپس ہوٹل جائیں گے۔" اس نے بامشکل تمام ان نیلی آنکھوں سے نظریں ہٹائی تھیں۔

"اور اگر میں کہوں کہ تم بھی میرے ساتھ ہی ڈراپ ہو جاؤ تو؟" وہ ایک دم اس کی جانب کھسک آئی تو سیم اپنی پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ہر طرح کی حدود شکنی کے باوجود اس نے یہ آخری حد تاحال پار نہیں کی تھی۔

"تم وعدہ کرو کہ تم خود کو بچانے کی صرف کوشش نہیں بلکہ بھرپور کوشش کرو گے!" اس کے کانوں میں اس کے بابا کی آواز گونجی تو اس نے اپنے خشک پڑتے لبوں پہ زبان پھیری۔ بڑی ہی کڑی آزمائش تھی جس نے اسے آن گھیرا تھا۔

"میرے خیال میں کیٹ یہ اچھا آئیڈیا نہیں....."

"پلیز۔" اس کے گلے میں اپنی نازک بانہیں ڈالتے ہوئے وہ درمیان میں موجود تھوڑا سا فاصلہ بھی ختم کر گئی تو سیم کی سانس اس کے سینے میں اٹک گئی۔

"جس دن اپنی آرزوؤں، اپنی خواہشات کے پیالے کو توڑ دو گے، اس دن زندگی تم پر حقیقت کے دروازے کھول دے گی۔" اس کے باپ کی آواز ایک بار پھر اس کے آس پاس گونجی تھی۔ تب ہی کیٹ نے اسے اپنی جانب جھٹکا دیا تھا۔ اور سیم کے لیے اس کے سرخ لبوں سے نظریں ہٹانا ناممکن ہو گیا تھا۔

"اس رنگین پیالے کو توڑنا کہاں ممکن ہے بابا۔" بے بسی سے اعتراف کرتے ہوئے اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

برائی کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم سب سے بھاری ہوتا ہے۔ لیکن ایک بار جب یہ قدم اٹھ جاتا ہے۔ تو آگے کا راستہ بالکل سہل ہو جاتا ہے اور یہی سیم کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

اسے پاکیزگی اور شرم کی اس آخری حد کو پار کرنے میں صرف پہلی بار جھجک محسوس ہوئی تھی اور اس کے بعد جیسے سب کچھ آسان ہوتا چلا گیا تھا۔ کیلی فورنیا میں ان کا قیام مزید تین دن رہا تھا اور ان تین دنوں میں اس کی ہر رات کیٹ کے سنگ گزری تھی۔ وہ ماں باپ، دوست احباب سب بھول گیا تھا۔ یاد رہی تھی تو صرف عورت، جس کا نشہ سرچڑھ کے بولتا ہے۔ جلد ہی وہ اپنی ٹیم کے ساتھ اگلی منزل کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔

پاکستان سے آئے اسے ہفتہ ہونے کو تھا۔ مگر اس نے ایک بار بھی پلٹ کر فون نہیں کیا تھا اور اس چیز نے انجم بیگم کو دل گرفتہ کرنے کے ساتھ ساتھ سب کے سامنے عجیب سی شرمندگی سے بھی دوچار کر دیا تھا۔ وہ اس قدر رنجیدہ ہوئی تھیں کہ انہوں نے ابراہیم ملک کو بھی سختی سے اس سے رابطہ کرنے سے منع کر دیا تھا اور تب ٹھیک نویں دن انہیں سیم کی کال موصول ہوئی تھی۔

"خوامخواہ تم نے زحمت کی۔ ہم چھ، سات دنوں میں آنے والے تو تھے ہی۔" اس کی کھنکتی آواز انجم بیگم کا دل مزید بوجھل کر گئی تھی۔

"مجھے معلوم تھا۔ آپ مجھ سے ناراض ہوں گی۔ مگر کیا کرتا مام! ٹائم ہی نہیں ملا۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"صحیح کہا بیٹا۔ ہمارے لیے تو واقعی اب تمہارے پاس ٹائم ہی نہیں رہا۔"

"پلیز مام! بس بھی کریں۔ میں نے اتنی دور سے آپ سے بات کرنے کے لیے فون کیا ہے اور آپ ہیں کہ موڈ آف کر کے بیٹھی ہوئی ہیں۔" اس کی بے زار آواز پہ انجم نے ایک گہری سانس لی۔

"اور سناؤ' سب ٹھیک ہے وہاں؟ کیسے جا رہے ہیں تمہارے میچز؟" وہ ماں تھیں سو انہوں نے ہی ہتھیار ڈالنے تھے۔

"فرسٹ کلاس۔ آپ کو پتا ہے ہم نے ابھی تک اپنا ایک بھی میچ نہیں ہارا۔" وہ مسکرا کر بولا تو انجم اس سے رہائش اور کھانے پینے کی تفصیلات پوچھنے لگیں۔

"اچھا۔ اب میں فون زیبی کو لے جا کر دے رہی ہوں۔ وہ روز تمہارا پوچھتی ہے۔" چند لمحے مزید بات کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں تو دوسری طرف موجود سیم یک لخت جھنجلا گیا۔

"پلیز مام! ابھی نہیں۔ ابھی مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔"

"اچھا! ایک لمحہ پہلے تک تو تمہیں کوئی نیند نہیں آ رہی تھی۔" ان کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔

"تب بھی آ رہی تھی لیکن آپ سے..."

"اسٹاپ اٹ ہنی! اب تم میرے صبر کو آزما رہے ہو۔" دوسری طرف سے انجم بیگم نے غصے سے اس کی بات کاٹی تو وہ مارے باندھے خاموش ہو گیا۔ اس کی بے چین نگاہیں بے اختیار باتھ روم کے بند دروازے سے ٹکرا کر واپس لوٹ آئیں۔ جس کے دوسری طرف اس کی نئی دوست روز تھی۔

روز سے اس کی ملاقات کیلی فورنیا سے مشی گن جانے والی فلائٹ کے دوران ہوئی تھی۔ روز ایک کلب میں ڈانسر تھی اور اس وقت سیم کو بالکل حیرت نہ ہوئی تھی۔ جب اس نے ایرپورٹ پہ اترنے سے پہلے سیم کو اپنا کارڈ دیا تھا۔ آج سیم نے اسی کارڈ پہ درج نمبر پر کال کر کے اسے آنے کے لیے کہا تھا۔ اور وہ بخوشی اس کے پاس چلی آئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا جلدی کریں۔" اس کے لہجے کی تلخی کو حوصلے سے نظر انداز کرتے ہوئے انجم نے فون لے جا کر زیب کو تھما دیا تھا اور خود مہر کو لینے اس کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

"آجاؤ بیٹا! ہنی کا فون آیا ہے۔" اور مہر کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔ وہ سرعت سے اٹھ کر ننگے پاؤں ہی ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔

"اچھا۔ یہ مہو سے بات کرو۔" انجم کے اشارے پہ زیب نے فون مہر کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

"ہیلو۔" اس کی پھنسی ہوئی آواز نے دونوں خواتین کو مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا جبکہ دوسری طرف سیم کی بھنویں تن گئی تھیں۔ وہ نروس تھی۔ اس احساس نے نجانے کیوں اسے سلگا دیا تھا۔

"آواز کیوں بند ہو گئی ہے تمہاری؟" وہ جل کر بولا تھا۔ لیکن مہر اپنی گھبراہٹ میں اس کے لہجے پر غور نہ کر پائی تھی۔

"نہیں۔ بس یونہی... آپ سنائیں کیسے ہیں؟" ایک پل کی جھجک کے بعد اس نے دھیرے سے پوچھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟" تب ہی باتھ روم کا دروازہ اچانک کھلا تھا اور سیم کی آنکھیں ریڈ نائٹی میں' بھیگی زلفیں موی شانوں پر پھیلائے باہر آتی روز پر جم کے رہ گئی تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے۔ آپ کا ٹور کیسا جا رہا ہے؟" وہ نرمی سے گویا ہوئی تھی۔ مگر دم سادھے سیم کی بے خود نظریں اپنی جانب بڑھتی' اس مہکتی ہوئی قیامت پہ گڑی تھیں۔ جو اس کی محویت دیکھ کے بڑے بھرپور انداز میں مسکرائی تھی۔

"ہیلو۔" کوئی جواب نہ پا کر مہر نے بے اختیار پکارا تھا۔ تب ہی روز چلتی ہوئی بیڈ پہ اس کے بے حد نزدیک آ بیٹھی تھی۔ سیم کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے جیسے بندھ سی گئی تھیں۔

"ہیلو۔" مہر کی آواز ایک بار پھر ابھری تھی۔ لیکن سیم نے نگاہوں کے اس طلسم کو توڑے بنا کال کاٹ کر فون دور اچھال دیا تھا۔

"ٹو ہیل ود یو!" (بھاڑ میں جاؤ تم!) منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر روز کو اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔

"میرے خیال میں لائن کٹ گئی شاید۔" فون بند

کرتے ہوئے مہر کے دل پہ اوس سی آگری تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ پھر ملا لیں گے۔" انجم اسے خود سے لگائے مسکرا دی تھیں۔ لیکن پھر ملانے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ انجم اور ابراہیم صاحب مزید چھ روز ہی رہے تھے کہ ان کی واپسی کا دن آگیا تھا۔ اس دوران سیم نے فقط ایک بار ہی کال کی تھی اور وہ بھی انتہائی مختصر دورانیے کی۔ بقول اس کے وہ اپنے میچز اور پریکٹس سیشنز میں سخت مصروف تھا۔ اس کی مصروفیت کا سن کر ابراہیم صاحب نے بھی اسے ڈسٹرب کرنے سے منع کر دیا تھا۔ یوں وہ دونوں ایک ماہ پاکستان میں گزار کر واپس روانہ ہو گئے تھے۔

آنے والا مزید ایک ماہ پر لگا کے اڑا تھا اور بالآخر ایک دن حسان قاضی بھی دو ڈھائی سالوں کے لیے 'لندن روانہ ہو گیا تھا۔

اس کی روانگی کے بعد ایک ان دیکھا بوجھ تھا۔ جو مہر کو اپنے شانوں سے سرکتا محسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

سیم نے Yale یونیورسٹی میں اسکول آف مینجمنٹ میں داخلے کے لیے اپلائی کیا تھا اور خوش قسمتی سے وہ وہاں کا ٹیسٹ اور انٹرویو دونوں کلیئر کر گیا تھا۔ Yale میں پڑھنا سیم کا خواب تھا اور وہ اپنے اس خواب کو حقیقت میں ڈھال کر خود پہ مزید نازاں ہو گیا تھا۔ اسے اپنے روشن مستقبل کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ نظر نہ آرہی تھی۔ زندگی نے اس کی آرزوؤں میں سے ایک اور آرزو پوری کر دی تھی۔ سو وہ خوش تھا۔ بے حد خوش!

اس کی اس شاندار کامیابی پہ سب ہی پھولے نہ سما رہے تھے۔ یوں تموز ابراہیم 'اپنی زندگی کا ایک اور باب شروع کرنے نیو ہیون سٹی چلا آیا تھا۔ جہاں اس کی ملاقات اپنی زندگی میں آنے والے دو اہم ترین لوگوں سے ہوئی تھی۔ ایک وہ جو اس کا بہترین دوست تھا اور دوسری وہ۔ جس کے عشق میں وہ گرفتار ہونے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

سوزی جیفرسن 'اس کے علاوہ دو اور اسٹوڈنٹس مارک اور ہیری 'کو آف دا کیمپس (کیمپس سے باہر) ملنے والے رہائشی اپارٹمنٹ کو شیئر کرنے والی چوتھی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ بہت خوب صورت نہ سہی لیکن اچھی خاصی پیاری لڑکی تھی۔ مگر اس کی ذات کا سب سے عجیب پہلو اس کی بد مزاجی تھا۔

اس نے پہلے ہی دن تینوں لڑکوں کو واشگاف الفاظ میں باور کروا دیا تھا کہ وہ اپنی حد میں رہتے ہوئے اس سے تعلق 'واسطہ تو دور بات چیت کرنے کی بھی زحمت نہ کریں۔

اس کے ان فرمودات کو سیم نے بڑی دلچسپی سے سنتے ہوئے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ اس کی ان حد بندیوں نے نا چاہتے ہوئے بھی لڑکوں کو اس کی جانب متوجہ کر دیا تھا۔ وہ یہ پابندیاں لگاتے ہوئے شاید یہ بات بھول گئی تھی کہ تجسس کی یہ فطرت ہے کہ جس چیز سے اسے روکا جائے 'وہ اتنا ہی اس کی طرف کھنچتا ہے۔ جبکہ اس کے معاملے میں تو کشش کا ایک بڑا پہلو یہ بھی تھا کہ وہ لڑکی تھی اور وہ تینوں لڑکے جو آپس میں بہت جلدی گھل مل گئے تھے اور وہ ان سب میں چین کے قدیم (Forbidden City) کی طرح بن گئی تھی۔ جس کی شاہی چار دیواری کے اندر کسی عام انسان کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

یوں وہ چاروں افراد جب بھی گھر میں ہوتے 'اس کی ہر حرکت لڑکوں کی شوخ نظر میں ہوتی۔ جو اسے دیکھ کر، موقع ملنے پر کھسر پھسر کرنے اور بلند و بانگ قہقہے لگانے سے نہیں چوکتے تھے۔ اس کے کھانے سے لے کر برتن تک ہر چیز علیحدہ تھی۔ ٹی وی لیونگ روم وہ کچھ بھی ان کے ساتھ شیئر نہیں کرتی تھی۔ اس گھر میں اس کی دنیا اس کے کمرے تک محدود تھی 'جس سے وہ صرف اپنے کام نپٹانے کے لیے باہر آتی تھی۔ اور اتنی ہی دیر لڑکوں کی معنی خیز نظروں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

لیکن جوں جوں وقت ہفتوں سے مہینوں میں داخل ہونے لگا تھا۔ ان تینوں کے تجسس کی جگہ حیرت نے

لے لی تھی۔ انہیں اس کی ثابت قدمی بلکہ ہٹ دھرمی پر ازحد حیرت ہوتی تھی۔ جو دو ماہ میں اپنی کہی کسی بھی بات سے ایک انچ نہ سرکی تھی اور اس چیز نے ان تینوں کے درمیان اس کے موضوع کو ایک ڈسکشن میں تبدیل کر دیا تھا۔

"یار! مجھے لگتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر بیمار لڑکی ہے جب ہی تو ایسی ڈل اور بورنگ زندگی گزار رہی ہے۔" ہیری نے بیئر کا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"خیر ڈل اور بورنگ زندگی تو نہیں گزار رہی.... یونیورسٹی میں اچھی خاصی فرینڈز ہیں اس کی۔ پارٹیز میں بھی جاتی ہے۔ ہاں لیکن ایک بات میں نے نوٹ کی ہے۔ اس کی ساری فرینڈز لڑکیاں ہیں۔ کوئی لڑکا دور تک نہیں۔" صوفے پہ نیم دراز سیم نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

"ہوں.... اس کا مطلب ہے اس کا یہ خاص الخاص بیر صرف لڑکیوں سے ہے۔" مارک کے پرسوچ لہجے پہ سیم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بالکل۔"

"بس تو پھر صاف ظاہر ہے۔ دل توڑ دیا ہے بے چاری کا اس کے بوائے فرینڈ نے۔" مارک نے نتیجہ اخذ کر کے ان دونوں کے سامنے رکھا۔

"اور وہ بھی بہت بری طرح سے۔" ہیری نے لقمہ دیا۔

"ہو سکتا ہے۔" سیم کی خیال آرائی پہ مارک نے شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو تم مرہم کیوں نہیں رکھ دیتے سیم۔" اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"آئیڈیا اچھا اور دلچسپ ہے لیکن، لیکن ایسا ہے کہ مجھے اپنے یہ خوب صورت بال بہت عزیز ہیں۔" اس کی بات نے دونوں لڑکوں کو قہقہہ لگانے پہ مجبور کر دیا۔

"قسم سے یار! اگر میرے پاس تمہارے گڈ لکس اور جادوئی پرسنالٹی کا نصف بھی ہوتا نا تو میں اس محاذ پہ ایک بار تو ضرور ٹرائی کرتا۔" مارک نے رشک بھری مسکراہٹ لیے اسے دیکھا تھا۔

"مجھے اکسانے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ کام نہیں کرنے والا۔" سیم نے مسکراتے ہوئے مارک کو جھنڈی دکھا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت تھوڑا آگے سرکا تھا۔ سیم جب سے نیو ہیون گیا تھا۔ انجم بیگم کی ڈانٹ ڈپٹ، منت سماجت اور ایسے ہی دیگر نرم گرم حربوں کے نتیجے میں اس نے فقط دو، تین بار ہی زیب کو فون کیا تھا اور اس دو، تین بار میں ایک ہی موقع ایسا تھا جب اس کی مہر سے بات ہوئی تھی اور خلاف عادت اس نے مہر سے خاصے نارمل انداز میں بات کر لی تھی۔ جو مہر جیسی معصوم اور محبت میں ڈوبی لڑکی کے لیے بہت تھا۔ اس کی نظروں میں نموز کا جو ایک سمجھ دار اور شریف قسم کا امیج بنا ہوا تھا، اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے کبھی بھی اس سے لگاوٹ بھری باتوں کی توقع نہیں کی تھی اور جب کوئی توقع ہی نہیں تھی تو اسے اس کی گفتگو میں ان باتوں کی کمی بھی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی قسمت میں لکھ دیے گئے تھے اور یہ ایک اٹل حقیقت تھی اور مہر کے اطمینان قلب کو یہ حقیقت ہی کافی تھی۔

سیم جس وقت گھر پہنچا، شام کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ آج اپنی روٹین سے خاصا لیٹ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے زوروں کی بھوک لگی تھی۔

اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے وہ تیز قدموں سے کچن کی طرف بڑھا۔ جہاں فریج میں رکھی، رات بننے والی ہیری کے ہاتھ کی مزیدار چکن کا تصور ہی اس کے منہ میں پانی بھر لایا تھا۔ لیکن جب اس نے فریج کھول کر اندر جھانکا تھا۔ چکن کا مکمل صفایا ہو چکا تھا۔

"کمینے، بدذات!" دانت پیستے ہوئے وہ دروازہ مارتا کچن سے باہر نکلا تھا۔

"ہیری! میکی!" کمر پہ ہاتھ رکھے اس نے بہ آواز بلند دونوں کو پکارا تھا۔ لیکن کوئی جواب نہ پا کے وہ تیز

قدموں سے اپنے مشترکہ کمرے کی طرف چلا آیا تھا' جو خالی پڑا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

"پتا نہیں کہاں دفعان ہو گئے ہیں دونوں۔" اس نے اپنے دل کی بھڑاس بے اختیار اردو میں نکالی تھی۔

چند لمحے سوچنے کے بعد وہ ایک بار پھر کچن میں چلا آیا تھا۔ جہاں خالی پڑے چولہے کو بے بسی سے دیکھتے ہوئے وہ ایک بار پھر فریج کھول کے کھڑا ہو گیا تھا۔

"انڈے' بریڈ' دودھ .... اف نہیں کھانے یار!"

کوفت سے منہ بناتے اس نے آخری شیلف پہ نگاہ ڈالی تھی۔ جو سوزی کی چیزوں کے لیے مخصوص تھی۔ اور وہاں رکھا شیشے کا ایک ڈھکا ہوا پیالہ دیکھ کر وہ رہ نہیں سکا تھا۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کے پیالہ نکال لیا تھا اور جوں ہی ڈھکن اٹھا کر اندر دیکھا' اس کا دل باغ باغ ہو گیا تھا۔ نہایت خوش رنگ اور خوش نما قسم کے میکرونیز' سبزیاں اور چکن ڈال کے پکائی گئی تھیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' جھٹ پیالہ اٹھا کے مائیکرو ویو میں رکھ دیا تھا اور بزر بجنے پر انہیں لیے لیونگ روم میں آ بیٹھا تھا۔

"ہم م' م .... مزے دار ہیں بھئی۔" پہلا چمچ منہ میں رکھتے ہی اسے ان کے خوش ذائقہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار اگلا چمچ اٹھایا تھا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ ریموٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ رغبت سے کھا رہا تھا اور سامنے ٹی وی پر اپنے پسندیدہ ایکٹر کی فلم بھی دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں مزیدار کاموں میں وہ اتنا مگن تھا کہ کب سوزی اپنے کمرے سے نکلی اور کب اس کی پشت سے گزر کر کچن میں جا پہنچی' اسے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تو جب وہاں پھیلی میکرونیز کی خوشبو نے اسے چونکایا تو اس نے بے اختیار فریج کھول کے اندر جھانکا۔ اور وہاں سے اپنا پیالہ غائب پا کے اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے کچن سے نکل کر سیم کو گھورا جو ٹی وی دیکھتے ہوئے کچھ کھا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھی اور سیم کے ہاتھ میں اپنا خالی ہوتا پیالہ دیکھ کے اس کی بھنویں تن گئیں۔

"ایکسکیوزمی مسٹر!" اس کی اچانک پکار پہ سیم نے چونکتے ہوئے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور سوزی کو دیکھ کر وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا۔ مگر صرف ایک لمحے کے لیے۔ اگلے ہی پل اس نے سرعت سے خود کو سنبھال لیا۔

"کھانا ہی تو تھا' کوئی ہیرے موتی تو نہیں تھے۔" .... دل میں سوچتے ہوئے اس نے پرسکون انداز میں پیشانی پہ بل لیے کھڑی سوزی کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اس نے انگلی سے سیم کے ہاتھ میں پکڑے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے بہت بھوک لگی تھی اور گھر میں کھانے کو کچھ بھی خاص نہیں تھا۔ اس لیے جب مجھے یہ نظر آئے تو....." وہ اس کے چہرے کے سخت تاثرات دیکھ کے بے اختیار خاموش ہو گیا۔ تب ہی اس کی ناراضی اور اپنی حرکت کا اثر زائل کرنے کا ایک مناسب طریقہ اسے سوجھ گیا۔ "تم آج کا ڈنر ہماری طرف سے کر لینا۔" مگر وہ اس کی بات ان سنی کیے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالتی' پلٹ کر تیز قدموں سے کچن میں جا گھسی۔

اس کے جانے کے بعد سیم نے رخ موڑتے ہوئے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے پیالے پہ ڈالی۔ سوزی کے رد عمل نے اس کی باقی ماندہ بھوک محض چند ہی لمحوں میں اڑا دی تھی۔ اس نے مزید ایک بھی لقمہ لیے بغیر پیالہ ہاتھ بڑھا کے سامنے پڑی میز پہ رکھ دیا تھا۔ تب ہی کچن سے برتن پٹخنے اور کیبنٹ کے دروازے زور زور سے کھولنے اور بند کرنے کی آواز آئی تھی۔ اور سیم نے مارے شرمندگی کے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا تھا۔

"کیا ضرورت تھی بھلا اسے اس لڑکی کی چیز کو ہاتھ لگانے کی؟" خود کو ڈپٹتے ہوئے اس نے کچن سے آتی اٹھا پٹخ کی آوازوں کو تحمل سے برداشت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب مزید حوصلے سے کام نہیں لے سکا۔ تو اپنی جگہ سے اٹھ کر کچن کے دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ جہاں اس کے اندازے کے عین مطابق وہ

اندر کچھ پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔
"آئی ایم سوری سوزی۔ تم پلیز یہ سب مت کرو اور آج کا ڈنر۔۔۔"
"اپنے مشورے اپنے پاس رکھو' سمجھے!" اس نے پلٹ کر تلخ لہجے میں اس کی بات کاٹی تو اس درجہ بدتمیزی پر سیم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا؟" اس نے غصے سے سامنے کھڑی بدتمیز لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے جتنا انسانیت سے پیش آنے کی کوشش کر رہا تھا' وہ اتنا ہی سر پہ چڑھتی جا رہی تھی۔
"تم جیسوں سے بات کرنے کا یہی طریقہ ہے میرا۔" وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے تڑخ کر بولی تو سیم کا دماغ گھوم گیا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا تم جیسے۔۔۔ ہاں؟" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ "شکر کرو محترمہ! کہ مجھ جیسا' تم جیسی سے بات بھی کر رہا ہے۔ ورنہ تم جیسی سائیکو لڑکی کو تو کوئی ایک منٹ بھی برداشت نہ کرے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اگلے پچھلے سارے حساب برابر کر دیے تھے۔ لیکن سوزی اس کے اشتعال کو خاطر میں لائے بغیر استہزائیہ انداز میں مسکرا دی تھی۔
"ہونہہ! تم جیسوں سے ایک ہی جواب کی امید ہے مجھے۔" کاٹ دار نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالتی وہ سلیب پہ رکھے گوشت کی طرف متوجہ ہونے کو تھی جب اس کا بازو سیم کی مضبوط گرفت میں آ گیا۔
"زبان سنبھال کر بات کرو!" ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے وہ اس زور سے دھاڑا کہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو یقیناً" سہم جاتی۔ لیکن مقابل بھی سوزی تھی۔ جس پہ اس کی بلند آواز نے الٹا اثر دکھایا تھا۔
"نہیں کرتی ہاں؟ کیا کر لو گے تم؟" اس نے دوسرے ہاتھ سے سیم کو پیچھے دھکیلا تھا اور تب اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ اس نے غراتے ہوئے اس کا دوسرا ہاتھ جکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے پیچھے کیبنٹ سے لگا دیا تھا۔
"اب تمہیں بتاتا ہوں۔ کیا کر سکتا ہوں میں؟" دانت پیستے ہوئے اس نے اس کی کلائیوں پہ زور بڑھایا تو سوزی کی بے اختیار چیخ نکل گئی۔
"آہ! چھوڑو مجھے! پلیز رکی! چھوڑو مجھے!" اس کی گرفت میں مچلتے ہوئے وہ بھرائی ہوئی آواز میں چلائی تو غصے سے بھڑکتا ہوا سیم یک لخت ساکت ہو گیا۔ عین اسی لمحے سوزی کو بھی شاید اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ کیونکہ اس کا مچلنا وجود بھی تھم گیا تھا۔
اس کی آنسوؤں بھری آنکھیں سیم کے چہرے کی طرف اٹھی تھیں۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائی تھیں اور سیم کی گرفت اس کی کلائیوں پر خود بہ خود ڈھیلی پڑ گئی تھی۔
"میں رکی نہیں' سیم ہوں۔ اور اسی لیے تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔" اسے مضبوط لہجے میں باور کرواتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے اس کی کلائیاں چھوڑ کے پیچھے ہٹا تو سوزی بت بنی اسے دیکھے چلی گئی۔
"مجھے نہیں پتا کہ تم اپنی زندگی میں کن حالات سے گزری ہو۔ لیکن میں صرف اتنا کہوں گا کہ کسی ایک برے شخص کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف پہنچانے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔"
اس پر نظریں جمائے وہ سپاٹ لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا' پلٹ کر کچن اور پھر اپارٹمنٹ سے ہی باہر نکل گیا تھا۔ اور پیچھے تنہا کھڑی سوزی بے اختیار رو پڑی تھی۔

سیم کے رویے اور باتوں نے سوزی کو گہری ندامت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے واقعی کوئی حق نہ تھا کہ وہ اپنے تلخ تجربے کو بنیاد بنا کر دوسروں کے ساتھ برے طریقے سے پیش آتی۔ کل شام جو کچھ ہوا تھا' اس نے سوزی کو اس کے رویے کی بدصورتی کا احساس دلایا تھا۔

وہ سیم سے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگنے کے لیے بری

طرح بے چین تھی۔ مگر مارک اور ہیری کے سامنے اس میں سیم کے پاس جانے کی ہمت نہ تھی اور تنہائی انہیں میسر آ کے نہیں دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ دو دن گزر گئے تھے اور اس کی بے چینی ایک بوجھ میں بدل گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ تیسرا دن چڑھتا' وہ رات میں اپنے لیے کافی بنا رہی تھی جب مارک اور ہیری بکتے جھکتے ختم ہو جانے والی بیئر خریدنے باہر نکلے تھے۔

ان کی بحث پہ اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور جونہی انہوں نے گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔ اس نے جھٹ کافی میکر میں پانی بڑھا دیا تھا۔ کافی کے گرما گرم دو مگ تیار کر کے وہ — جھجکتے ہوئے کچن کے دروازے تک آئی تھی۔

سیم لیونگ روم میں ٹی وی کے آگے صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر سوزی کے دل کی دھڑکن پل بھر کو تیز ہوئی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی گرتی ہوئی ہمت بحال کی تھی اور دونوں ہاتھوں میں مگ لیے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی سینٹر ٹیبل کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ اسے یوں اچانک سامنے آتا دیکھ کے سیم کی نگاہیں میکانکی انداز میں سکرین سے ہٹ کر سوزی پہ آٹھہری تھیں۔ جو جھک کر ہاتھ میں پکڑے مگ ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی سیم کی آنکھوں میں حیرت پھیل گئی تھی۔

"میں تمہارے لیے کافی بنا کر لائی ہوں۔" سیدھی ہوتے ہوئے اس نے سیم کی آنکھوں میں دیکھا۔ تو اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری ہو گیا۔

"کس لیے؟" اس کے سپاٹ لہجے پہ سوزی پل بھر کو جھجکی پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"اس لیے کہ تم رکی نہیں ہو۔" پھر اپنا دایاں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ نموز ابراہیم اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو حیران نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

اور پھر آنے والے دنوں میں سوزی کے ساتھ ان کی دوستی بہت تیزی سے پروان چڑھی تھی۔

لیکن سیم کے ساتھ اس کا رشتہ صرف دوستی تک محدود نہیں رہا تھا۔ وہ سیم کو پسند کرنے لگی تھی اور اپنی اس پسندیدگی کا اظہار اس نے برملا سب کے سامنے سیم سے کیا تھا۔ وہ فطرتاً "ایک بے جھجک لڑکی تھی جو اپنی جون میں آتے ہی اپنی عادات پر بھی لوٹ آئی تھی۔ اس کی بے باکی سے سیم نے خاصا حظ اٹھایا تھا۔ لیکن بات صرف وہیں تک محدود نہیں رہی تھی۔ اس کی دن رات کی وارفتگی آخر کار رنگ لائی تھی۔ اور سیم' سوزی جیفر سین کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دن اور رات ایک دوسرے کے تعاقب میں تیزی سے آگے بڑھے تھے اور پلک جھپکتے میں سوا دو سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس دوران حنان کے ایک بار بھی پاکستان آنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور وجہ صغیر صاحب تھے۔ جنہوں نے اس عرصے میں لندن کے تین چار چکر لگا لیے تھے۔ یوں حنان اپنی چھٹیوں میں کبھی یورپ گھومنے اور کبھی کوئی کورس کرنے نکل کھڑا ہوتا تھا۔ اور اب اس کی واپسی میں فقط دو سے تین ماہ کا عرصہ رہ گیا تھا۔ وقت نے سب ہی پہ اپنے نقش چھوڑے تھے۔ ہر کوئی ذہنی اور جذباتی اعتبار سے ایک قدم آگے آیا تھا۔ اور ایسے میں مہر کو ہنی کی ذات سے متعلق اپنے بہت سے گمان غلط ثابت ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

دو ڈھائی سال قبل وہ اس کے جس رویے کو اس کی بردباری مشروط کیا کرتی تھی آج اس میں اسے ہنی کے گریز اور لاتعلقی کے رنگ واضح طور پہ نظر آنے لگے تھے۔ اس کی زندگی میں مہر کی یا اس رشتے کی کتنی اہمیت تھی اس کا اندازہ ان گزرے سالوں میں اسے باخوبی ہو گیا تھا۔

Yale جانے کے بعد اس کی فقط چند منٹوں پر محیط' پانچ یا چھ کالیں انہیں موصول ہوئی تھیں۔ جن میں کہیں بھی مہر سے خاص طور پہ بات کرنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ ان دونوں کی جب بھی بات ہوتی

تھی' زیب کے خود ہی مہر کو فون تھما دینے کے نتیجے میں ہوئی تھی اور اب تو ایک عرصے سے فون کی یہ فارملیٹی بھی ختم کر دی گئی تھی۔ صرف انجم اور ابراہیم صاحب تھے جو مستقل ان سے رابطے میں تھے اور ان ہی کے ذریعے ہنی کی خیر خبر اور بے تحاشا مصروفیت کی اطلاع انہیں ملتی رہتی تھی۔ وگرنہ وہ خود کہاں اور کس حال میں تھا کم از کم مہر اور اس کے والدین اس حقیقت سے مکمل طور پر لاعلم تھے۔

اس لاعلمی نے مہر کو پریشان نہیں بلکہ متوحش کر دیا تھا۔ ثمروز ابراہیم اس کی کل کائنات میں ڈھل چکا تھا' لیکن ثمروز کی کائنات میں مہر احمد نامی لڑکی کا کہیں گزر بھی تھا؟ وہ انجان تھی اور یہ بے خبری' یہ بے بسی ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے مستقبل کو مزید بے نام و نشان منزلوں کی جانب دھکیلتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کے ان کہے خوف خود ہی اس کی ماں کی زبان پہ بھی آ ٹھہرے تھے۔ اور اس روز مہر نے جانا تھا کہ ماں' ماں ہوتی ہے وہ اولاد کے دل کا بھید اس کی آنکھوں' چہروں حتیٰ کہ ان کی سانس کے زیر و بم سے بھی پا لیتی ہے اور اس دن اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ زیب بیگم کے لیے چائے لے کر ان کے کمرے میں گئی تھی۔ جب انجم بیگم کا فون آ گیا تھا۔ وہ بے دلی سے کپ ماں کے سرہانے رکھ کے پلٹنے کو تھی جب انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

مہر کی بوجھل نگاہیں ماں کے چہرے پہ آ ٹھہری تھیں۔ جو آج نجانے کیوں اسے صبح سے ہی خاصی پریشان اور تھکی تھکی سی لگ رہی تھیں۔

ادھر ادھر کی باتوں کا غائب دماغی سے جواب دیتے ہوئے انہوں نے ایک نظر پاس بیٹھی مہر پہ ڈالی تھی اور پھر اک گہری سانس لیتے ہوئے بہن سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"آج ایک بات بتائیں گی آپا۔"

"پوچھو زیبی۔" ان کی اچانک تمہید پہ انجم ٹھٹک گئی تھیں۔

"ہنی' مہر سے اپنے رشتے کو نبھانے کے لیے راضی ہے یا نہیں؟" اور ان کے برابر بیٹھی مہر' ماں کے منہ سے اس درجہ غیر متوقع اور دو ٹوک انداز میں کیا گیا سوال سن کے ساکت رہ گئی تھی۔ جبکہ لائن کے دوسری طرف ایک پل کو خاموشی چھا گئی تھی۔ جسے محسوس کرتے ہوئے زیب بیگم کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا۔

"آپا!" انہوں نے بے اختیار بہن کو پکارا تو مہر کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ اس کی ماں پر جمی نگاہوں میں یکایک خوف ہلکورے کھانے لگا اور دوسری طرف موجود انجم بیگم کو لگا جیسے ان کے امتحان کی گھڑی آ گئی ہو۔ وہ گھڑی جس کے آنے سے وہ خوف زدہ تھیں۔

"زیبی!" چند جاں گسل لمحوں کے بعد ان کی بھرائی ہوئی آواز زیب کے کانوں سے ٹکرائی تو انہیں اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔

"پلیز آپا! خدا کے لیے مجھے کوئی برا جواب مت دیجیے گا۔" انہوں نے کانپتے لہجے میں استدعا کی۔ تو مہر کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔

"اللہ نہ کرے کہ میں تمہیں کوئی برا جواب دوں زیبی! لیکن سچ یہ ہے کہ میرے پاس تمہیں دینے کو فی الحال کوئی مثبت جواب بھی نہیں۔ میں خود تمہاری اور مہر کی طرح بیچ راہ میں امید کا دامن تھامے کھڑی ہوں۔"

"پھر؟" زیب نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"پھر یہ کہ تم مجھے چند دن کی مہلت دو۔"

اور زیب میں اپنی بچی کے سامنے اتنا حوصلہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ بہن سے یہ پوچھ لیتیں کہ اگر ان چند دنوں میں بھی وہ کچھ نہ کر پائیں تو۔۔۔؟

"ٹھیک ہے میں آپ کے فون کا انتظار کروں گی۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے دھیرے سے کہا تو انجم اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتی مسکرا دیں۔

"خوش رہو۔ سلامت رہو اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ۔ اچھا آپا فون رکھتی ہوں۔" دل گرفتی سے کہتے ہوئے انہوں نے فون بند کردیا تو اب تک سولی پہ ٹنگی بیٹھی مہر نے ماں کا ہاتھ جکڑ لیا۔

"امی' امی! سب ٹھیک تو ہے ناں؟ ہنی اس رشتے سے خوش تو ہیں ناں؟"

"ہاں میری جان! سب ٹھیک ہے۔" اپنی پریشانی دل میں چھپائے انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے سینے سے لگالیا تو اتنے عرصے سے مہر کے اندر سانس لیتا خوف آنسو بن کر بہنے لگا۔

"امی! میں ہنی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔۔ میں ان کے علاوہ کسی اور کے بارے میں اب سوچ بھی نہیں سکتی۔" ان کے سینے میں منہ چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔ تو زیب کی اپنی آنکھوں سے آنسو ایک قطار کی صورت گرنے لگے۔

"یا اللہ۔ یہ کیسی آزمائش ہم پر آپڑی ہے۔ تو میری بچی کے حال پہ رحم فرمادے میرے مولا۔ اس کے نصیب میں کوئی دکھ نہ لکھنا یارب!" اسے خود میں سموئے انہوں نے دل کی گہرائیوں سے اپنے اللہ سے استدعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟" مارک نے بے یقینی سے اپنے سامنے بیٹھے سیم کی طرف دیکھا۔

"اس میں اتنی حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟" سیم نے ابرو چڑھائے۔

"حیران ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن تم ایک مسلم فیملی سے تعلق رکھتے ہو۔ ایسے میں یہ سب۔۔۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے مارک جھجک کر خاموش ہو گیا۔

"ارے یار۔۔۔" سیم نے مسکراتے ہوئے کان پہ سے مکھی اڑائی۔ "میں کوئی دقیانوسی قسم کا مسلم نہیں ہوں۔"

"لیکن تمہارے ماں باپ تو اس بات کو مائنڈ کر سکتے ہیں۔" مارک نے اسے دیکھا۔

"ہاں کر سکتے ہیں۔ لیکن بہر کیف یہ میری زندگی ہے۔ اور میں اسے اپنی مرضی سے گزارنے کا پورا پورا حق رکھتا ہوں۔" اس کے چہرے پہ نظریں جمائے سیم نے قطعیت سے کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" مارک نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"بس تم دونوں اس بات کا خیال رکھنا کہ اول تو میری فیملی مجھے بنا بتائے یہاں آئے گی نہیں لیکن اگر کبھی ایسا اتفاق ہوا کہ میرے پیرنٹس مجھ سے ملنے اچانک چلے آئے تو انہیں یہ ہرگز مت بتانا کہ میں یہاں سے دوسری جگہ شفٹ ہو گیا ہوں۔"

"تو کیا تم انہیں اپنے اس فیصلے سے آگاہ نہیں کرنے والے؟" مارک اس کی بات سن کر چونکا۔

"میرا دماغ خراب ہے کیا۔" سیم نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔

"میرے خیال میں سیم! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" مارک نے سنجیدگی سے کہا۔ تو سیم بدک گیا۔

"او میرے بھائی! تم تو اپنے یہ اچھے بیٹے والے مشورے رہنے ہی دو۔۔۔ قسم سے تمہاری باتیں اور حرکتیں دیکھ کے کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ تم غلط جگہ پیدا ہو گئے ہو۔"

"اچھا؟" مارک نے مسکراتے ہوئے ابرو اچکائے "تو تمہارے خیال میں مجھے کہاں پیدا ہونا چاہیے تھا؟"

"پاکستان' انڈیا' بنگلہ دیش یا ایسٹ میں کہیں بھی لیکن کم از کم امریکہ میں تو بالکل بھی نہیں۔ عجیب مشرقی انداز فکر ہے تمہارا۔" سیم نے ہنستے ہوئے اس کی پر خلوص اور نرم طبیعت پہ چوٹ کی تو مارک کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تو سیدھے سیدھے یوں کیوں نہیں کہتے بھائی! کہ ہم امریکن بے حس ہوتے ہیں۔"

"اس میں کوئی شک ہے بھلا۔" سیم اس کی جانب دیکھتا شرارت سے مسکرایا۔

"شاباش۔" مارک نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔ "اپنے بارے میں کیا خیال ہے مسٹر؟"

"میں؟ میں تو شاہی بندہ ہوں یار۔ مجھے تو سات خون معاف ہیں۔" وہ شانِ بے نیازی سے بولا تو مارک نے ہنستے ہوئے پاس پڑا کشن بادشاہ سلامت کے منہ پر دے مارا۔

☼ ☼ ☼

کمرے کی خاموش فضا میں انجم بیگم کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ان کے مقابل بیٹھے ابراہیم ملک بھینچے ہوئے لبوں پہ مٹھی جمائے، چہرے پہ الجھی ہوئی سوچوں کا جال لیے بالکل خاموش تھے۔

"آپ سوچ نہیں سکتے" آج میرے دل پہ کیا گزری ہے۔ اپنی بہن کو دینے کے لیے آج میرے پاس ایک واضح اور مثبت جواب تک نہیں تھا اور یہ سب اس لڑکے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسے سرے سے مہو اور اس سے جڑے رشتے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جب تک یہاں تھا میں وقتاً فوقتاً" اسے بہت کچھ باور کرواتی رہتی تھی۔ لیکن اب تو جیسے ہر چیز ہاتھ سے نکل گئی ہے... کہیں یہ لڑکا ہم سے کچھ چھپا تو نہیں رہا ابراہیم صاحب؟" بات کرتے کرتے انہوں نے اچانک خوف زدہ نظروں سے ابراہیم ملک کی طرف دیکھا تھا۔ جو خود بھی ان کی بات سن کر ساکت ہو گئے تھے۔

"میں آپ کو بتا رہی ہوں، مجھے اس لڑکے کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے... اس سے پہلے کہ یہاں کی بے حجاب فضائیں کوئی رنگ لے آئیں۔ آپ ہنی کی بے زاری کی اصل وجہ پتا کروانے کی کوشش کریں۔"

"اگر وہ کوئی کھیل ہم سے چھپ کر کھیل رہا ہے انجم! تو وہ کبھی بھی ہمیں اس کی ہوا نہیں لگنے دے گا۔"

"تو پھر ہم کیا کریں گے؟" ان کی سرخ آنکھوں میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔

"ایک طریقہ ہے۔" انہوں نے پرسوچ نگاہوں سے انجم بیگم کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا تھا اور

مزید کچھ کہے بنا اٹھ کر ایک طرف رکھے فون کی جانب چلے آئے تھے۔

جانا پہچانا نمبر ملانے کے بعد وہ کارڈلیس لیے صوفے پہ آبیٹھے تھے۔ اس دوران انجم کی بے چین نظریں ان پہ ہی مرکوز تھیں۔

"کیسے ہو اینڈریو؟" چند سیکنڈ کے توقف کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی تو ابراہیم صاحب کے تاثرات میں قدرے نرمی در آئی۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ نئی جاب کیسی جا رہی ہے؟" انہوں نے اخلاقیات نبھائی۔ اینڈریو ان کی فرم میں کچھ عرصے پہلے تک ملازمت کرتا رہا تھا اور ابھی چند ماہ پہلے ہی نیو ہیون شفٹ ہوا تھا۔ "اچھا اینڈی۔ مجھے تم سے ایک کام ہے...."

وہ اصل مدعا کی جانب آئے تھے۔ اور پھر دھیرے دھیرے اسے کام کی نوعیت سمجھانے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

اتوار کی چھٹی کے باعث صغیر صاحب کے کزن کی فیملی شام میں آئی ہوئی تھی۔ مہمانوں کی آمد نے گھر میں رونق بکھیر رکھی تھی۔ ایسے میں مہر اور جاشی کچن میں گھسی لوازمات کی تیاری میں مصروف تھیں۔ جب نویرہ باہر سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

"آپی! جاشی! دو دن بعد حنان بھائی آ رہے ہیں۔" اس نے پرجوش لہجے میں اطلاع دی تو اس اچانک آمد کی خبر پہ جہاں مہر ساکت رہ گئی وہیں جائشہ خوشی سے کھل اٹھی۔

"کیا؟ تمہیں کس نے بتایا؟"

"ابھی ڈیڈی کو ان کا فون آیا تھا۔" نویرہ کے جواب پر جائشہ تیز قدموں سے باہر کو لپکی تھی اور مہر کو اپنے بوجھل دل پہ مزید بوجھ بڑھتا محسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

حنان کی اچانک آمد کی اطلاع نے پورے گھر میں ہلچل سی مچادی تھی۔ خاص صفائیاں، اسپیشل تیاریاں، ڈرائنگ روم کے کارپٹ اور فرنیچر کی ارجنٹ

تبدیلی۔ ان دو دنوں میں گھر کا کوئی کونا نہیں بچا تھا۔ جس پہ زیب بیگم نے نظرِ ثانی نہ کی ہو۔ اور ان کی یہ دیوانگی مہر کے ملال میں ڈھیروں اضافہ کر گئی تھی۔

وہ کس کے لیے اس درجہ مامتا نچھاور کرتی پھر رہی تھیں؟ وہ جس نے آج تک انہیں امی کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ حیرت کی بات تھی لیکن حنان نے ساری زندگی "آپ جناب" سے گزارا کیا تھا، مگر انہیں اپنی ماں ہونے کا اعزاز نہیں بخشا تھا اور یہ نفرت یہ حقارت وہ بھی اپنی ماں کے لیے سہنا مہر کی برداشت سے باہر تھا اور اب جب وہ زیب بیگم کو پچھلے دو دنوں سے اس کے استقبال کی تیاریوں میں گھن چکر بنا دیکھ رہی تھی تو اس کی ساری خفگی کا رخ خود زیب بیگم کی ذات کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ جو ہر بار نجانے کیسے اس لڑکے کے ساتھ اتنی فراخدلی سے پیش آنے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔

"مہو! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں بیٹا۔ فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔" وہ اپنے کمرے میں بند کتاب پڑھ رہی تھی۔ جب دروازہ کھول کے زیب اندر داخل ہوئی تھیں۔ اسے یونہی بیٹھا دیکھ کے وہ چونک گئی تھیں۔

"آفرین ہے امی آپ پہ۔ آپ کیا سوچ کر مجھے ایئرپورٹ چلنے کے لیے کہہ رہی ہیں؟" اس نے ہاتھ میں پکڑا ناول ایک طرف پٹخ دیا تھا۔

"بری بات ہے بیٹا۔ بھائی ہے تمہارا۔" ان کے رسان سے کہنے پہ مہر کے تلووں سے لگی تھی اور سر پہ بجھی تھی۔ وہ غصے سے کھولتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ساری زندگی ناز نخرے اٹھا اٹھا کے بھی آپ اسے اپنا بیٹا تو بنا نہ سکیں امی! میرا بھائی کہاں سے بن گیا وہ۔" اور زیب اس کے لہجے کی سختی اور چہرے سے چھلکتا اشتعال دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟" انہوں نے فہمائشی نظروں سے مہر کو گھورا۔

"شکر ہے آپ کو میرا لہجہ نوٹ کرنے کی فرصت تو

ملی۔" ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو کر گزر گئی۔ "وہ شخص آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے کا روادار نہیں اور آپ۔۔۔"

"بس یہیں چپ ہو جاؤ!" انہوں نے با آواز بلند اسے ٹوکا تو مہر کی زبان خاموش ہو گئی۔

"مجھے حنان یا کسی بھی انسان سے عزت چاہیے بھی نہیں۔ کیونکہ عزت دینا انسانی وصف ہی نہیں میں نے اپنی مرتی ہوئی سہیلی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بچوں کا ماں بن کے خیال رکھوں گی اور میں اپنا وہی وعدہ پورا کر رہی ہوں۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی زندگی کی اس تگ و دو کو محض ایک جملے میں سمیٹ دیا تو مہر کے غصے پہ ندامت کے چھینٹے پڑنے لگے۔

"مگر امی! میرا دل جلتا ہے جب میں یہ سوچتی ہوں کہ اس شخص نے آج تک آپ کو ماں کہہ کر نہیں پکارا۔" مہر کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلنے لگی تھی۔ اس کی دلی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے زیب بھی دھیمی پڑ گئی تھیں۔

"صرف تمہارا نہیں میرا بھی دل جلتا ہے۔ بیٹا۔ لیکن تم ہی بتاؤ کیا حنان اتنا اہم ہے کہ میں اس کے پیچھے تمہارے ڈیڈی کی ذات سے ملنے والی محبت، عزت اور مان کو بھلا دوں؟ اس اعلا ظرفی کو بھلا دوں جو انہوں نے تمہیں اپنے سینے سے لگا کر دکھائی۔" انہوں نے پیار سے اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے سوال کیا۔ تو مہر نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

"مجھ سے محبت کرنا ان کا فرض تھا۔ لیکن تم سے محبت کرنا ان کا ذاتی فیصلہ تھا۔ اور ہر مرد میں یہ ظرف اور ہمت نہیں ہوا کرتی۔۔۔ تم اپنے فیصلوں میں میری طرف سے مکمل طور پہ آزاد ہو۔ میں تمہیں کبھی پریشرائز کر کے پریشان نہیں کروں گی۔ مگر حنان کے ساتھ اپنا رویہ طے کرتے ہوئے یہ بات یاد رکھنا مہر کہ وہ تمہارے ڈیڈی کا بیٹا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے مہر کے لیے آزمائش کا نیا در کھول دیا تھا۔ کاش کہ اسے علم ہوتا کہ وہ جن محبتوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول کر رہی ہے، ان کا کبھی اسے خراج بھی ادا کرنا ہوگا، تو وہ کبھی جھولی بھر بھر کے انہیں نہ سمیٹتی۔

☼ ☼ ☼

"دھوکا" پانچ حرفوں سے بنا ایک لفظ۔ جسے انہوں نے بارہا سنا، پڑھا اور بولا تھا۔ مگر جس کی اذیت کو پوری شدت سے سہنے کا تجربہ انہیں آج پہلی بار ہوا تھا۔ کیونکہ اس لفظ کو اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ انہیں سمجھانے والا کوئی اور نہیں بلکہ ان کا اپنا بیٹا تھا۔ وہ بیٹا جو ان کی کل کائنات تھا۔ ان کی آنے والی نسلوں کا امین تھا۔

اینڈریو کے الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ۔ ابراہیم صاحب کو لگا تھا جیسے ان سے سننے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو۔

"کیا؟" انہوں نے لرزتے وجود کے ساتھ دیوار کا سہارا لیا تھا۔

"جی سر۔ آپ کا بیٹا سیم یہاں ایک امریکن لڑکی کے ساتھ Live in relationship (بغیر شادی کے ایک ساتھ رہنا) میں رہ رہا ہے۔" اور ابراہیم ملک کو لگا تھا جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے ـــــ زمین اور آسمان گھوم گئے تھے۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مہر ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ اپنی کزن جائشہ کی منگنی کی تقریب میں اس لیے شرکت نہیں کرنا چاہتی کہ وہ حنان سے سامنا نہیں چاہتی جو جائشہ کا بھائی ہے۔ یہ جان کر حنان ملک سے باہر ہے۔ وہ تقریب میں شرکت کے لیے چلی جاتی ہے۔ لیکن حنان وہاں آجاتا ہے۔ مہر اسے دیکھ کر اپنے گھر واپس آنے کے لیے نکلتی ہے تو حنان سے سامنا ہوتا ہے۔ مہر کے نفرت بھرے رویے پر وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس توہین کو معاف نہیں کرے گا۔ حنان' زیب بیگم اور صغیر صاحب پر زور دیتا ہے کہ اب مہر کی زندگی کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ وہ کب تک اس طرح کی زندگی گزارتی رہے گی۔ مہر کا نکاح بچپن میں ہوچکا ہے۔

انجم بیگم اور زیب بیگم دونوں بہنیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ مہر کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہو' لیکن صغیر صاحب اس کے لیے راضی نہیں۔ زیب بیگم کو حنان کے گندے کردار کا بھی اندازہ ہے۔

سیم اپنے ماں' باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ نازو نعم میں پرورش پائی۔ اس کی زندگی کی اولین ترجیح دولت ہے۔ وہ امریکہ میں تنہا رہتا ہے اور اپنی ذاتی فرم کا مالک ہے۔ جس میں اس کا دوست مارک شریک ہے۔ وہ آزاد زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے

مکمل ناول

سوزی سے اپنی پسند سے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک بار گرل لورین اس کی زندگی میں آئی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتی ہے۔ پھر ایک دن اس کے فلیٹ کا صفایا کرکے اس کو کچرے کے ڈھیر پر پھنکوا دیتی ہے۔ زمین پر اس کے وجود پر ٹھوکریں مارتی ہے۔ سیم ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی آنکھ اسپتال میں کھلتی ہے۔ اس کا پارٹنر اور دوست مارک اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

سیم پر اس حادثے کا گہرا اثر ہے۔ وہ گم صم ہے۔ اسے بار بار وہ خواب یاد آتا ہے جو اس نے بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ تاریک انجان گلیوں میں دو بھوکے کتے اس کا پیچھا کررہے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ وہ چلا چلا کر مدد مانگ رہا ہے لیکن سب دروازے بند ہیں۔ تب اچانک ایک دروازہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن اندر نہیں جاتا۔ دوبارہ بھاگنے لگتا ہے۔ تب وہ کچرے کے ڈھیر پر جاگرتا ہے اور تیز بدبو اس کی ناک اور منہ میں گھسنے لگتی ہے۔

اس حادثے کے بعد سیم پہلی بار اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور تب اس کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ کس پناہ گاہ کے دروازے کو کھلا چھوڑ آیا ہے؟

حنان جسے پیار سے ہنی کہتے ہیں صغیر احمد کی پہلی بیوی کا بیٹا ہے۔ اس نے آج تک زیب بیگم کو اپنی ماں تسلیم نہیں کیا۔ مہر زیب بیگم کے پہلے شوہر کی بیٹی ہے۔ حنان اس پر بری نظر رکھتا ہے۔

تموز جو خود کو سیم کہلواتا ہے۔ اس کا نکاح بچپن میں مہر سے کردیا گیا لیکن مہر اسے پسند نہیں ہے۔ تموز اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آتا ہے تو یہ جان کر کہ اس کا نکاح تموز سے ہوچکا ہے، وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہے۔

سیم ایک گھر کرائے پر لے کر سوزی کے ساتھ بغیر نکاح کے رہنے لگتا ہے۔ ابراہیم صاحب کو یہ جان کر شدید دھکا لگتا ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

فیصلہ ہوگیا تھا۔ مہر احمد نہ تو کم ظرف تھی اور نہ ہی احسان فراموش۔ اس نے دل کو ایک طرف رکھا اور مصلحتوں کی انگلی تھامے خاموشی سے سب کے ساتھ ایئرپورٹ چلی آئی تھی۔

فلائٹ کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی جاشی اور نویرہ کے درمیان کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ ان دونوں کی بے چینی مہر کا دل مزید دکھا گئی تھی۔ کاش کہ یہ مان، یہ حق حنان نے اسے بھی دیا ہوتا تو آج وہ بھی اتنی ہی خوشی سے اپنے بھائی کی آمد کی منتظر ہوتی جتنی کہ وہ دونوں تھیں۔ مگر حنان کے بے لچک رویے نے اسے ایک بہت پیارے رشتے سے محروم کردیا تھا۔

اسے اس وقت اپنا آپ قاضی فیملی سے زبردستی جڑا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ ایک ایسا جز جسے کوئی بھی دیکھنے والا بہ آسانی الگ کرسکتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر احساس محرومی سر اٹھانے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے دل میں کروٹیں لیتے درد کو چھپائے ان چاروں سے قدرے ہٹ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

تب ہی اندر سے مسافروں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ مہر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے یونہی انجان چہروں کی اس بھیڑ پہ نگاہ ڈالی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کی بے نیازی سے بھٹکتی نگاہیں ٹھٹک گئی تھیں۔ شیشے کے بڑے سے دروازے کے اس پار مسافروں کے بیچ اسے حنان کھڑا نظر آیا تھا۔

غیر ارادی طور پر مہر کی نظریں اس پہ ٹھہر سی گئی

تھیں۔ وہ پورے سوا دو سال بعد حنان قاضی کو دیکھ رہی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا تھا کہ انگلینڈ کی فضائیں حنان کو خوب راس آئی تھیں۔ وہ پہلے سے بڑھ کر نکھرا ہوا اور شاندار لگ رہا تھا۔ اس کی قابل رشک جسامت اس کے اونچے لمبے قد کو مزید نمایاں کر رہی تھی۔

"کیا پتا ان فضاؤں نے اس کے مزاج پر بھی کوئی مثبت اثرات مرتب کیے ہوں۔" مہر کے دل نے گمان کیا تھا۔

"وہ رہے بھائی۔" جاشی کی پکار پہ مہر نے خاموشی سے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔ وہ بھرپور مسکراہٹ لیے ان کی طرف چلا آیا تھا۔

"السلام علیکم بھائی!" وہ دونوں لپک کر اس کی طرف بڑھی تھیں اور حنان نے بے اختیار ہی دونوں بازو بہنوں کے لیے وا کر دیے تھے۔ اس درجہ وارفتی پہ صغیر صاحب اور زیب بیگم دونوں ہی مسکرانے لگے تھے۔ جبکہ مہر کا چہرہ اپنا بھرم قائم رکھنے کو بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔ ان دونوں سے الگ ہو کے وہ تیز قدموں سے چلتا باپ کے گلے آلگا تھا۔

"السلام علیکم ڈیڈی۔"

"وعلیکم السلام۔ کیسا ہے میرا بیٹا؟" صغیر صاحب نے گرم جوشی سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی تھی۔

"فرسٹ کلاس۔ آپ سنائیں؟" وہ مسکراتے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

اگلی باری زیب بیگم کی تھی۔ حنان قاضی اب کیا کرنے والا تھا مہر شدت سے دیکھنے کی خواہاں تھی۔

باپ سے مل کر حنان کی نظریں زیب بیگم کی طرف اٹھی تھیں اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان میں چمکتی محبت نرمی اور گرم جوشی غائب ہو گئی تھی اور ان کی جگہ عجیب سی سرد مہری نے لے لی تھی۔ جذبوں کی اس واضح تبدیلی نے مہر کو سچ میں حیران کر دیا تھا۔ وہ شاکڈ سے اپنے سامنے کھڑے اس کم ظرف شخص کو دیکھے گئی تھی جس نے زیب بیگم کی طرف اٹھنے والی پہلی ہی نگاہ میں مہر کے نادان دل کی ہر خوش فہمی کو دور کر دیا تھا۔

حنان نے انہیں فقط ایک رسمی سا سلام کیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ زیب جیسی پر خلوص اور در گزر کرنے والی خاتون کے لیے وہ بھی بہت تھا۔ ان کا ہاتھ بے اختیار حنان کی پشت پہ آٹھہرا تھا۔

عین اسی لمحے حنان کی نگاہیں بھی اس کی سمت اٹھی تھیں اور وہ ایک پل کو پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ سیاہ دوپٹے کے ہالے میں مہر کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ لیکن اس چمکتے چہرے پہ سجی اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں حنان کے لیے واضح ناگواری اور غصہ ہلکورے لے رہا تھا۔ جسے محسوس کرتے ہوئے وہ بے اختیار ٹھٹک گیا تھا۔

"السلام علیکم۔" مہر کے مارے باندھے سلام پہ اس نے گہری نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ محض سر کے اشارے سے اسے جواب دیتا اپنے سامان کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

زیب کے سامنے اس درجہ تذلیل پہ مہر کٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جتاتی ہوئی نظر ماں کے چہرے پہ ڈالی تھی اور خاموشی سے رخ موڑ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب گہری نیند سوئی ہوئی انجم سوتے سے اچانک اٹھ بیٹھی تھیں۔ ان کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ٹیبل لیمپ روشن کرتے ہوئے انہوں نے اپنے دائیں جانب دیکھا تھا اور وہاں ابراہیم صاحب کو نہ پا کے ان کا بے چین دل بری طرح گھبرا گیا تھا۔ ابراہیم ملک کمرے میں کہیں بھی نہ تھے۔

تیزی سے خود پہ سے کمبل ہٹاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ننگے پاؤں ہی دروازہ کھول کر باہر چلی آئی تھیں۔ جونہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

لیمپ کی نرم سی روشنی میں ابراہیم صاحب سامنے ہی صوفے پہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھے تھے۔

"ابراہیم! آپ' آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟" وہ اڑ کر ان تک آئی تھیں۔ انہیں یوں اچانک اپنے روبرو پا کے ابراہیم ملک نے سرعت سے اپنے بہتے اشک صاف کیے تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں اور چہرے کی سرخی بھید کھول گئی تھی۔

"آپ' آپ رو رہے ہیں؟" انجم کو لگا تھا جیسے کسی نے ان کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

"کچھ تو بولیں ابراہیم۔ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ میرا۔ میرا بچہ تو ٹھیک ہے ناں؟" متوحش سی ہو کے انہوں نے شوہر کا کندھا ہلایا تھا۔ ان کی یہ فکر یہ تڑپ ابراہیم صاحب کا دل چیر گئی تھی۔ وہ خود پہ سے ہر اختیار کھو بیٹھے تھے۔

"نہیں مرا وہ بدبخت! کاش کہ وہ مر جاتا تو میرے نصیب میں یہ جلن یہ رسوائی تو رقم نہ ہوتی۔" ایک جھٹکے سے ان کا ہاتھ ہٹاتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" انجم نے سہمی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہم ہار گئے انجم۔۔۔ تمہاری تربیت' میرا یقین۔ سب کچھ ہار گیا۔ تمہارا خوف صحیح نکلا۔ یہاں کی بے حجاب فضائیں ہماری شرافت و نجابت کو نگل گئیں انجم!" اور انجم بیگم کی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو گئی۔ ان کی وحشت زدہ آنکھیں ابراہیم صاحب کے شکستہ چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔

"شادی۔۔۔! شادی کر لی ہے نا اس نے۔" سینے پہ ہاتھ رکھے انہوں نے کانپتی آواز میں اپنے بدترین خدشے کا اظہار کیا تھا۔ ان کی سادگی ابراہیم ملک کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔

"تم بہت پیچھے رہ گئیں انجم۔ ہمارے بیٹے نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جہاں ہمارا ذہن پہنچ بھی نہیں سکتا۔" انہوں نے ایک پل کو رک کر اپنی ہمت مجتمع کی۔ وہ ایک امریکی لڑکی کے ساتھ وہاں بغیر شادی کے رہ رہا ہے۔"

اور انجم ابراہیم کو لگا تھا جیسے پورے گھر کی چھت ان کے سر پر آ گری ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے شریک حیات کو دیکھتی صوفے پہ گر سی گئی تھیں۔

"انجم!" ابراہیم صاحب تڑپ کر آگے بڑھے تھے۔ ان کے بازوؤں کا سہارا ملتے ہی انجم بیگم بری طرح رو پڑی تھیں۔

★ ★ ★

ایئرپورٹ سے گھر پہنچنے پر مہر سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ تنہائی میں اس نے اپنے اندر جلتے ہوئے احساس تذلیل کو جی بھر کے آنسوؤں کی صورت بہنے دیا تھا۔ عجیب بات تھی لیکن گھر والوں میں سے کوئی بھی اسے دوبارہ بلانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ شاید سب ہی اس کی کیفیت سے واقف تھے۔ اور پھر یونہی روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ جواب کہیں جا کے شام میں کھلی تھی۔

طبیعت اتنی مکدر ہو رہی تھی کہ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن ایک گرم پیالی چائے کی طلب بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے اپنا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پہ پھیلایا تھا اور دروازہ کھول کے نیچے چلی آئی تھی۔ اپنے لیے ایک اسٹرونگ سا کپ چائے کا بنا کر وہ مگ اٹھائے باہر لان میں آ بیٹھی تھی۔

سمٹتی دھوپ اور قدم جماتی شام میں' وہ آسمان کی نیلگوں وسعت پہ نگاہ جمائے چائے کی چسکیاں لے رہی تھی جب اپنے پیچھے کھٹکے کی آواز سن کر اس نے یونہی پلٹ کر دیکھا تھا اور صغیر صاحب کو وہاں کھڑے دیکھ کر وہ بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"آئیں ڈیڈی۔" اس نے اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ صغیر صاحب نے ایک نظر اس کی سوجی ہوئی آنکھوں پہ ڈالی تھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔

"آئی ایم سوری بیٹا!" انہوں نے مہر کے سر پہ ہاتھ

رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا اور مہر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔ انہوں نے نہ صرف اس کی تکلیف کو محسوس کیا تھا۔ بلکہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی اس کے اکیلے پن پہ اپنا دھیان جمائے رکھا تھا۔ ایسے عظیم انسان کے لیے وہ بھلا کیسے کسی قربانی سے دریغ کر سکتی تھی؟

"پلیز ڈیڈی! مجھے شرمندہ مت کریں۔" اس نے بے اختیار ان کی طرف دیکھا۔ تو صغیر صاحب کے چہرے پہ پھیلا ملال مزید گہرا ہو گیا۔

"نہیں بیٹا! شرمندہ تو میں تم دونوں کے سامنے ہو جاتا ہوں' جب ہر بار حنان' زیب اور تم سے برے طریقے سے پیش آتا ہے۔" وہ دکھ سے بولے تو مہر خاموشی سے نگاہیں جھکا گئی۔ "میں نے سوچا تھا' اتنے عرصے بعد گھر لوٹا ہے۔ تو اس کے رویے میں بھی تبدیلی آگئی ہو گی۔ مگر۔"

وہ افسردگی سے' خاموش ہو گئے تھے۔ ان کی یہ خاموشی مہر کے لبوں پہ اک تاسف بھری مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔ کچھ ایسا ہی گمان اسے بھی تو ہوا تھا۔

"جگہیں بدلنے سے انسان کے دل نہیں بدلا کرتے ڈیڈی۔" اور صغیر قاضی بے اختیار اپنا لب کاٹ کر رہ گئے تھے۔ "حنان بھائی نے مجھے اور امی کو کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ہی آنے والے وقت میں ان سے ایسی کوئی امید رکھنی چاہیے۔" مہر نے ایک تکلیف دہ حقیقت بنا کسی پس و پیش کے ان کے سامنے بیان کی تھی اور صغیر صاحب ایک تھکی ہوئی سانس کھینچ کر رہ گئے تھے۔

"بس اللہ تعالیٰ تمہارا نصیب اچھا کرے بیٹا۔ تم اپنے گھر بار کی ہو جاؤ تو میں بھی اپنے رب کے حضور سرخرو ہو سکوں۔" وہ جس تناظر میں سوچ رہے تھے۔ اسی میں بولے تو مہر کا دل ایک نئی اذیت سے بھر گیا۔

میرا تو آنے والا کل بھی کسی کی بے رخی نے دھندلا ڈالا ہے ڈیڈی۔ جانے میرے نصیب میں کوئی خوشی کاتب تقدیر نے پوری لکھی ہے بھی یا نہیں؟ تاسف سے سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

یم اپنی گاڑی میں سوزی کے ساتھ یونیورسٹی سے واپس آرہا تھا۔ جب اپنے گھر کے ڈرائیووے پہ گاڑی موڑتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ سامنے ہی ابراہیم ملک کھڑے اسے پرسکون نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

انہیں یوں اچانک اپنے سامنے پا کر اس کا ذہن اس حد تک ماؤف ہو گیا تھا کہ وہ ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھانا ہی بھول گیا تھا۔ نتیجتاً" گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" ساتھ بیٹھی سوزی نے موبائل سے

دعائے مغفرت

ہماری بہت اچھی مصنفہ "بشریٰ سعید" اپنی والدہ محترمہ کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑی محرومی ہے۔ ہم بہن بشریٰ سعید کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

نظریں ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو ونڈ اسکرین کے اس پار گھبرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"سامنے میرے ڈیڈ کھڑے ہیں سوزی۔" اس کی بات نے سوزی کو تیزی سے رخ موڑنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ لیکن ڈرائیو وے میں کھڑے اس شخص نے ایک نگاہ غلط بھی اس پہ ڈالنا گوارہ نہیں کی تھی۔ ان کی نظروں کا مرکز صرف اور صرف سیم کی ذات تھی۔

"تم گاڑی میں ہی بیٹھو۔" سوزی کو ہدایت دیتے ہوئے وہ دروازہ کھول کے باہر نکل آیا تھا۔

"آپ یوں اچانک بابا؟" وہ تیز قدموں سے چلتا ان کی طرف آیا تھا۔

"یہاں کب شفٹ ہوئے؟" ان کے اچانک اور غیر متوقع سوال پہ وہ بے اختیار بوکھلا گیا۔

"آ... ہفتہ ہوا ہے۔" اس نے کم سے کم مدت بتانے کی کوشش کی اس سے زیادہ جھوٹ وہ نہیں بول سکتا تھا کیونکہ اندر سارا گھر مکمل طور پہ سیٹ ہوا پڑا تھا۔ میں آپ کو بتانے والا تھا مگر..."

"مگر ٹائم نہیں ملا ہوگا۔" انہوں نے پرسکون انداز میں اس کا جملہ مکمل کیا تھا۔

"جی ٹائم کا ہی مسئلہ تھا۔" اس نے کھسیا کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔

"یہ لڑکی تمہارے ساتھ رہتی ہے؟" بنا اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹائے' انہوں نے انگلی سے سوزی کی طرف اشارہ کیا تو سیم کی نظروں میں گھر میں موجود سوزی کا سامان گھوم گیا۔ وہ بیچ میں بہت برا پھنسا تھا۔

"جی... مگر میرے ساتھ نہیں 'ہمارے ساتھ۔" ابراہیم صاحب اس بات سے واقف تھے کہ عموماً "تین چار اسٹوڈنٹس ایک گھر کو شیئر کرتے تھے۔

"اور کتنے اسٹوڈنٹس ہیں یہاں؟" کوئی اور وقت ہوتا تو وہ باپ کے اتنے سوالوں پہ چڑ جاتا۔ لیکن اس وقت اس کی اپنی سٹی گم تھی۔

"دو لڑکے اور..." اور ابراہیم صاحب کا ہاتھ پوری طاقت سے اس کے چہرے پہ اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ "چٹاخ" کی آواز نے گاڑی میں بیٹھی سوزی کو دم بخود کر دیا تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اس کے کھلے منہ پہ آٹھہرا تھا۔

"مرد بنو مسٹر سیم! اور مردوں کی طرح اپنے دھوکے کو اون (Own) کرنا سیکھو۔" اسے گریبان سے جکڑے وہ سرد لہجے میں غرائے تھے اور ثموزان کے منہ سے اپنے لیے پہلی مرتبہ "سیم" سن کے ساکت رہ گیا تھا۔

"تم نے ابراہیم ملک کو کیا سمجھا تھا؟ کوئی بے وقوف یا اُلو کا پٹھا۔ جس کی ناک کے نیچے تم رنگ رلیاں مناتے رہو گے اور اسے خبر تک نہ ہوگی؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ غصے سے چلائے تو سوزی کے سامنے اس درجہ تذلیل پہ سیم کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔

"گریبان چھوڑیں میرا۔" دانت پیستے ہوئے وہ جیسے پھنکارا تھا۔ مگر ابراہیم صاحب پہ کوئی اثر نہ پا کے اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"میں کہتا ہوں چھوڑیں میرا گریبان۔" دونوں ہاتھوں سے ان کی کلائیاں جکڑتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے خود کو ان کی گرفت سے چھڑا لیا تھا۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ خود کو؟ ہاں میں منا رہا ہوں رنگ رلیاں... کیا بگاڑ لیں گے آپ میرا؟" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ سرکش لہجے میں دھاڑا تو ابراہیم ملک ایک لمحے کو اسے بے یقینی سے دیکھ کر رہ گئے۔ کیا یہ ان کا وہ بیٹا تھا جو ان کی کل کائنات تھا؟

"واہ! کیا انعام دیا ہے بیٹا!" وہ تاسف سے بولتے ایک قدم آگے آئے تھے۔ "ٹھیک ہے اگر یوں ہے تو پھر یونہی سہی۔" ان کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے تھے۔ "بہت شوق ہے نا تمہیں عیاشی کا تو کرو۔ ضرور کرو۔ مگر میں اپنی حق حلال کی کمائی تم سے بدعہد اور بدکردار شخص کو ان ناپاک کاموں میں لٹانے کے لیے مر کر بھی نہیں دوں گا۔ میں نے تمہیں جتنا دینا تھا دے دیا اور تم نے میری پیٹھ میں جتنے خنجر گھونپنے تھے گھونپ دیے۔ اب بس!" انہوں نے بے اختیار انگلی اٹھائی

تھی۔

"میں تمہیں آج، اسی وقت اپنی زندگی سے بے دخل کرتا ہوں۔ تم ہمارے لیے مر گئے۔ آئندہ میرے گھر میں کبھی قدم رکھنے کی غلطی مت کرنا مسٹر سیم۔ کیونکہ میں اجنبیوں کی، وہ بھی دھوکے باز اور بد کردار اجنبیوں کی اپنے گھر میں آمد برداشت نہیں کرتا۔" اسے وارننگ دیتے وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر کو بڑھے تھے اور پیچھے کھڑے سیم کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

"یہ میری زندگی ہے۔ میں اسے جیسے چاہوں گا ویسے گزاروں گا۔ آپ ان فضول دھمکیوں سے مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ سمجھے!" ان کی پشت پہ نگاہیں گاڑھے وہ با آواز بلند دھاڑا تھا۔ مگر ابراہیم صاحب کی رفتار میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ان ہی مضبوط قدموں سے چلتے باہر نکل گئے تھے۔

"تم ٹھیک تو ہو نا سیم؟" ان کے منظر سے ہٹتے ہی سوزی دروازہ کھول کے اس کے پاس دوڑی چلی آئی تھی۔ مگر سیم اسے ایک جھٹکے سے اپنے سامنے سے ہٹاتا، گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت اتنے شدید غصے میں تھا کہ کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔

اگلے ہی لمحے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے انتہائی تیزی سے بیک کی تھی۔ گاڑی کے ٹائر بری طرح چرچرائے تھے۔ مگر وہ کسی بھی چیز کی پرواہ کیے بنا، آندھی طوفان کی طرح گاڑی بھگا لے گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

حنان نے مہر کے وجود کو مکمل طور پہ نظر انداز کر دیا تھا۔ نتیجتاً "مہر نے بھی اس پہ لعنت بھیجی تھی اور اپنی زندگی میں مصروف ہو گئی تھی۔ اور کچھ یہی رد عمل باقی گھر والوں کا بھی تھا۔

دوسری طرف حنان نے دو تین دن کے وقفے کے بعد ہی صغیر صاحب کا آفس جوائن کر لیا تھا۔ اس کے اس فیصلے سے انہیں بے حد خوشی ہوئی تھی۔ یہ ان کی دلی خواہش تھی جوان کے بیٹے نے بنا ان کے کچھ کہے ہی پوری کر دی تھی۔

یوں حنان نے دفتر میں اپنی ذمہ داریاں بڑے احسن طریقے سے سنبھال لی تھیں۔ لیکن چند معاملوں میں صغیر صاحب کا اسے ٹوکنا بھی کسی بہتری کا باعث نہیں بن پایا تھا۔ جن میں سر فہرست اس کی حد سے بڑھی ہوئی دوستیاں اور گھر میں زیب خاص طور پر مہر کے ساتھ اس کا بلاوجہ کا نارواسلوک تھا۔

ابھی بھی وہ رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب گھر واپس لوٹا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کے وہ اپنے دھیان میں اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن ٹی وی کے آگے مہر کو بیٹھا دیکھ کے وہ ٹھٹک گیا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے بے اختیار پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا اور حنان پہ نگاہ پڑتے ہی وہ بے نیازی سے رخ موڑ گئی تھی۔

اس کی یہ بے نیازی حنان کو سر تا پا سلگا گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اسے یعنی حنان قاضی کو، جس کے پیچھے لڑکیوں کی ایک لمبی قطار تھی، نظر انداز کرنے کی جرات کر گئی تھی۔ جو اسے پہلے دن کی طرح بے حد ناگوار گزری تھی۔ جب اس نے ایئرپورٹ پہ مہر کی آنکھوں میں باقی سب کی طرح اپنے لیے ستائش کے بجائے غصہ اور ناگواری دیکھی تھی۔

وہ اچانک اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر کے اس کی طرف چلا آیا اور بنا مہر کی جانب دیکھے صوفے پہ آکر بڑے ریلیکس انداز میں گر سا گیا۔ یوں جیسے وہ وہاں بالکل اکیلا ہو۔ پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگیں سیدھی کی تھیں اور جوتوں سمیت سامنے موجود ٹیبل پہ رکھ دی تھیں۔

اس کے صوفے پہ بیٹھتے ہی مہر کا سارا دھیان فلم پہ سے ہٹ گیا تھا۔ لیکن اس متکبرانہ انداز پہ تو وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

حنان نے اس کی نگاہوں کی پرواہ کیے بنا ہاتھ بڑھا کر ریموٹ اٹھایا تھا اور چینل بدل دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک، وہ چینل سرچنگ میں مصروف ہو گیا تھا اور مہر

لب بھینچے اسے چند لمحے دیکھنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے خاموشی سے وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے۔ لیکن حنان کی تمسخرانہ آواز نے اسے رک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"فلم نہیں دیکھنی کیا؟" اور اس کی ذلالت پہ مہر کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ جان بوجھ کے اسے تنگ کر رہا تھا۔

"جی نہیں، آپ کی موجودگی میں مجھے کچھ بھی نہیں دیکھنا۔" ایک سلگتی نظر اس کے چہرے پہ ڈالتی وہ خود پہ سے ہر اختیار کھو بیٹھی تھی۔

اس کے جواب نے حنان کے چہرے پہ تناؤ پیدا کر دیا تھا مگر اس کے لبوں پر کھیلتی تمسخرانہ مسکراہٹ برقرار رہی تھی۔

"بڑے دماغ ہو گئے ہیں بھئی۔" مہر کو دیکھتے ہوئے اس نے بھنویں اچکائی تھیں۔ "مگر شاید تم بھول رہی ہو کہ کس کی چھت کے نیچے کھڑی ہو اور کس سے بات کر رہی ہو۔"

"میں جس چھت کے نیچے کھڑی ہوں فی الحال وہ آپ کی نہیں ہوئی۔ جس دن ہو جائے گی، اس دن یہ رعب دکھائیے گا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ دوبدو بولی تو حنان کے لبوں پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"شاید تم میرے مقابل اترنے کی کوشش کر رہی ہو مہر احمد۔"

"آپ کے مقابل!" مہر نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائی تھیں۔ "نہیں بھائی! میں اتنا نہیں کر سکتی۔" اور حنان کے لیے اتنے کاری وار کی ضرب سہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا اور اگلی ہی جست میں اس کی کلائی جکڑ گیا تھا۔

"اب کہو کیا کہہ رہی تھیں تم۔" اور مہر اسے اپنے اتنے قریب پا کے بری طرح گھبرا گئی تھی۔

"میرا ہاتھ چھوڑیں۔" اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی بے اختیار کوشش کی تھی۔

"کیوں یہ ہاتھ صرف ڈیئر ہنی ہی پکڑ سکتے ہیں؟" اور مہر اس کے منہ سے ایک بار پھر اپنے کردار پہ چوٹ سن کر تڑپ اٹھی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ اور اپنے وجود کی پوری طاقت لگاتے ہوئے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروا لیا تھا۔

"آئندہ اگر آپ نے میرے کردار کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" انگلی اٹھائے وہ بنا کسی خوف کے شعلے برساتے لہجے میں بولی تو حنان قاضی کو اس کی یہ جرات آگ لگا گئی۔

"مجھے وارننگ دے رہی ہو تم؟" اس کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا تھا۔

"ہاں دے رہی ہوں۔ اپنی زبان اور گری ہوئی سوچ سنبھال کے رکھیں۔ میں نے اب تک خاموشی سے برداشت کیا لیکن یہ فضول بکواس میں دوبارہ کبھی برداشت نہیں کروں گی اور میری یہ بات آپ بھولنے کی غلطی مت کیجیے گا۔" وہ اپنے سابقہ لہجے میں بولی تھی اور حنان کے لیے اس جرات کے مظاہرے کو ہضم کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"بے فکر رہو، کبھی نہیں بھولوں گا۔ مگر ایک بات تم بھی یاد رکھنا مہر احمد! میری یادداشت میں رہنا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

"مجھے میری خاموشی بھی بہت مہنگی پڑتی رہی ہے حنان صاحب۔ اس لیے مجھے اتنی سی بھی پرواہ نہیں۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ بنا کسی جھجک کے اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئی تھی اور حنان کی مارے غصے کے مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"اٹھو انجم! کچھ کھا لو۔ تمہاری دوا کا وقت ہو گیا ہے۔" ابراہیم صاحب نے آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی انجم بیگم کی طرف دیکھا تھا۔

پانچ دن ہو گئے تھے اس کرب ناک حقیقت کو ان پہ واضح ہوئے اور ان پانچ دنوں میں ہی انجم جیسے بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے انہیں ذہنی دباؤ اور پریشانی

سے دور رکھنے کی تاکید کی تھی۔ لیکن یہ بھلا ابراہیم صاحب کے ہاتھ میں کہاں تھا؟ وہ تو خود اندر سے بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ ثمروز کی آنکھوں میں اتری بدلحاظی اور مزاج میں در آنے والی سرکشی اور اجنبیت نے ان کی رہی سہی ہمت بھی توڑ کے رکھ دی تھی۔ وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے تھے کہ انہوں نے امریکہ سے اپنے کاروبار کو ہی سمیٹ لینے کی ٹھان لی تھی۔

"انجم' میں نے پاکستان واپسی کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس سلسلے میں میں نے طاہر سے بھی بات کرلی ہے۔ بہت جلد میں اور تم۔۔۔"

"میں اور آپ؟" انجم نے ایک جھٹکے سے آنکھوں پر دھرا بازو ہٹاتے ہوئے زخم خوردہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا تھا۔ "ہم یہاں تین بندے آئے تھے ابراہیم اور اب واپس لوٹیں گے تو صرف میں اور آپ!" بھرائے ہوئے لہجے میں بولتی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ "میں ماں ہوں اس نامراد کی۔ کیا کہہ کر اپنے دل کو تسلی دوں؟ اور کیا بتاؤں اپنی بہن کو اور اس بدنصیب لڑکی کو جس کا نصیب ہم نے بچپن میں ہی پھوڑ دیا تھا۔" بات کرتے کرتے ان کے آنسو تیزی سے ان کے چہرے پہ بہہ نکلے تھے۔

"پانچ دن۔ پانچ دن ہوگئے ہیں مگر ہمارے بیٹے نے ہمیں ایک فون کرنے کی زحمت نہیں کی۔ مگر پھر میں سوچتی ہوں کہ آج جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس میں کیا صرف ہماری اولاد قصوروار ہے؟" انہوں نے دکھ بھری نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا تو ابراہیم ملک اس سوال پہ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔

"نہیں اس میں آپ کی خواہشات بھی شامل ہیں۔ کیا سوچا تھا آپ نے کہ امریکہ آئیں گے' یہاں کی ہر اچھی چیز سے فائدہ اٹھائیں گے اور ہنسی خوشی رہیں گے؟ نہیں ابراہیم صاحب! آپ کی بہت بڑی غلط فہمی تھی۔ جب آپ نے یہاں پھلنے پھولنے کے ارادے باندھے تھے تا تو یہاں کی برائیاں اور کمزوریاں بھی آپ کو کامپلمنٹری (تحفتاً) ملی تھیں۔" ان کی اس بات پر ساکت بیٹھے ابراہیم ملک کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔

"کتنا کہا تھا میں نے آپ سے کہ ابراہیم یہاں کا ماحول ٹھیک نہیں۔ مگر آپ نے میری ایک نہ سنی۔ کیونکہ تب تو آپ کے سامنے آپ کا دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہوا کاروبار تھا۔ پھر اب اگر اس ترقی کے بدلے میں بیٹا گنوانا پڑ گیا ہے تو کیوں واپسی کے ارادے باندھ رہے ہیں؟ جائیے اپنا کاروبار کیجیے۔ جو نقصان ہونا تھا ہو گیا۔ اب اس بڑھاپے میں ہم کہیں بھی رہیں' کیا فرق پڑتا ہے؟" اور ابراہیم صاحب کے لیے مزید ان کٹھیلی سچائیوں کو سہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کا دل پھٹنے کو آگیا تھا۔

"میں مانتا ہوں سب قصور میرا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں میں اس اہم ترین نقطے کو بھول گیا کہ جو فضائیں میرے کاروبار کے لیے بہت سازگار تھیں۔ وہ میری اولاد' میری نسل کے لیے بہت ضرر رساں تھیں۔ مگر یہ خدا انجم میں نے یہ نہیں چاہا تھا۔" احساس زیاں سے مغلوب ہو کے ان کی آواز بھر آئی تھی۔ اور ابراہیم صاحب کے ذہن میں پتا نہیں کہاں سے' لیکن اچانک ہی ان کی اپنی آواز دستک دینے لگی تھی۔

"ٹوٹتا ہے جب جام آرزو
تب در آگہی کھلتا ہے۔"

اک سنسناہٹ سی انہیں اپنے پورے جسم میں پھیلتی محسوس ہوئی تھی۔

"یا اللہ میری غلطیوں کو معاف فرمادے۔ ان کی درستی کے اسباب پیدا فرمادے۔ بے شک تو ہر چیز پہ قادر ہے۔" بہتے اشکوں کے ساتھ انہوں نے دل کی گہرائی سے اپنے رب سے اپنے غلط فیصلوں کی معافی طلب کی تھی۔

☼ ☼ ☼

سیم کو اپنی کہی کسی بھی بات کا پچھتاوا نہ تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے حوصلے پہ خود حیران تھا کہ اس نے کیسے ابراہیم صاحب کا ہاتھ اٹھانا' وہ بھی سوزی کے سامنے برداشت کرلیا تھا ورنہ اس کے نزدیک اگر کوئی اور اولاد ہوتی تو

اس زیادتی پہ کب کا اپنے باپ کو حوالات کی سیر کروا چکی ہوتی۔

اسے ابراہیم صاحب کی دھمکی کی بھی رتی برابر پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرنے والے تھے۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے ماں باپ کی اس میں جان تھی اور وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ اس کے بابا اگر غصے میں یہ فیصلہ کر بھی لیتے تب بھی اس کی ماں انہیں اس درجہ زیادتی کی اجازت کبھی نہیں دینے والی تھی اور اس بات کی اسے امید نہیں بلکہ یقین تھا۔ تب ہی اس نے بے حد اطمینان سے انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔ کچھ عرصے کی بات تھی' سب کچھ خود ہی ٹھیک ہو جانے والا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ان کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اس بات کو سمجھتے کہ وہ اب ایک سمجھدار اور بالغ شخص تھا' جس کی زندگی کو وہ لوگ اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلا سکتے تھے۔ کم از کم اس مہذب معاشرے میں تو بالکل بھی نہیں۔

اس روز سیم نے واپس آکر سوزی کو ہونے والی تلخ کلامی کے ساتھ ساتھ اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ جس پہ سوزی نے اسے مکمل طور پہ سپورٹ کیا تھا۔ اس کے نزدیک سیم کے باپ کا رویہ نہایت غیر مناسب تھا۔ اور وہ اس سلسلے میں کسی نرمی کے مستحق نہ تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" تیار کھڑی سوزی نے سیم کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تھی۔ وہ دونوں ماہانہ گروسری کی خریداری کے لیے قریبی سپر مارکیٹ تک جا رہے تھے۔ سیم اپنی ان سوچوں کے تانے بانے جھٹکتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

گھر بند کر کے وہ گاڑی میں سوار جلد ہی مطلوبہ مارکیٹ آپہنچے تھے۔ جہاں گھنٹہ لگا کے سیم نے بہت تسلی اور فراخ دلی سے سوزی کو گھر کے سامان کے ساتھ ساتھ اس کی ذاتی اشیاء کی بھی شاپنگ کروائی تھی۔

اپنی باری آنے پہ وہ دو دو ٹرالیاں گھسیٹتے کاؤنٹر پہ آ کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں موجود لڑکی نے ان کی چیزیں اٹھا اٹھا کر بل بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس دوران سیم اور سوزی کاؤنٹر کے ایک جانب سجائی ہوئی چاکلیٹس میں سے اپنی پسند کی خریداری کرنے لگے تھے۔

"چھ سو پچاس ڈالرز سر۔" کاؤنٹر پہ کھڑی لڑکی نے سکرین پہ جگمگاتا ٹوٹل بہ آواز بلند سیم کے گوش گزار کیا تو اس نے والٹ نکال کر اس میں موجود کریڈٹ کارڈ بے نیازی سے لڑکی کے حوالے کیا تھا اور خود ایک بار پھر سوزی کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

"ایکسکیوزمی سر! آپ کا اکاؤنٹ' کارڈ کو سپورٹ نہیں کر رہا۔" لڑکی نے سیم کو مخاطب کیا تو سیم کے ساتھ ساتھ سوزی کی بھی ساری بے نیازی ہوا ہو گئی۔

"کیا؟" وہ سرعت سے پلٹ کر کاؤنٹر کی جانب آیا تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں تو ٹھیک ٹھاک رقم تھی۔

"پھر کوشش کریں۔" اس کے کہنے پہ لڑکی نے دوبارہ سارا عمل دہرایا تھا۔

"سوری سر۔" اس نے کارڈ نکال کر سیم کے حوالے کیا تھا اور اس کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا تھا۔ سوزی الگ اپنی جگہ پہ حق دق سی کھڑی تھی۔ سیم نے فوراً" سے پیشتر والٹ نکال کر اس میں رکھا کیش لڑکی کے حوالے کیا تھا۔ اور خود الجھا سا لب بھینچے باہر چلا آیا تھا۔ سوزی اس دوران عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل خاموش رہی تھی۔

وہاں سے گاڑی نکال کر سیم کا رخ اپنے متعلقہ بینک کی جانب ہو گیا تھا۔ جس کی پارکنگ میں اس نے گاڑی کھڑی کی تو سوزی نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟"

"نہیں۔" وہ ایک لفظ میں بات ختم کر کے اکیلا ہی اندر چلا آیا تھا۔

"مجھے اپنے اکاؤنٹ کا اسٹیٹس چیک کرنا ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اکاؤنٹ نمبر ہیلپ ڈیسک پر بیٹھے شخص کے حوالے کر دیا تھا۔

"سوری سر! آپ کا اکاؤنٹ فریز کروا دیا گیا ہے۔" اس شخص کی نظریں اسکرین سے ہٹ کر سیم کے چہرے پہ آٹھہری تھیں اور سیم کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔

☼ ☼ ☼

اس رات کے واقعے کے بعد حنان نے مہر سے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس کی راہ میں آیا تھا۔ یہ ردعمل مہر کو پرسکون کر گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کاش اس نے پہلے ہی یہ دوٹوک اور سخت رویہ اپنا لیا ہوتا تو آج اس کی عزت نفس اور جذبات حنان کے ہاتھوں مجروح نہ ہوتے۔

لیکن مہر جیسی سادہ اور بے ریا بندی ابھی یہ تلخ حقیقت نہیں جانتی تھی کہ جو لوگ اپنے سامنے آپ کا جھکا ہوا سر دیکھنے کے عادی ہوں ان کے لیے آپ کی اٹھی ہوئی گردن کو دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔ دشمن کی خاموشی ہمیشہ اس کی پسپائی کا اعلان نہیں کرتی۔ یہ کبھی کبھار اس کے اندر چھپے نئے طوفان کی بھی علامت ہوتی ہے۔ وہ طوفان جسے برپا کرنے کے لیے وہ کسی گھاگ شکاری کی طرح مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں ہوتا ہے اور ان ہی کی حنان کو بھی تلاش تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں گھر جانا چاہ رہی ہوں۔ میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔" مہر نے اپنی کنپٹی دباتے ہوئے تھکی ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ چاروں صغیر صاحب کے ساتھ ان کے عزیز دوست کی بیٹی کی شادی میں آئی ہوئی تھیں۔ مہر کی طبیعت شام سے ہی گری گری سی تھی۔ مگر چونکہ دلہن سے اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ اس لیے وہ دوا کھا کر سب کے ساتھ تقریب میں چلی آئی تھی۔ اب اس کو حرارت بھی ہو گئی تھی۔

"مگر بیٹا! ابھی تو نکاح بھی نہیں ہوا۔" زیب نے اس کی بوجھل آنکھوں کو تشویش سے دیکھا تھا۔

"کوئی بات نہیں امی! میں حنا سے معذرت کر لوں گی۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔ اور پھر وہ ڈرائیور کے ہمراہ گھر واپس آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

حنان جس وقت گھر لوٹا' رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

آج آفس میں ایک پارٹی کے ساتھ ان کی اہم میٹنگ اور پھر ڈنر تھا۔ صغیر صاحب کی چونکہ شادی میں شرکت بھی ضروری تھی۔ اس لیے انہوں نے حنان کو یہ میٹنگ اور ڈنر سنبھالنے کے لیے کہا تھا۔ حنان فارغ ہو کر سیدھا گھر چلا آیا تھا۔

پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے اس نے چوکیدار کو داخلی دروازے کا لاک کھولنے کے لیے کہا تھا۔ جسے وہ سب گھر والے اپنی غیر موجودگی میں بند کر کے جاتے تھے۔

"دروازہ کھلا ہے صاحب جی! وہ مہر بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ واپس آ گئی ہیں۔" چوکیدار کی بات پہ حنان کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"کب واپس آئی ہے؟" اس کے اندر کا شکاری چوکس ہو گیا تھا۔ شاید وہ موقع آ گیا تھا۔ جس کا اسے اتنے دنوں سے انتظار تھا۔

"ابھی دس' پندرہ منٹ پہلے ہی آئی ہیں۔" اور وہ اثبات میں سر ہلاتا اندر چلا آیا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی اس کی آنکھیں مارے خباثت کے چمک اٹھی تھیں۔

وہ دروازے کو لاک لگا کر اوپر چلا آیا تھا۔ احتیاطاً اس نے سب ہی کے کمرے کھول کے چیک کیے تھے۔ پورا گھر خالی پا کے اس پہ سرشاری سی چھا گئی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا مہر کے کمرے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ لاک نہ پا کر اس نے دروازہ دھکیلا۔ اور اندر داخل ہو گیا تھا۔

مہر اندر کمرے میں کہیں نہ تھی۔ لیکن باتھ روم سے پانی کی آواز سن کر اس کے لب بے اختیار مسکرا دیے تھے۔ اس نے پلٹ کر دروازے کو لاک کیا تھا اور

خود ایک طرف رکھی راکنگ چیئر پہ آ کے بیٹھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیسے کر سکتے ہیں وہ ایسا؟" آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا انہیں گھر لوٹے۔ مگر سیم کا شاک، اس کا غصہ جوں کا توں برقرار تھا۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس روز جو بھی کہہ کر گئے تھے اس میں سے کچھ بھی بے معنی یا اسے محض ڈرانے دھمکانے کے لیے نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے مکمل طور پہ عاق کر چکے تھے۔ اور صرف وہ ہی نہیں بلکہ اس کی ماں بھی اس سے لاتعلقی اختیار کر چکی تھی اور یہ دھچکا اس کی بہت سی خوش فہمیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

اسے غصے کے ساتھ ساتھ شدید قسم کی پریشانی بھی لاحق ہو گئی تھی۔ امریکہ جیسے ملک میں رہ کر بھی اس نے آج تک شہزادوں کی سی زندگی گزاری تھی۔ مشقت کسے کہتے ہیں اور کن کن کر پیسہ خرچ کیسے کیا جاتا ہے۔ وہ ایسی ہر کڑوی حقیقت سے نابلد تھا۔

"مجھے، مجھے کچھ کرنا ہو گا۔" ڈوبتے دل کے ساتھ یہاں وہاں چکراتے وہ بے اختیار بڑبڑایا تھا۔

"کیا کرو گے؟" سوزی نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"مجھے انہیں منانا ہو گا۔ انہیں کسی بھی قیمت پہ راضی کرنا ہو گا۔"

"اور اگر ان کی قیمت ہماری علیحدگی ہوئی تو؟" سوزی کی آنکھوں میں استہزائیہ رنگ ابھرے تھے۔

"تو میں یہ بھی کر گزروں گا۔" لمحے کے توقف کے بعد اس نے اطمینان سے جواب دیا تو سوزی کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹ سی گئی تھیں۔

"کیا؟"

"ہاں! میں یہ بھی کر گزروں گا۔ مگر..." وہ لحظہ بھر کو رکا تھا اور پھر بے اختیار مسکرا دیا تھا۔ "مگر صرف عارضی طور پہ۔" اور ساکت بیٹھی سوزی اسے بے یقین نظروں سے دیکھے چلی گئی تھی۔ اس کے تاثرات پہ سیم نے اک گہری سانس لی تھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔

"دیکھو سوزی! ہم دونوں جانتے ہیں کہ اگر میں اپنی فیملی میں واپس جانا چاہتا ہوں تو ان کی یہی شرط ہو گی۔ لیکن دہرانا چاہوں گا۔ میں اس بار جوش سے نہیں ہوش سے کام لوں گا۔ اور اس میں مجھے تمہارے صبر اور تمہارے ساتھ دونوں کی ضرورت ہو گی۔ تمہیں ہر حال میں مجھ پہ یقین کرنا ہو گا۔ کیونکہ میں تمہیں آج ایک بات بالکل سچ سچ بتا رہا ہوں... میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن میں اس دولت اور اس اسٹیٹس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم اسے میری خود غرضی کہہ لو یا کچھ بھی لیکن مجھے یہ سب ہر صورت دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ سو اگر تم یہ سب نہیں کر سکتیں تو مجھے ابھی بتا دو۔ میں اپنا سامان اٹھاؤں گا اور اپنے ماں باپ کو منانے چل پڑوں گا۔" اور سوزی اس کے منہ سے اتنی واضح اور قطعی بات سن کر بے اختیار خاموش ہو گئی تھی۔ صورت حال بالکل کلیئر تھی یا تو وہ اس کے ساتھ تھی یا پھر نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن مجھے دھوکا مت دینا سیم!" اس نے انگلی اٹھائے تنبیہی انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھا تو سیم نے مسکراتے ہوئے اسے خود میں سمیٹ لیا۔

"کبھی نہیں۔ مر کے بھی نہیں۔" اور سوزی اس یقین دہانی پہ مطمئن سی مسکرا دی تھی۔

☆ ☆ ☆

مہر تولیے سے منہ خشک کرتی اپنے دھیان میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر سامنے راکنگ چیئر پہ جھولتے حنان سے ٹکرائی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"آپ؟" اس نے فقط اتنا ہی کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ کر بیڈ پہ پڑا دوپٹا اٹھایا اور اپنے شانوں پہ پھیلا لیا۔ حنان اس دوران اسے نیم وا آنکھوں سے دیکھے گیا تھا۔

"یہ کیا طریقہ ہے حنان بھائی؟ آپ یوں بنا اجازت

میرے کمرے میں کیوں آئے ہیں؟" اس نے سخت لہجے میں استفسار کیا تھا۔ حنان کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

"بنا اجازت۔۔۔" میرا کمرہ۔۔۔ کیا استحقاق آگیا ہے تمہارے لہجے میں۔" حنان اس کا چہرہ دیکھتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "اس دن بھی کیا کہا تھا تم نے مجھ سے؟" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ "ہاں میرے کردار کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" وہ اسے عجیب آرپار ہوتی نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔

"آپ' آپ یہاں سے جائیں حنان بھائی۔" اور حنان کا بھاری قہقہہ مہر کی آنکھوں میں سراسیمگی پھیلا گیا۔

"بھائی ہی تو نہیں ہوں میں تمہارا۔" اس کی ہرنی سی خوفزدہ آنکھوں میں تکتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں بولا تو مہر کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ یہ کون سا حشر برپا ہونے چلا تھا؟ مارے وحشت کے وہ کتنے ہی قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"تم تو بہت بہادر ہو میری جان۔ اتنی سی حقیقت سن کے ڈر گئیں۔" اس کے حسین چہرے کا خوف حنان کے اندر کے شیطان کو سکون پہنچا گیا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

"خدا کا واسطہ ہے حنان بھائی۔ مجھے میرے عزیز رشتوں کے وہ روپ نہ دکھائیں کہ میں زندگی بھر کسی پر اعتبار کرنے کے لائق نہ رہوں۔" اس کے سامنے ہاتھ جوڑے مہر کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ رہا تھا۔ عزتوں کے محافظ ہی جب لٹیرے بن جائیں تو کوئی کسے مدد کے لیے پکارے؟ کون سی جائے پناہ تلاش کرے؟

"تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں مہر احمد۔ ہم دونوں صرف ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میری برداشت کو تمہارا یہ چمکتا وجود بہت عرصے سے آزما رہا ہے سو میں نے سوچا کیوں نہ اس کی یہ آزمائش آج ختم کر دی جائے۔" اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے وہ ایک قدم آگے آیا تو مہر سہم کر دیوانہ وار پیچھے ہٹی اور دیوار سے جا لگی۔ چشم زدن میں چند سال پہلے کا وہ منظر اس کے ذہن میں گھوم گیا جب رات کی تاریکی میں حنان نے اس کے ہاتھوں کو چھوا تھا۔ اس کے پورے وجود میں اس یاد نے چنگاریاں سی بھر دی تھیں۔ یہ شخص تو نجانے کب سے اس پہ اپنی گندی نظر رکھے ہوئے تھا۔ مہر کو سامنے کھڑے حنان سے یک لخت گھن محسوس ہوئی تھی۔

"تمہارا اندر اتنا گندہ ہوگا حنان قاضی! میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ تم سا غلیظ اور بدکردار انسان۔۔۔" اور اس کے ساتھ ہی حنان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ اس نے غراتے ہوئے درمیانی فاصلہ ایک ہی جست میں طے کیا تھا اور مہر کو اپنی جانب گھسیٹ لیا تھا۔

"چھوڑو۔ چھوڑو مجھے ذلیل آدمی!" مہر خود کو چھڑانے کی کوشش میں پاگل ہونے لگی تھی۔

"کیوں؟ جب اس کمینے کے ساتھ پہاڑ پہ موج اڑا سکتی ہو تو میرے ساتھ کیوں نہیں؟" دانت پیستے ہوئے حنان نے ایک جھٹکے سے اس کی دونوں کلائیاں قابو میں کی تھیں اور اسے پیچھے دیوار سے لگا دیا تھا۔

"مجھے ہاتھ مت لگانا حنان! میں تمہارا گھناؤنا روپ سب کو دکھا دوں گی۔" مہر وحشت زدہ سی چلائی تھی۔

"تم کیا بتاؤ گی۔ میں خود بتاؤں گا سب کو کہ تم کسی لڑکے کے ساتھ پچھلے لان میں۔۔۔"

وہ دھیرے سے ہنسا تھا اور مہر کو لگا تھا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی ہو۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں حنان کے چہرے پہ جم سی گئی تھیں۔ اور اگلے ہی لمحے آنسو قطروں کی صورت اس کی خوب صورت آنکھوں سے پھسلنے لگے تھے۔ یہ منظر اتنا کومل اتنا دلفریب تھا کہ حنان کا دل بیچ میں ڈول گیا تھا۔ وہ ان ساحر آنکھوں کا حسن پہلی بار اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا اور ان کی تاب لانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"اُوف جانِ حنان! یہ ظلم نہ کرو مجھ پہ۔" خمار آلود لہجے میں کہتے وہ اس کی طرف جھکا تو مہر نے تڑپ کے اپنا رخ ایک طرف کر لیا۔ اس کی ریشمی زلفیں حنان کے چہرے کو مس کرتی اس پہ خوشبو سی بکھیر گئی

تھیں۔ بے اختیار حنان کو اپنا دل موم کی طرح پگھلتا محسوس ہوا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں حنان' مجھے چھوڑ دو۔" پھوٹ پھوٹ کے روتی مہر نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرلی تھیں۔

اس کی آواز' اس کی استدعا اچانک جیسے حنان کے دل کو چھونے لگی تھی۔ اس پہ اثر کرنے لگی تھی۔ مہر کی کلائیوں پہ اس کی گرفت میں خود بہ خود نرمی آگئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اس سحر انگیز خوشبو کو اپنے اندر اتارا تھا اور قدرے پیچھے ہٹ کر پہلی بار دل کی پوری آمادگی کے ساتھ' سسکتی ہوئی مہر کے ایک ایک نقش کو اپنے اندر اترنے دیا تھا۔

اس کے ریشمی بال کھل کے بکھر چکے تھے۔ عارضوں پہ جھکی بھیگی گھنیری پلکیں اور دانتوں تلے دبے یاقوتی ہونٹ۔ حنان کے پورے وجود پہ کمندیں سی ڈالنے لگے تھے۔

"یہ سانچے میں ڈھلا مومی وجود تمہاری نفرت کے تو لائق نہیں حنان قاضی۔" اس کے دل نے دھیرے سے سرگوشی کی تو وہ دل کی اس سرگوشی پہ ایمان لے آیا۔ اس نے مہر کی کلائی پہ سے اپنا دایاں ہاتھ ہٹاتے ہوئے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کے چہرے پہ بکھر آنے والے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سمیٹتے ہوئے اس کے گال کو سہلایا تو مہر کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ حنان کو خود میں واپس لے آئی۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے مہر کی دوسری کلائی بھی چھوڑ دی اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اس حرکت نے روتی ہوئی مہر پہ جادوئی اثر دکھایا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔ اور حنان کو خود سے ذرا فاصلے پہ کھڑا دیکھ کے اس کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھیل گئی تھیں۔ وہ دم سادھے چند سیکنڈ اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اور پھر بھاگ کر اس کے قریب سے گزرتی کارپٹ پہ گرے اپنے دوپٹے کی جانب لپکی تھی۔

"میرا یہ احسان یاد رکھنا مہر احمد۔" دوپٹہ اٹھائے وہ دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ حنان کی آواز نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر حنان کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اسی جگہ پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھٹ رخ موڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور تیر کی سی تیزی سے دروازہ کھول کے باہر نکل گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے حنان کو ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے ارد گرد بکھرا فسوں غائب ہو گیا تھا۔

"یہ اچانک مجھے کیا ہوا تھا؟" اپنی کایا پلٹ پہ وہ حیران تھا۔

"حنان قاضی اور مہر احمد پہ مہربان؟" وہ بے یقینی کے عالم میں بڑبڑایا تو اس کا دل بے اختیار قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"مہربان نہیں قربان کہو۔ گھائل تو تم بہت پہلے ہی ہو گئے تھے' آج تو صرف آخری کیل ٹھکی ہے حنان قاضی۔" اور حنان اس انکشاف پہ حیرت زدہ سا کھڑا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بخار کا زور کچھ ٹوٹا؟" زیب بیگم نے تسبیح ختم کر کے مہر پہ پھونکتے ہوئے جاشی کی طرف دیکھا تھا جو بے سدھ پڑی مہر کے ماتھے پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بخار کی حدت کی وجہ سے سرخ ہو رہا اور پپوٹے بے حد سوجے ہوئے تھے۔

"یہ اس کی آنکھیں اتنی سوجی ہوئی کیوں ہیں؟" زیب نے تشویش سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔

"پتا نہیں امی! مجھے تو خود اتنی پریشانی ہو رہی ہے۔" جاشی کی نظریں بھی مہر کی آنکھوں پہ جا ٹھہری تھیں۔

کل رات بڑی عجیب سی بات ہوئی تھی۔ وہ لوگ ایک بجے کے قریب واپس آئے تھے اور جس وقت جاشی نے اپنا کمرہ کھولنا چاہا تھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے باہر موجود گھر کی چابیوں سے دروازہ کھولا تھا اور اندر

چلی آئی تھی۔ لیکن بیڈ پہ سکڑی سمٹی مہر کو سوتا دیکھ کے وہ ایک پل کے لیے حیران رہ گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے اس کی پیشانی چھوئی تھی۔ جو اچھی خاصی گرم ہو رہی تھی اور پھر وہ اس پہ کمبل ڈال کے اپنے کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی تھی۔

لیکن صبح جب زیب بیگم ' جائشہ کو کالج کے لیے اٹھانے آئی تھیں۔ تو مہر کو بے سدھ پڑا دیکھ کے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں حنان کو چھوڑ کے سب ہی گھر والے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ صغیر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کو لینے ان کے گھر بھاگے تھے۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد اسے انجکشن لگا کر دوائیاں دی تھیں اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی تاکید بھی کی تھی۔

ان کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے جاشی فوراً" سے پیشتر پٹیاں لے کر مہر کے سرہانے بیٹھ گئی تھی اور پریشان حال زیب تسبیح لیے اس پر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگی تھیں۔ اس دوران جاشی کے کالج کا ٹائم بھی نکل گیا تھا۔

"جاؤ بیٹا جا کر حنان کو اٹھاؤ ورنہ اسے بھی دیر ہو جائے گی۔" زیب کی بات پہ جاشی اثبات میں سر ہلاتی اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔ لیکن حنان کو اپنے کمرے سے نکلتا دیکھ کے وہ بیچ راہداری میں ہی رک گئی تھی۔

"تم کالج نہیں گئیں؟"

"نہیں بھائی! مہر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ شدید بخار کی حالت میں بے ہوش پڑی ہے۔ ڈیڈی ابھی ڈاکٹر عثمان کو واپس چھوڑنے گئے ہیں۔"

"کیا؟" حنان اس اطلاع پہ ایک پل کو ساکت رہ گیا تھا۔ پہلی بار اسے مہر احمد سے کی گئی اپنی کسی زیادتی کا بہت شدت سے احساس ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

شام تک مہر کا بخار کم ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پہ لگے خاموشی کے قفل اور چہرے پہ چھائی عجیب سی ویرانی نے زیب بیگم کو پریشان کر دیا تھا۔

"مہو میری جان۔ اتنی چپ کیوں ہو بیٹا؟" انہوں نے اس کے بال سہلاتے ہوئے اس کا چہرہ نرمی سے اپنی طرف کیا تو مہر کی خالی آنکھیں ان کے پر شفقت چہرے پہ آٹھہریں۔ بے اختیار اس کا دل کل رات خود پہ گزرنے والی قیامت کا ایک ایک پل ماں کو بتانے کے لیے تڑپ اٹھا۔ لیکن حنان کا خوف اتنا شدید تھا کہ وہ اس تڑپ کے باوجود ایک لفظ انہیں نہ بتا پائی۔

ان کے چہرے پہ نظریں جمائے وہ یکایک مارے بے بسی کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو زیب نے بری طرح گھبرا کے اسے خود میں سمیٹ لیا۔

"کیا ہوا ہے مہر؟ کچھ تو بولو بیٹا؟" مگر ماں کے سینے سے لگتے ہی اس کے آنسوؤں میں مزید شدت آگئی تھی۔

"امی... امی! مجھے چھوڑ کے مت جائیے گا۔ میں مر... مر جاؤں گی آپ کے بغیر۔" وہ آنسوؤں کے درمیان اٹکتے ہوئے بولی تو زیب کا متوحش دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

"کیا بات ہے مہر؟ حنان نے کچھ کہا ہے تمہیں؟" اس سے الگ ہوتے ہوئے انہوں نے یونہی حنان کا نام لیا تو مہر رونا بھول کر خوف زدہ نظروں سے ان کا چہرہ تکنے لگی۔ اسی وقت زیب بیگم کی نظریں مہر کی کلائی سے ٹکرائی تھیں اور ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"یہ ' یہ کیا ہوا ہے؟" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہوں نے بغور اس کی کلائی پر موجود انگلیوں کے نشان کو دیکھا تھا۔ کسی انہونی کے احساس نے ان کے اندر بہت شدت سے خطرے کی گھنٹی بجانی شروع کر دی تھی۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کی دوسری کلائی پکڑی تھی اور وہاں بھی ویسا ہی نشان دیکھ کے ان کی وحشت کے مارے پھیلی آنکھیں مہر کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔ جس کی آنکھوں سے ایک بار پھر سیل رواں جاری ہو گیا تھا۔

"امی امی! کل رات حنان میرے کمرے میں۔۔۔" ان کی گود میں منہ چھپائے مہر فقط اتنا ہی کہہ پائی تھی اور

زیب بیگم نے تڑپ کر اپنا کلیجہ تھام لیا تھا۔ انہیں "قاضی ولا" کے در و دیوار دھڑ دھڑاتے ہوئے خود پہ گرتے محسوس ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

صبح کاذب کا وقت تھا۔ جب فون کی متواتر بیل سے انجم کی آنکھ کھلی تھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سیل اٹھایا تھا۔ اور اسکرین پہ اس وقت زیب کا نمبر دیکھ کے وہ بے اختیار گھبرا گئی تھیں۔ سرعت سے فون کان سے لگائے وہ اٹھ بیٹھی تھیں۔

"ہیلو زیب! خیر تو ہے؟" انہوں نے چھوٹتے ہی ان کی خیریت دریافت کی تھی۔

"آپا! اگر آپ میرا مرا ہوا منہ نہیں دیکھنا چاہتیں تو آ کر اپنی امانت لے جائیں۔" دوسری طرف سے زیب کی بھاری آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو انجم پریشان ہو گئیں۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" لیکن زیب کی اچانک بلند ہونے والی سسکیوں نے ان کا دل بند کر دیا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر ایک نظر سوئے ہوئے ابراہیم صاحب پر ڈالی تھی۔ اور اٹھ کر تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں۔

"زیبی! کچھ تو بولو؟ آخر ہوا کیا ہے؟" اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے ان کا حوصلہ جواب دینے کو تھا۔

"آپا' آپا حنان نے مہر کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی ہے۔" اور انجم کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھٹنے کو آ گئی تھیں۔

"کیا؟" انہوں نے اپنے کانپتے وجود کو سنبھالنے کے لیے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا تھا۔

"ہاں آپا۔" زیب نے بے اختیار سسکی لی تھی۔ اور پھر یونہی روتے ہوئے وہ مہر کی زبانی سنی گئی ساری تفصیل ان کے گوش گزار کرنے لگی تھیں۔ جسے سنتے ہوئے انجم اپنا سر تھامے وہیں راہداری میں بیٹھ گئی تھیں۔

"آپا! آپ کو اللہ کا واسطہ ہے۔ اگر آپ کو میری اور میری بچی کی ذرا سی بھی پرواہ ہے تو جتنی جلدی ہو سکے یہاں آ کر مہر کو لے جائیں۔ چاہے تموز مانے یا نہ مانے۔ وہ آپ کے ساتھ آئے یا نہ آئے۔ آپ بس مہر کو یہاں سے لے جائیں۔ پلیز آپا میری بچی کو یہاں سے لے جائیں۔" بات کرتے کرتے وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں تو انجم کے اپنے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنی مصیبت کی ماری بہن پہ تموز کی حقیقت کا پہاڑ کیسے توڑتیں بھلا؟

"تم نے صغیر کو یہ بات بتائی؟" انہوں نے لرزتے لہجے میں سوال کیا تو زیب کی آواز میں سراسیمگی پھیل گئی۔

"نہیں آپا! میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی آپ بھائی جان سے اس بھیانک واقعہ کا ذکر کیجیے گا۔۔۔ یہ تو وہ طوفان ہے کہ اگر اٹھ کھڑا ہوا تو پھر کسی چیز' کسی رشتے کو نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ حنان نے تو باپ کے سامنے ہر حال میں مکر جانا ہے اور میری بچی ہو کر بھی ہر سُو رسوا ہو جائے گی۔ صغیر کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ لیکن اتنا بڑا الزام اپنے بیٹے پہ کسی طور برداشت نہیں کریں گے۔ وہ تو مہر کی دوبارہ کبھی شکل نہیں دیکھیں گے۔ پھر عائشہ' نویرہ' حنان ان کا بھائی ہے۔ میرا تو پورا گھرانہ بکھر جائے گا آپا!" اور انجم کا دل بہن کی بات سن کر کانپ اٹھا تھا۔

"صحیح کہہ رہی ہو۔ بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔" انہوں نے خوفزدہ ہو کر آنسو پونچھے تھے۔ "میں کچھ کرتی ہوں۔ تم پریشان مت ہونا اور مہو کو ایک لمحے کے لیے بھی اکیلے مت چھوڑنا۔ سنا تم نے؟"

"میں ہر لمحہ اس کے ساتھ ہوں آپا۔" زیب کی یقین دہانی پر انہوں نے بے چینی سے اپنی پیشانی مسلی تھی۔

"میں ابراہیم سے صبح بات کرتی ہوں۔ تم میرے فون کا انتظار کرنا۔"

"آپا! جو بھی کیجیے گا۔ بس جلدی کیجیے گا۔" زیب کی آواز پھر بھیگنے لگی تھی۔

"تم' تم فکر مت کرو۔" اور زیب نے رابطہ منقطع

کر دیا تھا۔
انجم نے ہاتھ میں پکڑے فون کو بے جان نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک طرف ڈال دیا تھا اور نڈھال سے انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ اس مسئلے کو کیسے حل کریں؟ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

☼ ☼ ☼

زیب حاجت کے نفل پڑھ کر اٹھیں تو اپنے پیچھے حنان کو کھڑا دیکھ کے بے اختیار چونک گئیں۔ اس کی صورت ان کے تن بدن میں آگ لگا گئی تھی مگر انہوں نے کمال حوصلے سے خود پہ قابو پاتے ہوئے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔
"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" ان کے چہرے پہ نگاہ جمائے حنان ایک پل کے لیے رُکا تھا۔
"میں مہر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ان کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے پرسکون اور دو ٹوک الفاظ میں بولا تو زیب اس کی دیدہ دلیری پہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔
"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" ان کا چہرہ تیزی سے سرخ ہوا تھا۔
"کیوں آپ کو اس کی شادی نہیں کرنی کیا؟" ان کی ناگواری کی پروا کیے بنا وہ اسی سکون سے بولا تو زیب کو اپنا ضبط چھوٹتا محسوس ہوا۔
"مجھے اس کی شادی کرنی ہے یا نہیں۔ لیکن تمہارا میری بیٹی سے کوئی رشتہ نہیں جڑ سکتا۔" وہ انگلی اٹھائے غصے سے بولیں تو حنان کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔
"کیوں؟"
"کیا تم وہ سب کچھ بھول گئے ہو جو آج تک اس کے ساتھ کرتے رہے ہو؟ اور آج تم میرے سامنے کھڑے ہو گئے ہو اس سے شادی کا ارادہ لے کے۔ کیا سوچ کر تم نے مجھ سے یہ بات کی ہے۔ ہاں....؟" زیب کا غصہ سے برا حال تھا۔
"سیدھی سی بات ہے۔ اچھی لگنے لگی ہے وہ مجھے۔" ان کی اتنی کھری کھری کے باوجود وہ بے نیازی سے کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا تو زیب کو اس کی اس درجہ ڈھٹائی اور جرات گنگ کر گئی۔
"تمہیں احساس بھی ہے کہ تم کس سے اور کیا بات کر رہے ہو؟" اس کی طرف دیکھتی وہ بے یقین لہجے میں بولی تھیں۔
"لڑکی کی ماں سے نہیں کہوں گا تو کس سے کہوں گا؟" وہ دوبدو بولا۔
"ٹھیک ہے۔ لڑکی کی ماں ہوں نا میں تو مجھے تمہارا رشتہ قبول نہیں حنان قاضی۔" اس کی طرف دیکھتی وہ سرد لہجے میں بولیں تو حنان کی آنکھوں میں غصہ پھیل گیا۔
"تو آپ مجھ سے پرانے بدلے نکالیں گی؟"
"میں تمہیں اس لائق بھی نہیں سمجھتی حنان!" زیب نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ان کی یہ کاری ضرب حنان کے پورے وجود میں چنگاریاں سی بھر گئی۔
"بہت بڑی بات کہہ گئی ہیں آپ۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا مسز صغیر۔ میں اپنی ضد کا بہت پکا ہوں۔ جب وہ مجھے بری لگتی تھی تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے وجود کو مجھ سے نہیں منوا سکتی تھی۔ آپ تو خود بھی اس تجربے سے گزری ہیں نا ساری عمر۔" وہ یک لخت کاٹ دار انداز میں مسکرایا تو زیب بیگم کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ "اور اب جبکہ وہ حیرت انگیز طور پہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔ تو یقین مانیں دنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے دور نہیں کر سکتی۔ اس لیے میرا مشورہ ہے مسز صغیر اس لڑکی کو میری ضد مت بنائیں۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حنان نے سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔ زیب کے لبوں پہ عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"دنیا کی کوئی طاقت نہ سہی، لیکن اوپر والے کی طاقت تو تمہیں روک ہی سکتی ہے نا۔ مہر تمہارا نصیب نہیں بن سکتی۔"
"آپ مجھے چیلنج کر رہی ہیں؟" ان کی مسکراہٹ، ان کا پرسکون انداز حنان کو کھولا گیا تھا۔

"نہیں! سمجھا رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر۔ آپ بھی ایک بات سمجھ لیں۔ مہر اگر میرا نصیب نہیں بن سکتی، تو پھر، کبھی کسی اور کا نصیب بھی نہیں بنے گی۔" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا یک لخت ٹھہرے ہوئے لیکن سرد لہجے میں کہتا' وہ باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور پیچھے کھڑی زیب کی آنکھوں میں پہلی بار اپنے ہاتھوں کے پالے اس لڑکے کے لیے نفرت پھیل گئی تھی۔ انہوں نے مہر سے اس گفتگو کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اسے مزید خوف زدہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ناشتے کی میز پہ انجم کتنی ہی دیر سے یونہی چپ چپ سی بیٹھی تھیں۔ انہیں یوں خاموشی سے ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھا دیکھ کر ابراہیم صاحب نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے ہم ناشتہ کیوں نہیں کر رہیں؟"

"آپ کو پتا ہے ابراہیم۔ آج صبح ساڑھے چار بجے کے قریب زیب کا فون آیا تھا۔" انہوں نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر تو تھی؟" ابراہیم صاحب کے چہرے پہ پریشانی پھیل گئی۔

"اس نے مجھ سے فوری طور پہ مہر کی رخصتی کے لیے کہا ہے۔" انجم نے دھیرے سے بتایا تو ابراہیم ملک حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"اس نے ساڑھے چار بجے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا؟"

"جی۔ وہ بہت زیادہ رو بھی رہی تھی۔ شاید اس کے گھر میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔" انجم نے ڈھکے چھپے لہجے میں بتایا۔

"تم نے پوچھا نہیں اس سے کیا ہوا ہے؟" ابراہیم صاحب نے پریشانی سے سوال کیا۔

"بہت پوچھا۔ لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ صغیر سے بھی اس معاملے میں کوئی بھی بات کرنے سے اس نے سختی سے منع کیا ہے۔"

"پھر اب؟" اور انجم' ابراہیم صاحب کا اشارہ سمجھ کے ایک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں ابراہیم! کہ اب ہم کیا کریں گے؟"

"تمہیں زیب کو ساری حقیقت بتا دینی چاہیے انجم۔ ہم مہر کی زندگی تباہ نہیں کر سکتے۔" ابراہیم ملک دو ٹوک لہجے میں بولے تو انجم کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ اپنی بہن سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ اسے صاف صاف بتا دوں گی کہ ہنی ہماری مہر کے لائق نہیں۔ وہ مہر کا یہ بے معنی رشتہ توڑ کر اس کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ لے۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا ابراہیم۔ وہ بہت پریشان ہے۔ وہ تو یہ تک کہہ رہی تھی کہ چاہے ہنی آئے یا نہ آئے' مانے یا نہ مانے۔ ہم خود آ کر مہر کو وہاں سے لے جائیں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے انجم؟ ہم یہ سب کیسے کر سکتے ہیں بھلا؟" ان کی بات سن کے ابراہیم صاحب تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تب ہی ملازمہ معذرت کے ساتھ اندر چلی آئی تھی۔

"سر! سیم سر آئے ہیں۔" اور ابراہیم ملک کی آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑنے لگی تھیں۔

"اس کی اتنی جرأت!" وہ آندھی طوفان کی طرح اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھے تھے اور انجم ہراساں سی ان کے پیچھے لپکی تھیں۔ ان کی منتوں کے باوجود ابراہیم صاحب نے' لاؤنج میں کھڑے سیم کو جا کر اس کے گریبان سے جکڑ لیا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں قدم رکھنے کی؟" کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے انہوں نے اسے زوردار جھٹکا دیا تھا اور انجم نے دہل کر اپنا کلیجہ تھام لیا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں بابا!" ان کے چہرے کو تکتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا تو ابراہیم ملک کا غصہ دوچند ہو گیا۔

"معاف؟ اور وہ بھی ایک زانی کو؟ نو نیور۔" انہوں نے اسے دور دھکیلا تو سیم پیچھے گرتے گرتے بچا۔ "اور تمہیں یہ معافی یاد آئی کیسے؟ اکاؤنٹ بند ہو گیا اس لیے؟"

انہوں نے استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس انکشاف نے دروازے میں کھڑی انجم کو حیران کر دیا۔ وہ اتنا بڑا قدم اٹھا چکے تھے اور انہیں بتایا تک نہ تھا۔

"آپ نے میرا اکاؤنٹ بند کروا دیا ہے؟" سیم نے انجان بننے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔

"یہ ڈرامہ کسی اور کے سامنے جا کر رچاؤ۔" ابراہیم ملک نے کان پہ سے مکھی اڑائی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں بابا! مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔" اس کی دہائی پہ ابراہیم صاحب کی تیز نظریں اس کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔

"تو ٹھیک ہے اب جان لو۔ میں تمہیں اپنی ساری دولت اور جائیداد سے عاق کرنے والا ہوں اور اسی لیے میں نے تمہارا اکاؤنٹ بند کروا دیا ہے۔" اور سیم کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا۔ مگر اس نے اپنے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں آنے دی تھی۔

"وہ آپ کی ملکیت' آپ کی چیز ہے۔ آپ جو چاہیں' وہ فیصلہ لیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر پلیز' پلیز ایک بار مجھے معاف کر دیں بابا! میں اتنی راتوں سے سو نہیں سکا ہوں!"

ان کی طرف دیکھا وہ دھیرے سے آگے بڑھا تھا اور انجم نے اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو لبوں پر تیزی سے دوپٹہ رکھ لیا تھا۔ یہ ان کی اکلوتی اولاد انہیں کس دوراہے پر لے آئی تھی؟

"میں اپنے مجرم کو تو معاف کر سکتا ہوں۔ مگر اپنے اللہ کے مجرم کو معاف کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ سیم۔" بات کرتے کرتے ابراہیم صاحب اس کی طرف سے رخ موڑ گئے تھے۔ سیم تیزی سے ان کے قدموں میں آگرا۔

"پلیز بابا! یوں مت کہیں۔ میں آپ لوگوں کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں سیم نہیں آپ کا تموز ہوں۔ مجھے معاف کر دیں بابا۔ میں ... میں پھر دوبارہ یہ حرکت کبھی نہیں کروں گا۔" ان کی ٹانگوں سے لپٹے اس کی اداکاری عروج پہ تھی اور انجم کے آنسو تھے کہ رکنے میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بے تابی سے شوہر کی جانب بڑھی تھیں۔

"پلیز ابراہیم! معاف کر دیں نا۔" ان کے بازو پہ ہاتھ رکھے وہ لجاجت سے گویا ہوئی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے ایک نظر ان کی برستی آنکھوں کو دیکھا تھا اور نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

"ایک شرط پہ۔" وہ بے تاثر آواز میں بولے تو سیم کو لگا جیسے اس کی مشکل آسان ہو گئی ہو۔ وہ خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے آپ کی ہر شرط قبول ہے بابا۔" زیادہ سے زیادہ وہ سوزی کو چھوڑنے کی بات کرنے والے تھے۔ اور یہ تو وہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

"ہم تینوں اگلی کسی بھی فلائٹ سے پاکستان جا رہے ہیں۔" اس کی طرف رخ موڑتے ہوئے انہوں نے قطعی لہجے میں سیم کے سامنے وہ شرط رکھی تھی جس کے بارے میں اس نے گمان بھی نہ کیا تھا۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ کسی اگر مگر کی گنجائش بچی ہی نہ تھی اس کے پاس۔

"ٹھیک ہے۔" ہتھیار ڈالنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا اور ساکت کھڑی انجم کو لگا تھا جیسے کوئی معجزہ رونما ہو گیا ہو۔ جس نے لمحوں میں ان کی ہر اذیت' ہر پریشانی کا مداوا کر دیا تھا۔ ان کا بیٹا' ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک گمراہی کے راستے سے لوٹ آیا تھا۔ وہ اپنی بہن اور بھابھی کے سامنے رسوائی اور جگ ہنسائی سے بچ گئی تھیں' انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

"انجم ..." سیم کے اپنے کمرے میں جاتے ہی ابراہیم ملک نے بیگم کو پکارا تھا۔

"ہم جب تک پاکستان نہیں پہنچ جاتے تم تموز
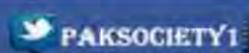
سے رخصتی یا میرے یہاں سے کاروبار سمیٹنے کا ذکر بالکل مت کرنا۔" اور انجم نے انہیں دیکھتے ہوئے اثبات میں سرہلا دیا تھا۔ تموز اگر ان کا بیٹا تھا تو وہ اس کے باپ تھے۔ اسے راہ راست پہ کیسے لانا تھا' وہ اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے۔

حنان والے واقعے کو گزرے محض تین دن ہی ہوئے تھے۔ جب انجم نے فون کرکے زیب کو اپنی آمد کی خوش خبری سنادی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ ہنی کی آمد کا سن کے زیب بے اختیار سجدۂ شکر میں گر گئی تھیں۔ ان دو سوا دو سالوں میں ہنی کی ذات سے پیدا ہونے والا ہر خدشہ' ہر گلہ خود بہ خود دور ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ان کی بیٹی کو عزت کے ساتھ رخصت کروانے کے لیے آرہا تھا۔ انہیں اور کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔

انہوں نے یہ خوش خبری مہر کو سناتے ہوئے فی الوقت رخصتی کی بات کو خود تک محدود رکھنے کی تاکید کی تھی۔ وہ اس چھپے ہوئے نکاح کو آخری وقت حنان کے علم میں نہیں لانا چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

نجانے کتنی بے خواب اور سہمی ہوئی راتوں کے بعد مہر کو آج سکون کی نیند نصیب ہوئی تھی۔ ورنہ جاشی کے برابر میں ہوتے ہوئے بھی وہ ساری ساری رات ڈر کے مارے جاگتی رہتی تھی۔ ان تین دنوں میں اس کی ماں نے اس کے گرد یوں حصار باندھا تھا کہ حنان کی صورت بھی اسے دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ بالکل چپ سی ہو گئی تھی۔ بخار ٹوٹ جانے کے بعد بھی وہ جاشی کے کمرے کی چار دیواری سے نکلنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا اپنا کمرہ اس دن سے خالی پڑا تھا۔ مہر کو وہاں جانے کا سوچ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔ لیکن اب جب سے اس نے ہنی کی آمد کا سنا تھا۔ اس کے وجود پہ چھایا جمود ٹوٹ سا گیا تھا۔ رات شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد اس نے اتنے دنوں میں

پہلی بار رغبت سے کھانا کھایا تھا اور پھر اس کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ مگر خلاف معمول نہ وہ ڈری تھی اور نہ خالی الذہنی کے عالم میں درو دیوار کو تکتی ہولتی رہی تھی۔ بلکہ وہ چند ہی لمحوں میں بڑی گہری اور پر سکون نیند سو گئی تھی۔ نتیجتاً" اس کی آنکھ اپنے پرانے معمول کے مطابق فجر کے وقت کھل گئی تھی۔ اس نے بڑی دل جمی سے اٹھ کر نماز فجر ادا کی تھی۔

نماز پڑھ کے اس کے دل کو بے حد سکون ملا تھا اور اسی سکون بھری کیفیت میں اس کا دل اوس میں بھیگی نرم گھاس پہ چہل قدمی کے لیے مچل اٹھا تھا۔ وہ بلا ارادہ ہی اٹھی تھی اور دروازہ کھول کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

باہر ہر سو مکمل خاموشی تھی۔ زیب بیگم کے کمرے کی لائٹ بھی بند ہو چکی تھی۔ شاید وہ نماز پڑھ کے دوبارہ لیٹ گئی تھیں۔ رہا حنان تو وہ تو اس وقت اٹھنے کا عادی ہی نہیں تھا۔ سو مہر اطمینان سے قدم اٹھاتی نیچے چلی آئی تھی اور داخلی دروازہ کھول کے باہر لان میں نکل آئی تھی۔

وہ پاؤں میں پہنی چپل اتار کے نرم ٹھنڈی گھاس پہ ٹہلنے لگی تھی اور اسی وقت حنان اپنے کمرے میں کھڑکی کے پردے برابر کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا تھا۔

رات ہنی کی آمد کا سن کے وہ اتنا بدمزہ ہوا تھا کہ کھانا چھوڑ کر اپنے دوستوں کی طرف نکل گیا تھا اور پھر وہیں ان کے درمیان ساری رات گزار کے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر لوٹا تھا۔ وہ سونے کے ارادے سے کھڑکی کے پردے برابر کرنے کو آگے آیا تھا۔ اور تبھی اس کی نظر لان میں ٹہلتی مہر پہ پڑی تھی۔ اس کی اتنے دنوں کی فرسٹریشن عود کر آئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے پردہ چھوڑ کر پلٹا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا تھا۔

"اچھا وقت ہے اپنی پناہ گاہ سے نکلنے کا۔" اور اپنے دھیان میں ٹہلتی مہر کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کی روح قبض کرلی ہو۔ وہ اتنی وحشت زدہ ہوئی تھی کہ اس میں

پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔
"تم نے سوچا ہوگا کہ حنان تو سو رہا ہوگا مگر۔۔۔۔ چچ چچ۔ ادھر مہر صاحبہ نے قدم باہر نکالا اور ادھر۔۔۔" وہ قصداً" بات ادھوری چھوڑ کے ہنسا۔ مہر نے بھاگ کر وہاں سے اندر جانے کی کوشش میں جونہی قدم بڑھائے' حنان نے تیزی سے آگے بڑھ کے اس کا راستہ روک لیا۔
"اوں ہوں۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" مہر کے فق ہوتے چہرے پہ نگاہ جمائے وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔
"پتا ہے' تمہارے اس خوب صورت چہرے پہ کبھی یہ خوف دیکھنے کی میں نے بڑی تمنا کی تھی۔ مگر آج جب یہ پھیلا ہے تو یقین مانو ذرا اچھا نہیں لگ رہا۔ جانتی ہو کیوں؟" وہ ایک قدم آگے آیا تو مہر کتنے ہی قدم پیچھے ہٹ گئی۔
"کیونکہ تمہارے معاملے میں یہ دل اچانک ہی میرے مقابل ڈٹ گیا ہے۔ محبت ہوگئی ہے مجھے تم سے مہر احمد!" اس پر نظریں جمائے وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ مہر کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھیل سی گئیں۔
"یقین نہیں آرہا نا۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ اپنی ماں سے جاکے پوچھو۔ ہاتھ مانگا ہے میں نے تمہارا۔" اور مہر کو لگا تھا جیسے اس کے اعصاب پہ کوئی بم آگرا ہو۔
"تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" اتنی دیر میں پہلی بار اس کے ہونٹوں نے جنبش کی تھی۔
"یہی سوال اس دن تمہاری ماں نے بھی پوچھا تھا۔ خاصا تفصیل سے جواب دیا تھا میں نے انہیں' تمہارے لیے اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ اس روز کے بعد سے بھاگئی ہو تم مجھے' اور جو چیز حنان قاضی کو بھاجائے وہ بھلا کہیں اور کیسے جاسکتی ہے؟" اس کی طرف دیکھتا وہ دھیرے سے مسکرایا تو مہر کی آنکھوں میں پھیلی بے یقینی نفرت میں ڈوب گئی۔
"میں کوئی چیز نہیں ہوں حنان قاضی! جو تم جیسا گندہ آدمی مجھے اٹھا کر اپنے کمرے میں سجالے گا۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں شدید نفرت! اپنے اندر کی ہوس کو محبت کا نام دے رہے ہو۔ تمہیں تو ڈوب کر مر جانا چاہیے۔"
"تمہیں پتا ہے مہر احمد۔ تمہارا یہ گریز' یہ نفرت۔ میری ضدی طبیعت کو اور بھی تمہاری جانب مائل کر رہا ہے۔ اب تو اگر تم سے محبت نہیں بھی ہے۔ تب بھی شادی تو تم سے ہی کرنی ہے مجھے۔" وہ عجیب سے سرد اور قطعی لہجے میں گویا ہوا تھا۔
اس کے انداز نے بے اختیار مہر کو اس بات کا احساس دلایا تھا کہ کیوں زیب اس کے نکاح کی خبر کو آخری وقت تک حنان سے چھپانا چاہتی تھیں۔ وہ اتنی کمینگی پہ اترا ہوا تھا کہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔
"بھول ہے تمہاری۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" مہر دوبدو بولی تھی۔
"آج تو بہت ہمت آگئی ہے۔ کس کا زعم ہے جان حنان! کہیں ڈیئر ہنی کا تو نہیں؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا تو مہر بے اختیار خاموش ہوگئی۔ اس کا سہا ہوا دل اندر ہی اندر مزید سہم گیا۔
"ایک بات یاد رکھنا مہر۔ اس بار اگر تم مجھے اس شخص کے اردگرد نظر آئیں۔ تو میں تمہارا تو نہیں' البتہ اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دوں گا!" انگلی اٹھائے وہ اچانک تنبیہی انداز میں بولا تو مہر کی سانس ایک پل کو رک سی گئی۔
"تم مجھے پابند نہیں کرسکتے۔" اپنے گرتے حوصلے کو سنبھالے اس نے ہمت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔
"پابند تو تمہارا باپ بھی ہوگا۔ یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لینا۔" اور مہر اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتی' دوسری طرف سے نکل کے تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔ صد شکر تھا کہ اس نے مہر کو جانے دیا تھا۔
کمرے کی محفوظ چار دیواری میں پہنچ کر اس نے اپنے پیچھے دروازہ مضبوطی سے بند کیا تھا اور اپنے لرزتے وجود کو سنبھالے وہیں کارپٹ پہ بیٹھ گئی تھی۔
"کہاں ہیں آپ ہنی! پلیز جلدی گھر آجائیں۔" گھٹنے

پہ پیشانی ٹکائے وہ بے آواز سسک اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے چار' پانچ دن بڑی تیزی سے گزرے تھے اور ثموز ابراہیم پورے سوا دو سال بعد ایک بار پھر وہیں آ پہنچا تھا۔ جہاں کے نام سے بھی اسے چڑ تھی۔ یہاں تک آنے کے لیے اس نے سوزی کو کیسے قائل کیا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔ مگر اس کا اپنا دل' اپنے باپ کی طرف سے بری طرح کھٹک گیا تھا۔ ان کا یوں اسے پاکستان لانا ہرگز بے مقصد نہ تھا۔

زیب کے گھر میں اس کا پہلے کی طرح بھرپور استقبال ہوا تھا۔ وہ اس سے اتنی ہی بھرپور محبت سے پیش آئی تھیں۔ جس طرح ہمیشہ آتی رہی تھیں۔ رہی مہر تو اس کی نظریں پہلے بھی اس کے سامنے جھکی رہتی تھیں اور اب بھی جھکی ہوئی ہی تھیں۔ مگر اس کا چہرہ اس کی اندرونی خوشی کی عکاسی' آئینہ بن کے کر رہا تھا۔ وہ اس تمام عرصے میں پہلے سے بڑھ کر پیاری ہو گئی تھی۔ اتنی جاذب نظر کہ ایک پل کو تو سیم بھی ٹھٹک کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کی نظروں کے ارتکاز نے مہر کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا برپا کر دیا تھا۔ ہنی کی ذات سے جڑے اس کے سارے شکوے' ساری منفی سوچیں اپنے آپ مٹ گئی تھیں اور اس کی ذات پہ ان دو سالوں سے چھائے مایوسی کے بادل چھٹ کر کہیں دور چلے گئے تھے۔ وہ انجم کے بازو کے گھیرے میں کتنی ہی دیر شاداں اور پر سکون بیٹھی مسکراتی رہی تھی۔

کھانے کے بعد جس وقت کافی کا دور چلا تھا۔ تب حنان نے گھر میں قدم رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی انجم کی بھنویں تن گئی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھری محفل میں اس کے چہرے پر سے شرافت کا یہ نقاب نوچ لیں۔ اس کے بددلی سے کیے گئے سلام کا جواب انہوں نے اس سے بڑھ کر سرد مہری سے دیا تھا۔ جبکہ ثمرینہ سے اس نے اس تکلف کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ اسے مکمل طور پہ نظرانداز کیے اس کے عین مقابل ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی یہ بدتمیزی ثمرینہ کا خون کھولا گئی تھی۔ دونوں کی نگاہیں پل بھر کو ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں۔ اور دونوں پہ ہی ان کی ناگواری اور بے زاری واضح ہو گئی تھی۔

"اچھا تو زیب اور صغیر' میرے خیال میں اب وہ وقت آگیا ہے۔ جب ہمیں اپنے بچوں کے رشتے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچاد ینا چاہیے۔"

ابراہیم ملک کی آواز پر ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ہٹ کر ان کی طرف اٹھی تھیں۔ مگر ان کی بات کے اختتام تک دونوں کے ہی رنگ بدل گئے تھے۔ ثمرینہ کی رنگت فق۔ جبکہ حنان کے چہرے پہ نا سمجھی بھری الجھن آٹھہری تھی۔

"میں اس جمعے کو مہر کی رخصتی چاہتا ہوں۔" اور حنان کو لگا تھا جیسے گھر کی چھت اس کے سر پہ آگری ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے طے ہوتی ضروری باتوں کو سن رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں کمرہ مبارک سلامت کی خوشیوں بھری پکار سے بھر گیا تھا۔ مہر احمد بچپن سے ثموز ابراہیم کے نکاح میں تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ نویرہ' جائشہ کی بے یقینی بھی عروج تھی۔ سب بے تحاشا خوش تھے۔ سوائے ان دونوں لڑکوں کے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہو کے بھی اس پل ایک ہی صدمے سے دوچار تھے۔ اچانک ملنے والی ہار کا صدمہ۔

فرق صرف اتنا تھا کہ ایک مہر احمد کو کھو کر ہارا تھا۔ اور دوسرا اسے پا کر ہارا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" اپنے کمرے میں تنہائی ملتے ہی ثموز ماں باپ پہ پھٹ پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اپنے ہی لالچ کے ہاتھوں بندھے تھے۔ وہ اس لمحے مکمل طور پر بے بس تھا۔

"کیوں تمہاری شادی نہیں کرنی ہمیں؟" اس کے برعکس ابراہیم ملک بالکل پر سکون تھے۔

"آپ لوگ جانتے ہیں۔ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پہلی بار اپنی اس آنکھ مچولی کو زبان دی تھی۔

"ہم کیسے جان سکتے ہیں؟ تم نے آج سے پہلے تو یہ بات کبھی ہم سے نہیں کہی۔" ابراہیم صاحب کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"انجان مت بنیں بابا! آپ دونوں جانتے ہیں کہ میں نے کبھی مہر میں کوئی انٹرسٹ شو نہیں کیا۔"

"صحیح کہہ رہے ہو۔ تمہارا انٹرسٹ تو اور بہت سی چیزوں میں رہا ہے۔" پُرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے چوٹ کی تو تیمور کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"مگر کیا ہے تیمور صاحب! آپ کو اپنی فیملی میں دوبارہ قبول کرنے کے لیے میری یہی شرط ہے۔" وہ اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے انتہائی پرسکون لہجے میں گویا ہوئے تھے۔ ان کا بے لچک انداز تیمور کے اندر بے یقینی بھر گیا تھا۔

"آپ، آپ اس تھرڈ کلاس لڑکی کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں؟"

"وہ تھرڈ کلاس ہے یا فرسٹ کلاس۔ ہماری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ ابھی جاؤ۔ ٹکٹ کٹاؤ اور امریکہ پہنچ جاؤ۔ ہم میں سے تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔" وہ رسان سے کہتے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو تیمور کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ نکلیں

"یہ زور زبردستی ہم میں سے کسی کو کچھ نہیں دے پائے گی بابا!" وہ باپ کی طرف دیکھتا سرد لہجے میں بولا تو خاموش تماشائی بنی بیٹھی انجم کا دل ڈوب سا گیا۔ واقعی اگر وہ زبردستی ہنی اور مہر کو اس رشتے میں باندھ بھی دیتے، تب بھی وہ ہنی کو اسے بہ خوبی نبھانے پہ مجبور تو نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اگر دوسری طرف وہ ابراہیم ملک کو اس زبردستی سے روک دیتیں۔ تو اپنی بہن کو کیا جواب دیتیں۔ وہ مہر کو حسان نامی عفریت سے کیسے بچاتیں؟

"میری یہی شرط ہے تیمور۔" اس کے چہرے پہ نگاہ جمائے انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات دہرائی تو تیمور کی مٹھیاں مارے اشتعال کے سختی سے بھینچ گئیں۔ وہ چند لمحے انہیں سلگتی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔

اس کے تیور ابراہیم صاحب کو رتی برابر متاثر نہ کر پائے تھے۔ لیکن انجم بیگم کے لیے اس پریشانی سے نکلنا ناممکن تھا۔ وہ بے بسی سے اپنا سر تھام کے بیٹھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

مہر، جاشی کی فرمائش پہ اپنا اور اس کا چائے کا مگ ٹرے میں رکھے چھت پہ آئی تھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر جاشی کے ساتھ کھڑے تیمور سے ٹکرائی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

"دلیجیے آ گئیں آپ کی منکوحہ صاحبہ!" ایک نظر مہر پہ ڈالتی وہ تیمور کی طرف دیکھ کے شرارت سے مسکرائی تھی۔ "اب آپ دونوں جتنی چاہیں باتیں کریں۔ میں چلتی ہوں۔" وہ پلٹ کر مہر کو دیکھتی معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ اور جھپاک سے سیڑھیاں اتر گئی تھی۔

اس کے یوں دغا دے جانے پر، مہر نے پلٹ کر سامنے دیکھا تھا اور تیمور کو اپنی جانب پوری طرح متوجہ پا کے اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ وہ نگاہیں چرائے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

"چائے۔" اس نے ٹرے آگے بڑھائی تو تیمور نے خاموشی سے مگ تھام لیا تھا۔ اس کی نظریں مہر سے ہٹ کر دور تک پھیلی روشنیوں پہ جا ٹھہری تھیں۔ وہ اپنا مگ لیے اس سے قدرے فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی تھی۔

"مہر!" اور مہر کو لگا تھا جیسے اس کی پوری جان اس ایک لفظ میں سمٹ آئی ہو۔ تیمور کے منہ سے اپنا نام اسے کچھ ایسا ہی معتبر کر گیا تھا۔

"تم یہ روشنیاں دیکھ رہی ہو۔" اس نے مہر کی

طرف دیکھے بنا انگلی سے اشارہ کیا تو مہر بے اختیار اپنے سامنے پھیلی ان روشنیوں کو دیکھنے لگی۔
"جی۔"
"کیسی لگ رہی ہیں یہ؟" اس نے رسان سے سوال کیا تو مہر ایک پل کو الجھ سی گئی۔
"اچھی لگ رہی ہیں۔" اس نے گردن موڑ کر ایک نظر ثموز پہ ڈالی جواب بھی نظریں سامنے جمائے ہوئے تھا۔
"اب اگر تمہیں کہا جائے کہ انہیں چھوڑ کر ایک اندھیری بند گلی میں جا کھڑی ہو تو؟" اس نے اچانک رخ موڑتے ہوئے مہر کی آنکھوں میں جھانکا تو حیرت زدہ سی مہر خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔
"تمہارا ساتھ میرے لیے ایک ایسی ہی اندھیری گلی ہے مہر۔ جس میں' میں خود کو ساری عمر کے لیے بند نہیں کر سکتا۔" اس کے چہرے پہ نظریں جمائے وہ سکون سے بولا تھا۔ اور مہر کو لگا تھا جیسے کوئی سنسناتا ہوا تیر اس کے سینے میں اتر گیا ہو۔ وہ ناسمجھی کے عالم میں کھڑی اسے دیکھنے لگی تھی۔
یہ 'یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟
"اتنے سالوں میں' میں نے اپنے ماں باپ' تمہارے ماں باپ۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی اپنے ہر ہر عمل سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مجھے تم میں یا اس رشتے میں کوئی دلچسپی نہیں مگر کوئی یہ بات سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔" اس نے کندھوں کو اچکاتے ہوئے ساکت کھڑی مہر کو دیکھا تھا۔ "اب تم ہی بتاؤ محبت کے بغیر کیا ہم اس شادی کو....."
"میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں ہنی۔" اس پہ نگاہیں جمائے وہ بہت اچانک اور بہت دھیرے سے بولی تھی۔ اتنی اچانک کہ سامنے کھڑا ثموز اپنی بات مکمل کرنا بھول گیا تھا۔
"میں آپ کے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" اور ثموز کو لگا تھا جیسے اس کی گردن میں پڑا پھندا کسی نے مزید کس دیا ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

"سوری ٹو سے مہر۔ لیکن یہ میرا ہیڈیک (دردِ سر) نہیں۔" بے چینی سے سامنے تکتے ہوئے وہ دھیمے لیکن سرد لہجے میں بولا تو مہر کے بے وزن وجود کو ایک دھچکا سا لگا۔
"ہیڈیک! تو کیا وہ ہیڈیک تھی؟" اس کی خالی نگاہیں ثموز کے چہرے پر آٹھہری تھیں۔ ثموز نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے بے اختیار اک گہری سانس لی۔
"دیکھو مہر! تم ایک پڑھی لکھی' خوب صورت لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے تمہارے لیے اچھے لڑکوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔" وہ اس کی طرف پلٹا تو مہر کی بے جان آنکھیں اس کے بے تاثر چہرے کو ٹٹولنے لگیں۔ کہیں کوئی ملال' کوئی رحم' کوئی احساس۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔
"وہ اچھا لڑکا آپ کیوں نہیں ہو سکتے ہنی؟" اس نے دل گرفتی سے سوال کیا تو ثمیم جھنجلا سا گیا۔
"نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکا میں نہیں ہو سکتا مہر!" وہ چڑ کر غصے سے بولا۔ مہر اپنے سائیں سائیں کرتے وجود کے ساتھ خاموش ہو گئی۔
"پلیز مہر! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔ اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر بابا اس رشتے کی وجہ سے ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ تم پلیز میرے ساتھ چل کر یہ کہہ دو کہ تمہیں بھی یہ رشتہ قبول نہیں۔ پلیز مہر!"
ملتجی انداز میں کہتے ہوئے اس نے مہر کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کا لمس مہر کے اندر حشر برپا کرنے لگا تھا۔ کوئی اتنا ظالم' اتنا شقی کیسے ہو سکتا ہے.... وہ مہر احمد کی جان اپنے ہاتھوں میں سمیٹے کھڑا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا کہ اپنی مٹھی کھول دے؟
"اور .... اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟" مہر کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ جن کے عکس میں ثموز ابراہیم کے گال کا وہ دلفریب تل بھی ڈولنے لگا تھا۔
"تو یاد رکھنا تمہیں بھی میری ذات سے کبھی کوئی

خوشی نہیں ملے گی!" اس نے مہر کا ہاتھ جھٹکنے میں لمحہ نہیں لگایا تھا۔ بے اختیار مہر کی نظریں اپنے خالی ہاتھ پر آٹھہری تھیں۔ وہ اتنی بے وقعت نہ تھی۔ اس درجہ تحقیر کے بعد تو وہ اپنی محبت کا خود آگے بڑھ کر گلا گھونٹ دیتی مگر تموز ابراہیم کے گلے کا طوق کبھی نہ بنتی۔ مگر وہ اس ذلت کا کیا کرتی جو حنان قاضی اس کے ماتھے پہ سجانے کے لیے بے چین تھا۔

"ٹھیک ہے۔ نہ دیجئے گا کوئی خوشی۔" دھیرے سے بولتے ہوئے اس نے اپنی نگاہیں تموز کے چہرے پہ جما دی تھیں۔ جو اس کا فیصلہ سن کے ایک پل کے لیے ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ لیکن محض ایک پل کے لیے۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ مارے اشتعال کے تیزی سے سرخ ہو گیا تھا۔

"میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں مہر احمد! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ نہیں تو میں تمہاری ذات کو تماشا بنا کے رکھ دوں گا!" اس کے لہجے کی ٹھنڈک اور آنکھوں کی نفرت اس بات کی گواہ تھی کہ وہ ایسا ہی کرنے والا تھا۔ مگر۔۔۔

"آپ کی راہ میں کھڑی رہوں یا راستے سے ہٹ جاؤں۔

دونوں صورتوں میں میرا ہی تماشا بننے والا ہے۔ سو کوئی بات نہیں۔" مہر زخم خوردہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بوجھل لہجے میں بولی تو تموز نے اسے گھورتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا مگ پوری طاقت سے زمین پہ دے مارا۔ گرم چائے مہر کے پیروں کو جلاتی اس کے کپڑوں کو داغ دار کرتی چلی گئی تھی۔ وہ سہمی سی بے اختیار کتنے ہی قدم پیچھے ہٹی تھی۔ مگر تموز کی بے رحم گرفت نے اسے ایک ہی جھٹکے میں اس کے بے حد قریب کر دیا تھا۔

"تم دیکھنا مہر احمد! اب تمہارا میں کیا حشر کروں گا!" اس کی متوحش آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اس بے دردی سے مہر کا بازو جھٹکا تھا کہ وہ بے اختیار کراہ اٹھی تھی۔ مگر وہ اس پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا، کرچیوں کو اپنے جوتوں تلے روندتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی مہر کی ہمت اس کا حوصلہ دونوں جواب دے گئے تھے۔ وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ سالوں کی محبت، برسوں کا انتظار سب ایک ہی جھٹکے میں خاک ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دو دنوں میں ابراہیم صاحب کی خواہش پر ان کی فیملی صغیر قاضی کے دوسرے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ وقت کی کمی کے باعث سبھی مل کر شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مہر پہ کیا گزری تھی اس نے کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے انکار کے بعد سیم کی گلو خلاصی کی آخری امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن یا تو گھر سے باہر گزارتا یا پھر اپنے کمرے میں بند پڑا رہتا۔ اس نے ماں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اسے کسی بھی معاملے میں شامل نہ کیا جائے۔ وہ مارک سے مسلسل رابطے میں تھا مگر سوزی کو اس نے اس ساری بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

دوسری طرف حنان کے لیے مہر کو کسی اور کا ہوتا دیکھنا ناممکن تھا۔ اس نے مہر کی صورت میں اپنی محبت نہیں بلکہ اپنی ضد ہاری تھی اور اس احساس نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اس حد تک کہ وہ شادی سے تین دن پہلے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اپنے دوستوں کے ساتھ اسلام آباد نکل گیا تھا۔

اس کی اس حرکت نے صغیر صاحب کو شدید غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اس اہم موقعے پہ حنان کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے فون پر اسے بے نقط سنائی تھیں۔ مگر حاصل کچھ نہ ہوا تھا۔ اس نے نہ آنا تھا اور نہ وہ آیا تھا۔ البتہ زیب اس کے جانے سے یک لخت ہر فکر، ہر غم سے آزاد ہو گئی تھیں۔ وہ بھرپور خوشی اور مکمل یکسوئی سے اپنی بچی کی رخصتی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔

حنان کے جانے کے اگلے روز سب نے مل کر مہر کو مایوں بٹھا دیا تھا۔ اس کے آنسو اس کی اداسی کو سب

ہی نے آنے والے وقت سے منسوب کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔ اور بالآخر وہ وقت بھی آ پہنچا تھا۔ جس کا سب ہی کو بے چینی سے انتظار تھا۔

☆ ☆ ☆

"ثموز تیار ہو گیا؟" ابراہیم صاحب نے ہینگر پر سے کوٹ اتارتے ہوئے ایک نظر گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ جو رات کے پونے سات بجا رہی تھی۔ مہمانوں کو آٹھ ساڑھے آٹھ کا ٹائم دیا گیا تھا۔ سارے خاندان والے ان کے ہاں جمع ہونے والے تھے۔ جس کے بعد سب نے سہرا بندی کی رسم ادا کر کے دولہا کے ہمراہ بارات کی صورت ہوٹل پہنچنا تھا۔ جہاں صغیر قاضی نے بہت بڑے فنکشن کا اہتمام کر رکھا تھا۔

"مجھے نہیں پتا آپ جا کے دیکھ لیں۔" انجم نے اپنا گلوبند پہنتے ہوئے مصروف سے انداز میں جواب دیا تھا۔ ابراہیم صاحب اپنا کوٹ پہن کر کمرے سے باہر نکلے تھے۔ ان کا رخ ثموز کے کمرے کی طرف تھا۔ لیکن جونہی وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئے بے اختیار چونک گئے تھے۔

ثموز بنا کسی تیاری کے 'راکنگ چیئر' پہ بیٹھا اسموکنگ میں مصروف تھا۔ بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اس کا حلیہ خاصا رف ہو رہا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے رخ موڑ کے ایک نظر آنے والے پر ڈالی تھی اور پھر بے نیازی سے اپنے شغل میں مصروف ہو گیا تھا۔

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئے؟" اس کی یہ بدتمیزی ابراہیم صاحب کو سلگانے کے لیے کافی تھی۔

"کس لیے؟" اس نے سیدھے ہونے کی زحمت کیے بغیر باپ کی طرف دیکھا تھا۔

"ثموز!" ان کی پیشانی پہ بل نمودار ہو گئے تھے۔

"آج نہیں بابا! آج یہ رعب نہیں چلے گا آپ کا۔" وہ پرسکون انداز میں کہتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "آج آپ کو وہی کرنا پڑے گا جو میں چاہوں گا۔"

"اور تم کیا چاہتے ہو؟" ابراہیم ملک نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"آج میں آپ کی لاڈلی کی بارات لے کر تب ہی جاؤں گا' جب آپ تین دن کے اندر اندر یہ دولت' جائیداد سب کچھ میرے نام کر دیں گے۔" ان پر نگاہ جمائے وہ بولا تو ابراہیم صاحب کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"واہ! بڑی جلدی قلعی اتار دی بیٹا۔"

"اب تو اتر گئی بابا۔ اب کیا' کیا جا سکتا ہے۔" انہیں دیکھتے ہوئے اس نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی تھی۔ کمرے میں لحظہ بھر کو خاموشی چھا گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ تین دن کے اندر اندر تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ رسان سے بولے تو ثموز ان کے یوں آسانی سے مان جانے پر متعجب سا ہو گیا۔

"اس کی گارنٹی کیا ہے؟" اس کی آنکھوں میں پھیلا شک ابراہیم ملک کے لبوں پہ زخم خوردہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"یہ ابراہیم ملک کی زبان ہے بیٹا! کسی دغاباز سیم کی نہیں۔" اور ثموز اس چوٹ پہ لب بھینچ گیا تھا۔

"اب تیاری پکڑو۔ مہمان پہنچنے والے ہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتے باہر نکل گئے تھے اور ثموز کی آنکھوں کے سامنے مہر کا چہرہ آ ٹھہرا تھا۔

"مہر احمد! تم بھی اب تیاری پکڑو۔ میں پہنچنے والا ہوں۔" وہ تصور میں مہر کو لا کر وہ زہرخند سا بڑبڑایا تھا۔

☆ ☆ ☆

بارات کا استقبال بڑی خوشیوں سے کیا گیا تھا۔ ثموز آف وائٹ شیروانی اور ہلکے سنہری صافے میں اتنا وجیہہ لگ رہا تھا کہ دیکھنے والے بے اختیار مہر کی قسمت پہ رشک کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سب بڑوں کی خواہش پر نکاح کی سنت کو ایک بار پھر ادا کیا گیا تھا اور ایجاب و قبول کے مرحلے کے بعد ہلکے سنہری

شرارے میں ملبوس مہر کو تموز کے پہلو میں لا بٹھایا گیا تھا۔ دونوں کی جوڑی نے صحیح معنوں میں اسٹیج پر سنہری روشنی بکھیر دی تھی۔ اس موقعے پہ اپنی مرحومہ والدہ کو یاد کر کے انجم اور زیب کی آنکھیں بے اختیار بھر آئی تھیں۔

بالآخر یہ خوب صورت تقریب بھی اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔ آنسوؤں، دعاؤں اور قرآن پاک کے سائے تلے مہر رخصت ہو کے ایک ایسی منزل کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ جہاں کوئی روپہلا خواب اس کے ہمراہ نہ تھا۔

رسموں کی ادائیگی کے بعد انجم، مہر کو اس کمرے میں لے کر آئی تھیں، جو انہوں نے ڈیکوریٹر سے خاص طور پہ سیٹ کروایا تھا۔ وگرنہ جو کمرہ تموز کے زیر استعمال تھا۔ اسے تو اس نے کسی کو ہاتھ بھی لگانے نہ دیا تھا۔ کمرے کی آرائش تازہ پھولوں، ربن اور موم بتیوں سے کی گئی تھی، جو سارے ماحول کو بے حد فسوں خیز بنا رہی تھی۔ اتنی محنت، اتنی خوب صورتی مہر کے دل کو مزید رنجیدہ کر گئی تھی۔

"مہو میری جان! تم اس گھر میں بہو نہیں بیٹی بن کر آئی ہو۔ آج سے ہم تمہارے ماں باپ پہلے ہیں اور ہنی کے بعد میں۔ تمہارے حق میں اگر اس سے ذرا سی بھی کوتاہی ہو تو تم بلا جھجک ہم سے کہہ سکتی ہو۔ خود کو یہاں کبھی اکیلا مت تصور کرنا میری جان!" آنے والے لمحوں کا خوف انجم کے دل میں گرہیں سی باندھ رہا تھا۔ انہوں نے بے اختیار مہر کو خود سے لپٹا لیا تھا۔

"پتا نہیں یہ لڑکا اس معصوم کے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہے؟" پریشانی سے سوچتے ہوئے انہوں نے مہر کے بہتے اشک صاف کیے تھے اور اندیشوں میں ڈوبی باہر نکل آئی تھیں۔ لیکن لاؤنج میں سیم کو جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ٹی وی کے آگے بیٹھا کر وہ اپنی جگہ پہ رک گئی تھیں۔

"تم نے چینج کیوں کر لیا ہنی؟" ان کی آواز پہ سیم نے اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ فارغ ہو گئیں؟" ان کی بات کا جواب دیے بنا اس نے بے تاثر لہجے میں سوال کیا تو انجم ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں۔

"ہاں۔ لیکن تم۔۔۔" انجم بیگم کی بات ابھی منہ میں تھی کہ وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے جاتا دیکھ کر وہ بے چین سی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔

"ہنی! بات سنو بیٹا۔" اور تموز کی بدلحاظی عود کر آئی تھی۔

"کیا بات ہے ماما! کیوں پریشان کر رہی ہیں مجھے؟" وہ انتہائی بدتمیزی سے بولا تھا۔ مگر انجم اس کی اس بدتمیزی کو مکمل طور پہ نظرانداز کیے بے حد نرمی سے بولی تھیں۔

"دیکھو بیٹا۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں مہر کا کوئی قصور۔"

"بس!" اس کے اچانک ہاتھ اٹھا کر ٹوکنے پہ انجم ساکت رہ گئی تھیں۔ "آپ کا کام یہیں تک تھا ماما! اب میں جانوں اور میری بیوی۔ گڈ نائٹ!"

سپاٹ لہجے میں اپنی بات مکمل کر تا وہ پلٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اور انجم اس کی پشت کو بے یقین نظروں سے دیکھتی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

انجم بیگم کے کمرے سے نکلنے پہ مہر نے اپنے آنسو صاف کیے تھے اور پھر ہنی کی آمد سے پہلے وہ کپڑے تبدیل کرنے کے ارادے سے بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جب اسے مہر کی ذات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی تو اس ہار سنگھار کو قائم رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے ابھی دو پنیں بھی نہیں اتاری تھیں کہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور اگلے ہی لمحے تموز اندر داخل ہوا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور مہر کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا تھا۔ اسے گھر کے حلیے میں دیکھ کر مہر کا دل مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ تموز نے پلٹ کر دروازہ بند کیا تھا اور مہر کی جانب رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی

نگاہیں مہر کو اپنے آرپار ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ جھجک کر نظریں چرا تی چہرہ جھکا گئی تھی۔ دلہن کے روپ میں اس کا حسن دو آتشہ ہو رہا تھا۔ مگر افسوس دیکھنے والی کی نگاہ میں دور تک ستائش نہ تھی۔

"آپ میری طرف سے آزاد ہیں ہنی۔ آپ جب چاہیں اپنی محبت کو اپنی زندگی میں شامل کر سکتے ہیں۔" اس کی بوجھل آواز کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑنے کا سبب بنی تھی۔ سیم نے چونک کر استہزائیہ نظروں سے سر تا پا اسے دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت ہے؟ ہم دونوں وہاں ساتھ رہتے ہیں مہر احمد!" اور مہر کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے بے یقین نظروں سے ثموز کی جانب دیکھا تھا جو دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟ ارے بھئی محبت ہوں تمہاری۔ بلکہ صرف محبت ہی نہیں شوہر بھی ہوں تمہارا۔ کیا ہوا جو عورتوں کا شوق ہے مجھے۔ اور کیا ہوا جو میں — پیے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ.... آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" مہر کی کانپتی آواز اس کے جذبات کی عکاسی کر رہی تھی۔ سیم نے ایک مسکراتی نظر اس کی اڑی ہوئی رنگت پہ ڈالی تھی اور اپنی جیب میں رکھا موبائل نکال کر اس میں موجود تصویریں کھولنے لگا تھا۔

"لو دیکھو۔" اس نے موبائل مہر کی جانب اچھال دیا تھا۔

لرزتے ہاتھوں سے موبائل تھامے مہر نے اسکرین کی طرف دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ وہ سیم اور سوزی کی ساحل سمندر کی تصویر تھی۔ بے اختیار ہی مہر کی انگلی اسکرین پہ پھری تھی اور ساتھ ہی منظر بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ سیم اور سوزی کی نائٹ کلب میں لی گئی تصویر تھی۔ جس میں دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے مشروب کے گلاس صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے تصویریں بدلتی گئی تھیں۔ اور مہر مارے وحشت کے پلکیں تک جھپکنا بھول گئی تھی۔ یہاں تک کہ مزید کچھ دیکھنے کا یارا نہ رہا اور موبائل اس کے بے جان ہاتھوں سے چھوٹ کر کارپٹ پہ جا گرا تھا۔

"ہو گئی تسلی؟" سیم کے مسکرا کر پوچھنے پہ مہر کی روئی ہوئی آنکھیں اس کے وجیہہ چہرے پر موجود تل پہ آٹھہری تھیں۔

"میں نے آپ کو کیا سمجھا تھا ہنی اور آپ کیا نکلے!" اپنے حنائی ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ سسک اٹھی تھی۔

"اوں ہوں مہر احمد! رات کا مزہ مت خراب کرو۔ مجھے روتی ہوئی عورتیں بالکل پسند نہیں۔" ثموز نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھوں کو چھوا تھا اور مہر کے پورے وجود میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔ وہ تڑپ کے پیچھے ہٹی تھی۔

"پلیز ہنی! میرے قریب آنے کی کوشش مت کیجئے گا!" اس کی برستی آنکھوں میں درد اپنے عروج پر تھا۔

"کیوں نہ آؤں قریب؟ بیوی ہو تم میری اور بیوی بھی وہ جو میری محبت کا دم بھرتی ہے۔ یہ خوابناک رات، مہکتا ماحول سب کچھ تمہارے خوابوں کے عین مطابق تو ہے۔" وہ سرد مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس کی طرف بڑھا تھا۔ بے اختیار روتی ہوئی مہر نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔ کون سا وقت تھا جب وہ اس شخص سے اظہار محبت کر بیٹھی تھی۔

"پلیز ہنی! میں آپ کی راہ سے ہٹ جاؤں گی۔ مجھے صرف آپ کا نام چاہیے۔" ملتجی انداز میں کہتے ہوئے اس نے سیم کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"نہیں مہر احمد اب نہیں!" سیم کی آنکھوں سے مارے نفرت کے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔ متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے

اس نے اس کے پہلو سے نکل جانا چاہا۔ سیم بجلی کی سی تیزی سے پلٹا تھا اور پلک جھپکنے میں مہر کی کلائی سیم کی مضبوط گرفت میں آگئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے مہر کو بیڈ پہ دھکا دیا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا تم سے۔ میری ذات سے تمہیں کوئی خوشی نہیں ملے گی۔" سیم نے بے رحمی سے اسے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔

سنو!

تم جانتے ہو کیا

رات بہت چپکے سے وہ دم توڑ گیا

جو اعتبار مجھے تم پر تھا!

کمرے کی ساکت فضا میں اس کی سسکیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں۔ مگر انہیں سننے والا واحد انسان بیڈ پہ بہت گہری اور پر سکون نیند سو رہا تھا۔

اُسے کوئی چیز تڑپا رہی تھی تو وہ اس اعتبار کا بکھرنا تھا جو اس نے آنکھیں بند کر کے سالہا سال ثموز ابراہیم پہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ثموز کے ساتھ زبردستی رشتہ جوڑ کے وہ اپنے حق میں ایک برا فیصلہ لے چکی تھی۔ اسے ثموز سے کسی اچھائی کی امید نہ تھی۔ لیکن وہ اس کے ساتھ حنان سے بھی بدتر سلوک کرنے والا تھا۔ ایسا تو اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔

عورتوں کے ساتھ اس کی بدکرداری کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مہر کو لگا تھا۔ جیسے اس کا اپنا کردار بے مول ہو گیا ہو۔ وہ صحیح معنوں میں آج تہی دامن ہو گئی تھی۔ اس کے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔

اس کا دل شدت سے خود کو ختم کرنے لینے کا خواہش مند تھا۔ ہر دور میں دوغلی زندگی جیتے جیتے وہ اپنے وجود سے بے زار آگئی تھی۔ اب ایک بار پھر بہت سی مشکلیں اس کا دامن تھامے کھڑی تھیں۔۔۔ ماں کا اطمینان، ساس سسر کی خوشی، پیچھے حنان، آگے ثموز کی نفرت سے بھری زندگی۔ وہ جاتی تو کہاں جاتی؟ کسے پکارتی؟ دور تک کوئی راستہ نہ تھا۔ سوائے اپنے فیصلے کو نبھانے کے اور مہر احمد نے ایک بار پھر خود کو خاموشی کی سولی پر چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی میز پہ بے حد رونق تھی۔ جاشی اور نورہ بہن بہنوئی کا ناشتہ لے کر آئی تھیں۔ ایسے میں زیب اور صغیر قاضی کو انجم نے بے حد اصرار کر کے خود مدعو کیا تھا۔

مہر کے لبوں کی مسکراہٹ اور چہرے کے اطمینان نے انجم کے دل سے ہر خدشے کو دور کر دیا تھا۔ اس پہ مستزاد سیم کا مطمئن انداز! انجم نے اس ایک ہفتے میں پہلی بار کھل کر سانس لیا تھا۔ زیب کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ وہ بیٹی اور داماد کو ایک ساتھ دیکھ کر اندر تک سرشار ہو گئی تھیں۔

ناشتے کے بعد مہر نے قصداً "بہنوں کو روک لیا تھا۔ ثموز بھی اس ڈرامے سے اکتا کر گاڑی لے کر نکل گیا تھا۔ ولیمہ کی تقریب چونکہ۔ شام کی تھی۔ اس لیے تین بجے کے قریب مہر، جاشی اور نورہ کے ہمراہ پارلر چلی گئی تھی۔ جہاں سے اس کی واپسی سیدھا ہال میں ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مارک نے مسلسل سیم کی فون پہ جان کھائی ہوئی تھی۔ اس کے اصرار پہ بالآخر سیم نے اسٹیج پہ دلہن بنی بیٹھی مہر کی کتنی ہی تصویریں کھینچ کے اسے بھیج دی تھیں۔

"واہ یار، یہ لڑکی ہے یا کوئی پری؟" مارک کا تبصرہ پڑھ کے سیم مسکرا دیا تھا۔

"ہاں پری۔۔۔ جو میری جان کا عذاب بن گئی ہے۔"

"اف! کتنے بدذوق آدمی ہو یار۔ میں تو کہتا ہوں گولی مارو اس سوزی کو اور اس حسین عورت کے ساتھ عیش کی زندگی گزارو۔" مارک کا جواب سیم کے چہرے پہ استہزائیہ رنگ بکھیر گیا تھا۔

"کاش کہ میں تمہاری طرح سوچ سکتا۔"

"پلیز سیم! میں تمہیں صحیح اور مکمل سنجیدگی سے مشورہ دے رہا ہوں۔ جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ ایسا

نہ ہو کہ کل کو تمہیں پچھتانا پڑے۔" اس کا میسج پڑھ کے سیم بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"سیم اپنے فیصلوں پہ کبھی نہیں پچھتاتا۔ یہ بات یاد رکھنا تم!" اور مارک "جیسے تمہاری مرضی" کہہ کے خاموش ہو گیا تھا۔

ولیمہ کے اختتام پہ زیب' رسم کے مطابق مہر کو "قاضی ولا" لے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"اچھا آپا! اب ہمیں اجازت دیں۔" وہ بہن کے پاس چلی آئی تھیں۔ انجم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے' مہر کو آگے بڑھ کے خود سے لگا لیا تھا۔

"خیر سے جاؤ۔" ان کی بات نے صغیر صاحب کے ساتھ بات کرتے سیم کے کان کھڑے کر دیے تھے۔ وہ ان سے معذرت کرتا ماں کی طرف چلا آیا تھا۔

"یہ کہاں جا رہی ہے؟" اس نے مہر کو دیکھا تو وہ بے اختیار نظریں جھکا گئی تھی۔

"یہ آج رات زیب کی طرف رہے گی۔ پھر ہم کل اسے لینے جائیں گے۔" انجم نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"سوری خالہ! میں اپنی دلہن کو کہیں نہیں جانے دینے والا۔" وہ مسکراتا ہوا مہر کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تو دونوں خواتین اس کی اس بے باکی پہ بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔ جبکہ مہر کا بے جان دل اس مصنوعی اظہار محبت پہ نئے سرے سے لرز گیا تھا۔ غیر ارادی طور پہ ہی اس نے ذرا سا کھسک کر دور ہٹنا چاہا تھا۔ مگر سیم نے اچانک اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ مہر کی ٹانگیں مارے خوف کے کانپنے لگی تھیں۔

"ہنی! یہ رسم ہوتی ہے بیٹا۔" زیب مسکرا کر گویا ہوئی تھیں۔

"اچھی بے ہودہ رسم ہے کہ نئے کپل کو الگ کر دینا۔" اور زیب خفت زدہ سی ہنس پڑی تھیں۔

"اف توبہ۔ یہ لڑکا تو بالکل ہی امریکن ہو گیا ہے۔" انہوں نے بہن کی طرف دیکھا تو انجم' جو خود بھی ثموز کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کے اندر ہی اندر بے حد حیران تھیں۔ خوشی سے مسکرا دیں۔

"چلو رہنے دو زیب۔" اور زیب مزید کیا کہتیں انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹی اور بھانجے کو گلے سے لگایا تھا اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازتی واپس ہولی تھیں۔ سب کے ادھر ادھر ہوتے ہی سیم نے ایک جھٹکے سے مہر کا رخ اپنی جانب کیا تھا۔

"کیوں ڈارلنگ! ابھی سے فرار کی خواہش مند ہونے لگیں؟" اور مہر کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

"آئندہ اگر میری اجازت کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانے کی جرات کی نا تو ٹانگیں توڑ کے رکھ دوں گا مہر احمد!"

اس کی سنہری آنکھوں سے نکلتے شعلے مہر کے پورے وجود کو جلا کر خاکستر کر گئے تھے۔ اس جلن اس اذیت نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔ وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتی اس کے ہمراہ اپنی مقتل گاہ کی طرف چل پڑی تھی۔ جہاں ایک اور سیاہ رات اس کا مقدر بننے کو تیار کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

تین دن صرف تین دن گزرے تھے۔ مہر احمد کو اپنے ارمانوں کی اس قبر میں دفن ہوئے اور اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس دوغلی زندگی نے محض بہتر گھنٹوں میں اس کے اندر سے یوں جان نچوڑی تھی کہ وہ نڈھال ہی بستر سے جا لگی تھی۔ اس کی طبیعت کی خرابی نے انجم کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔ صدقہ خیرات' دعائیں' دوائیں کیا کچھ نہ کر ڈالا تھا انہوں نے تب کہیں جا کر مہر کی طبیعت سنبھلی تھی۔ اس کے منع کرنے پر انجم نے زیب سے مہر کی طبیعت خرابی کا ذکر نہ کیا تھا۔

اس وقت بھی وہ مہر کے سرہانے بیٹھی اپنے ہاتھوں سے اسے یخنی پلا رہی تھیں۔ جب لاؤنج سے اچانک ثموز کے اونچا اونچا بولنے کی آواز نے دونوں کو گھبرا کے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

انجم نے سرعت سے ہاتھ میں پکڑا پیالہ ایک طرف رکھا تھا اور اٹھ کر دروازے کی جانب بھاگی

تھیں۔ مہر بھی بے اختیاری کے عالم میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تموز کی آواز بتدریج اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ جسے سن کر گھبرائی ہوئی مہر کے قدموں میں تیزی آگئی تھی۔ وہ راہداری عبور کر کے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن جونہی اس کی نظر ابراہیم ملک کے مقابل انگارے کی طرح دہکتا چہرہ لیے کھڑے تموز پہ پڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ تموز اس لب و لہجے میں ابراہیم صاحب سے مخاطب تھا۔ وہ حیران رہ گئی تھی۔ انجم الگ حواس باختہ سی باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑا دیکھ رہی تھیں۔

"آپ میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کریں گے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔" تموز نے ہاتھ میں پکڑی فائل صوفے پہ پٹخ دی تھی۔ اس فائل میں کیا تھا؟ تموز کس دھوکے کی بات کر رہا تھا؟ وہ دونوں خالہ بھانجی قطعی انجان تھیں۔ "بکواس بند کرو اپنی میں نے تم سے کہا تھا کہ تین دن کے بعد تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔ سو میں نے اپنی بات پوری کی۔ قانونی کارروائی البتہ اب امریکہ میں ہی جا کر ہو گی۔"

"کون سا حصہ؟" تموز بنا کسی لحاظ کے دھاڑا تو ساکت کھڑی مہر نے بے اختیار انجم بیگم کا بازو تھام لیا۔ جن کی اپنی رنگت اڑ گئی تھی۔

"ہر چیز کا آدھا ہے یہ!" اس نے فائل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "باقی کا آدھا کس اولاد کو بانٹ آئے ہیں آپ؟" وہ انتہائی گستاخانہ انداز میں بولا تو مہر کا ہاتھ لپٹے — نیم وا لبوں پر آن ٹھہرا۔ یہ تموز ابراہیم کا کون سا روپ تھا؟

"اپنی بیٹی کو دیا ہے میں نے باقی کا حصہ' تاکہ وہ تم سے ذلیل آدمی کے ساتھ گزارا کر سکے!" ابراہیم صاحب اس سے بھی بلند آواز میں دھاڑے تو لاؤنج میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ ساکت کھڑی انجم اور مہر کو بھی معاملے کی تھوڑی بہت سمجھ میں آچکی تھی۔ سو یوں اچانک اپنا حوالہ' وہ بھی جائیداد کے معاملے میں مہر کا چہرہ فق کر گیا تھا۔

"مہر۔ اس مہر احمد کے نام کر دی ہے آپ نے اپنی آدھی جائیداد؟" سیم شاکڈ سا بڑبڑایا تھا۔

"وہ مہر احمد نہیں۔ مہر تموز ہے اب۔" ابراہیم صاحب نے سخت لہجے میں تصحیح کی تھی۔

"مہر تموز۔ مائی فٹ!" اور انجم اپنے لاڈلے کے چہرے پہ چھائی نفرت دیکھ کے حیران پریشان کھڑی رہ گئی تھیں۔ اگر حقیقت یہ تھی تو گزشتہ تین دن سے کیا ہو رہا تھا؟ جبکہ مہر کی اپنا بھرم ٹوٹ جانے پر "کاٹو تو بدن میں لہو نہیں" والی کیفیت ہو گئی تھی۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ کہ اسے میرے مقابل کھڑا کر کے آپ نے اس کا مستقبل محفوظ کر لیا ہے؟" وہ زہر خند سا ایک قدم آگے آیا تھا۔ "یہ آپ کی بھول ہے مسٹر ملک۔ آپ نے میرا حق اس لاوارث لڑکی کی جھولی میں ڈال کے اس کے مستقبل کا نقشہ بگاڑ دیا ہے۔"

"کیا کرو گے ہاں؟ بولو کیا کرو گے تم؟" ابراہیم ملک نے طیش میں آ کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ اس ہولناک منظر نے مہر کی چیخ نکال دی تھی۔ جبکہ انجم دیوانہ وار ان دونوں کی جانب لپکی تھیں۔

"خدا کا واسطہ ہے ابراہیم! یہ نہ کریں۔ یہ نہ کریں ابراہیم!" انہوں نے بیٹے کا گریبان باپ کے ہاتھ سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

"تھوک کر جاؤں گا اس پہ اور کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گا!" وہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے' بنا کسی خوف کے بولا تو جہاں مہر کا وجود اس درجہ نفرت کا احساس پا کے نیلا پڑ گیا تھا' وہیں ابراہیم ملک کا ہاتھ اپنی پانچوں انگلیوں کا نشان اس کے چہرے پر ثبت کر گیا تھا۔

"نکلو ابھی نکلو میرے گھر سے خبیث آدمی!" سیم کو دھکیلتے ہوئے ابراہیم صاحب پہ جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ انہیں روکنے کی کوشش میں انجم بھبھک کے رو پڑی تھیں۔ "اور طلاق دے کر جاؤ اسے۔ ابھی اسی وقت طلاق دو!" ان کی دھاڑ نے مہر کی ٹانگوں میں سے جان نکال لی تھی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند دو زانو زمین پہ آ گری تھی۔

"طلاق نو وے۔" سیم زہریلی مسکراہٹ لیے پھنکارا تھا۔ "آپ کی اس لاڈلی کو میں کسی صورت طلاق نہیں دوں گا۔ اسے میں تب تک اپنے نام کے ساتھ باندھ کے گھسیٹوں گا۔ جب تک کہ اس کی ہڈیاں گل نہیں جاتیں۔" وہ سفاکی کی انتہا پہ تھا۔

"خدا کا خوف کرو تموز۔ اس کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔" انجم روتے ہوئے حلق کے بل چلائی تھیں۔

"آپ لوگوں نے کیا تھا خدا کا خوف، جو میں کروں وہ پلٹ کر ماں پہ گرجا تھا۔" یہ آپ کی سگی ہے۔ رہیں اب اس کے ساتھ۔ میری شکل اب آپ لوگ کبھی نہیں دیکھیں گے۔" قطعیت سے کہتا وہ صوفے کی طرف بڑھا تھا۔ فائل اٹھا کر، وہ زمین پہ گری پھوٹ پھوٹ کے روتی ہوئی مہر پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا اور اگلے پندرہ منٹ میں وہ اپنا سامان اٹھائے باہر نکل آیا تھا۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ ہے تموز! یہ ظلم مت کرو بیٹا! اس معصوم کو اتنی بڑی سزا نہ دو۔" انجم بلکتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔ مگر اس نے تو جیسے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ وہ اپنی ماں کی ہر فریاد، ہر پکار ان سنی کیے تیز قدموں سے دروازہ عبور کر گیا تھا۔ اور پیچھے سسکتی ہوئی انجم دونوں ہاتھوں میں سر تھامے زمین پہ گرتی چلی گئی تھیں۔

★★★

تموز کا جانا ابراہیم ملک کے خاندان کو بے موت مار گیا تھا۔

مہر اور انجم نے کتنے ہی واسطے دے کر ابراہیم صاحب کو ساری حقیقت "قاضی ولا" کے مکینوں پہ کھولنے سے روکا تھا۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود ان دونوں کو تموز کی واپسی کا یقین تھا۔

مہر نے زیب تک کو خود پہ گزرنے والی قیامت کی ہوا نہ لگنے دی تھی۔ سب کو تموز کی اچانک واپسی کی وجہ یونیورسٹی سے ضروری کال بتائی گئی تھی۔ اس واقعے کے محض ایک ہفتے بعد ہی ابراہیم صاحب بھی امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ مگر تب تک سیم اپنے ہاتھ لگنے والے آدھے حصے کے لیے قانونی کارروائی شروع کروا چکا تھا۔

اس آڑے وقت میں ابراہیم ملک کے دوست اور پارٹنر، طاہر، نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ بذات خود تموز کو سمجھانے اس کے پاس گئے تھے۔ مگر اس نے ان کی بھی ایک نہ سنی تھی۔ چند دنوں کے اندر اندر وہ اپنا حصہ لے کر سوزی کے پاس نیو ہیون چلا گیا تھا۔ جو تموز کو اس کے وعدے کے مطابق اپنے پاس پا کے اس کی محبت پر ایمان لے آئی تھی۔

اگلے ایک ماہ میں ابراہیم ملک اپنی باقی ماندہ محنت سمیت کے پاکستان چلے آئے تھے۔ ان کی واپسی کے فیصلے کو حالات سے بے خبر "قاضی ولا" کے مکینوں نے بے حد سراہا تھا۔ ان سب کی بے خبری ابراہیم صاحب کو مزید پریشان کر گئی تھی۔ وہ بیوی اور بھو کی اس نادانی بھری روش سے شدید نالاں تھے۔ ان کے نزدیک ان دونوں کا انتظار قطعی لا حاصل تھا۔ لیکن وہ دونوں اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھیں۔

دن، ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے تھے۔ ابراہیم صاحب نے پاکستان میں اپنا کاروبار نئے سرے سے شروع کیا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنا گھر بھی خرید لیا تھا۔ اس دوران تموز کی طرف سے مسلسل خاموشی نے زیب کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کے استفسار، پہ ابراہیم صاحب نے مہر کی ایک نہ چلنے دی تھی اور ساری سچائی زیب کے گوش گزار کر دی تھی۔ حقیقت سن کر زیب تڑپ اٹھی تھیں۔ ان کی بچی پر اتنا کچھ گزر گیا تھا اور انہیں پتا بھی نہ چلا تھا! مہر نے "قاضی ولا" میں اپنی واپسی کے لیے ماں کو صاف منع کر دیا تھا۔ وہ تموز کی بیوی ہو کر اس کا گھر چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مما جان اور بابا نے اس کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے سے منہ موڑ لیا تھا۔ سو وہ ان کی خدمت میں اپنی پوری عمر گزارنے کے لیے تیار تھی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تھا۔ ابراہیم صاحب کی زور زبردستی پہ مہر نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جوڑنے کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اس عجیب و غریب

صورت حال نے حنان جیسے زیرک انسان کو بھی چونکا دیا تھا۔ وہ باپ کے ذریعے بالآخر بات کی تہہ تک جا پہنچا تھا۔ یوں مہر احمد کی ناکام ازدواجی زندگی کا بھید سب پہ کھل گیا تھا۔ تموز ابراہیم امریکہ میں کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ کوئی کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر اس نے اپنے کیے کے مطابق مہر احمد کا تماشا بنا کے رکھ دیا تھا۔ اپنا ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد مہر نے ایک کالج میں بطور لیکچرار جاب کرلی تھی۔

اس دوران ابراہیم صاحب نے کتنی ہی بار اسے خلع لے کر نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ خود کو مہر کی اس بربادی کے لیے قصوروار سمجھتے تھے۔ مگر مہر نے اس معاملے میں انہیں صاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔ اس کا دل تموز کی نفرت کا دکھ جھیل کر اب کسی سے بھی محبت کرنے کے لائق نہ رہا تھا۔ ادھر حنان، مہر کو ایک بار پھر تنہا پا کے میدان میں اتر آیا تھا۔ مگر چونکہ اس بار مہر کے ساتھ زیب اور انجم بھی تھیں۔ اس لیے یہ سب اب حنان کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔ بالآخر اپنا مقصد پانے کے لیے اس نے جائشہ کی منگنی کے بعد معاملے کو کچھ اس طور سے ہوا دی تھی کہ مہر کی زندگی کا فیصلہ خود بہ خود حنان کی مرضی کے مطابق ہونے چلا تھا۔ ساتھ ہی اس نے وقت ضائع کیے بغیر صغیر صاحب کے سامنے مہر کے لیے اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

مگر مہر احمد کی سنگین بے ہوشی نے اس کی اور تموز ابراہیم کی علیحدگی کے معاملے کو ایک بار پھر کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ اور حنان سوائے سر پٹخنے کے اور کچھ نہ کر سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی سر! آپ کو ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔" نرس کے پکارنے پہ راہداری میں بیٹھے ابراہیم صاحب اپنے اندر کھلے سود و زیاں کے ڈھیروں کھاتوں کو سمیٹتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مہر کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اس کی حالت کی طرف سے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اسے گھر لے جانے کی اجازت دی تھی۔

اس کی چھٹی کا سن کے صغیر صاحب بھی جاشی اور نوریہ کے ہمراہ اسپتال پہنچ گئے تھے۔ حنان البتہ جھنجلاہٹ کے باعث دوبارہ اسپتال نہیں آیا تھا۔ اسے اس بنے بنائے کھیل کے بگڑ جانے پر شدید غصہ تھا۔ وہ سب مہر کو لے کر ابراہیم صاحب کی طرف چلے آئے تھے۔

"صاحب جی! آپ سے ملنے کے لیے کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں۔" دل شیر کی اطلاع پر ابراہیم ملک نے کلائی پہ بندھی گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

"اس وقت؟"

"نہیں جی۔ وہ تو کافی دیر کے آئے ہوئے ہیں۔" اس کی بات پہ انہوں نے ایک تھکی ہوئی سانس لی تھی۔

"کیا نام ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ عجیب مشکل سا نام ہے۔" دل شیر کے جواب پہ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

مہر کو چاروں خواتین احتیاط سے پکڑے آگے بڑھ رہی تھیں لیکن اچانک چلتے چلتے اس کا دل اس تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا کہ اس کے لیے اگلا قدم اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔

"ہمت کرو میری جان۔" انجم بیگم کی نرم آواز پہ مہر نے اپنا لب کاٹتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔ یہ کیسی بے چینی اس کی رگ و جاں میں سمائی جا رہی تھی؟ یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ پریشانی سے سوچتے ہوئے اس نے اک گہری سانس لی تھی۔ اور پھر ڈوبتے ابھرتے دل کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

"ٹھہرو، میں دروازہ کھولتی ہوں۔" زیب بیگم نے سرعت سے آگے بڑھتے ہوئے داخلی دروازہ وا کر دیا تھا۔ جس کے کھلتے ہی وہ سب گویا پتھر کے ہو گئے تھے۔

حیرت کا پہاڑ ٹوٹنا کسے کہتے ہیں۔ یہ ان سب کے چہروں پہ لکھا تھا جو بت بنے، ایک پل کو پلکیں جھپکنا

بھول گئے تھے۔ جبکہ مہر کا ڈوبتا ابھرتا دل یک لخت ساکت ہو گیا تھا۔ اس کے روم روم میں سما جانے والی بے چینی کا تعلق تموز ابراہیم سے تھا' اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ان سب کی نگاہیں بیک وقت اس ایک شخص پہ جمی تھیں۔ اور تموز کی بے قرار نظروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس چہرے کو اپنی پیاس مٹانے کا ذریعہ بنائے۔ آیا اس ماں کے چہرے کو جو آخری لمحے تک اس کے پیچھے لپکی تھی۔ یا اس باپ کی صورت کو جس کی عزت کو اس نے اپنوں اور غیروں کے درمیان روند کے رکھ دیا تھا۔ یا پھر اس لڑکی کی' جسے تین دن کی سہاگن بنا کے اس نے تین سال کے لیے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ اور وہ نجانے کس مٹی کی بنی تھی کہ اب تک اس جیسے شخص کا نام اپنے نام کے ساتھ لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک پل کو بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے تو دور انسانیت تک سے نہ دیا تھا۔ جس نے اپنی ہی بیوی کی عزت کو کسی لٹیرے کی طرح پامال کیا تھا۔ اور وہ بدلے میں اس کی عزت کو سنبھالے تاحال اس کے گھر میں بیٹھی تھی۔

کیا قصور تھا ان تین انسانوں کا؟ یہ کہ وہ اس جیسے خود غرض کی محبت میں مشترکہ طور پر گرفتار تھے۔ اور بس! اور جواباً "اس نے انہیں کیا دیا تھا؟ اس نے ان تینوں کو جوتے کی نوک پہ رکھا تھا۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی ماں کی پکار ہوا میں اڑا گیا تھا کہ خدا کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔ مگر جب لورین کے جوتے کی نوک نے اس کی پسلیوں میں ضرب لگائی تھی۔ تب اسے درد نہیں بلکہ اس ضرب سے جڑی ذلت کا احساس ہوا تھا۔ اس خدائی پکڑ کا احساس ہوا تھا' جو بنا کسی پیشگی اطلاع کے اس پہ مسلط کر دی گئی تھی۔

مائیکل سے ہونے والی ملاقات نے اس پر اس کی سب سے بڑی غلطی آشکار کر دی تھی۔ اسے سمجھا دیا تھا کہ اپنے پیاروں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں اس نے منہ کی کھائی تھی۔ تب وہ خوفزدہ ہو کے دیوانہ وار بازار کی جانب دوڑا تھا۔ لیپ ٹاپ خرید کے لایا تھا کہ کہیں تو کسی طور وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے نتیجے کو غلط ثابت کر سکے۔ خود کو یہ باور کروا سکے کہ اس نے اپنے ماں باپ اور مہر احمد کو چھوڑ کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے خود پہ کھلنے والے کسی مدد کے دروازے کو اپنے ہاتھوں سے بند نہیں کیا تھا۔

گھر پہنچ کے اس نے لیپ ٹاپ پر اپنا فیس بک اکاؤنٹ سائن ان کیا تھا۔ اور مہر احمد نامی ہر لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ مگر کوئی بھی چہرہ نہیں تھا۔ پھر ڈوبتے دل کے ساتھ اس نے زندگی میں پہلی بار مہر کے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑا تھا۔

"مہر تموز۔" لکھ کر اینٹر کرتے ہوئے اس کے دل نے شدت سے دعا کی تھی کہ ایسا کوئی رزلٹ سامنے نہ آئے۔ وہ اسے اگر تین دن کے اندر اندر چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ تو مہر احمد کی محبت کو ہوا ہونے میں زیادہ سے زیادہ تین ہفتے لگے ہوں گے تاکہ اسے اس بات کا تو سکون مل سکے کہ خواب میں دیکھے جانا والا درکم از کم مہر احمد کا در نہ تھا۔

مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے جیت کی نوید نہیں ملی تھی۔ مہر تموز کے نام سے چند ایک ہی اکاؤنٹ سامنے آئے تھے۔ اور ان میں سب سے اوپر اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ تحیر کے عالم میں وہ کتنی ہی دیر ساکت نظروں سے اپنے سامنے موجود چہرے اور اس کے ساتھ لکھے نام کو دیکھتا رہا تھا۔ اور کتنی ہی دیر بعد اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس نام کو کلک کر دیا تھا۔

اگلے ہی لمحے اسکرین مہر کی چھوٹی سی تصویر کے ساتھ ساتھ انجم بیگم' ابراہیم صاحب' زیب اور صغیر قاضی کی گروپ فوٹو سے بھی روشن ہو گئی تھی۔ ان چاروں کی یہ تصویر اس نے CoverPhoto کے طور پہ سیٹ کر رکھی تھی۔ مارے اذیت کے تموز نے بے اختیار اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔

"تھوک کر جاؤں گا اس پہ۔ اور کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گا!" اس کی اپنی ہی آواز بازگشت بن کر اس کا غرور پاش پاش کر گئی تھی۔ ایک معمولی انسان ہو

کہ اس نے اتنا بڑا بول کیسے بولا تھا؟ اپنی جرات پہ وہ سچ میں دنگ تھا۔ اس نے اس سختی سے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبایا تھا کہ خون چھلکنے کو بے تاب ہو گیا تھا۔

"اسے میں تب تک اپنے نام کے ساتھ باندھ کے گھسیٹوں گا۔ جب تک کہ اس کی ہڈیاں گل نہیں جاتیں۔" سنسناتا ہوا ایک اور چابک اس کے وجود پہ پڑا تھا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا تھا۔

اس نے اسی وقت اپنی غلطی سدھارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مارک نے بھی اس کے فیصلے کو سراہا تھا۔ اگلے دن وہ ابراہیم صاحب کے دوست، طاہر چوہدری کے پاس چلا آیا تھا۔ ان سے مل کے اسے باپ کے کاروبار کی پاکستان منتقلی سے لے کر وہاں ان کے نئے گھر کے پتے تک ہر بات پتا چل گئی تھی۔ وہ ساری معلومات لیے اپنے دفتر آیا تھا۔ جہاں اس نے اپنے چند اہم ترین کام نبٹائے تھے۔ اور آنے والے چند ہی دنوں میں وہ مارک اور جوزی کی ڈھیروں نیک تمنائیں سمیٹے پاکستان کے لیے فلائی کر گیا تھا۔

اس دوران اس کے قدم کہیں نہ ڈگمگائے تھے۔

اس کا حوصلہ کہیں نہ ٹوٹا تھا۔ وہ سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر اس پل ان سب کو اپنے روبرو پا کے اس کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

"تم؟؟" ابراہیم ملک ہوش میں میں آنے والے سب سے پہلے فرد تھے۔ وہ چیل کی طرح اڑ کے تموز پر جھپٹے تھے اشتعال نے ان کا چہرہ انگارے کی طرح دہکا دیا تھا۔ بے اختیار صغیر قاضی انہیں پکڑنے ان کے پیچھے لپکے تھے۔

"بھائی جان۔! سنبھالیں خود کو۔" انہوں نے بامشکل تمام ابراہیم صاحب کو تموز پر ہاتھ اٹھانے سے روکا تھا۔ جو باپ کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے سر جھکا گیا تھا۔ مگر خود کو ان کے پہنچ سے دور رکھنے کے لیے ایک انچ نہ پیچھے ہٹا تھا۔

"چھوڑو مجھے صغیر۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی ہمیں اپنی منحوس صورت دکھانے کی!" ابراہیم صاحب کف اڑاتے، خود کو چھڑانے کی کوشش میں دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ جبکہ انجم، بے یقینی سے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھے، بیٹے کو سامنے پا کے بے اختیار رو پڑی تھیں۔ کچھ یہی کیفیت زیب کی بھی تھی۔ وہ حق دق کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔ مگر مہر کے بکھرے ہوئے اعصاب کے لیے اس بار کو برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ بے اختیار لڑکھڑائی تھی اور قریبی صوفے پہ ڈھے سی گئی تھی۔

"حوصلے سے کام لیں بھائی جان۔" صغیر صاحب انہیں روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ آوازیں سن کر ملازمین بھی داخلی دروازے کے باہر اکٹھے ہو گئے تھے۔

"نہیں ہے میرا حوصلہ۔ کھا لیا ہے اس نے مجھے۔ ختم کر دیا ہے اس نے میرا سب کچھ!" جذبات کی شدت کے باعث ان کی آواز پھٹ گئی تھی۔ ان کی تڑپ اور اپنی خطاؤں نے تموز کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیے تھے۔

"بابا! پلیز مجھے معاف کر دیں۔" وہ ہاتھ جوڑے آگے آیا تھا۔

"مت دو مجھے یہ "بابا" نام کی گالی۔" اس کا انہیں "بابا" پکارنا ابراہیم ملک پہ غضب ڈھا گیا تھا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا تھا۔ اور آن واحد میں تموز کو اس کے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔

"مسٹر ملک ہوں میں۔ سنا تم نے مسٹر ملک ہوں میں!" پے در پے انہوں نے تین چار تھپڑ تموز کے منہ پر مارے تھے۔ ان کی انگوٹھی کی ضرب نے اس کا ہونٹ پھاڑ دیا تھا۔ اس کے چہرے پہ خون ابلتا دیکھ کے سب خواتین کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ انجم تو چکرا کے بہن کے کندھے پہ آ رہی تھیں۔ جبکہ مہر نے مارے کرب کے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔ اس کے چہرے پہ آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے۔ اس دشمن

جاں کا یہ حال دیکھنا بھی اس کے لیے کہاں ممکن تھا۔ اس کی جان تو دہری اذیت میں آ پھنسی تھی۔

"تم ہمارے لیے مر گئے ہو!" اسے کالر سے گھسیٹتے ابراہیم ملک باہر کی طرف بڑھے تھے۔

"خدا کا واسطہ ہے چھوڑ دیں بھائی جان۔" نویرہ اور جائشہ نے تیزی سے انجم بیگم کو سنبھالا تھا اور زیب تڑپ کر بھنوئی کی طرف بھاگی تھیں۔

"بھائی جان! یوں نہ کریں۔" صغیر قاضی نے بھی ان کی راہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ابراہیم صاحب پر تو جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے داخلی دروازے تک لائے تھے۔ اور پوری طاقت سے اسے باہر دھکا دے دیا تھا۔ وہ ملازمین کے سامنے منہ کے بل فرش پہ جا گرا تھا۔

دھاڑیں مار مار کر روتی زیب دیوانہ وار تموز کی جانب بڑھی تھیں۔ مگر ابراہیم صاحب کی دھاڑ ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

"کسی نے بھی اگر اسے ہاتھ لگایا تو وہ میرے لیے مر گیا!" ان کی اس تنبیہہ کے بعد ہر کوئی اپنی جگہ پر جامد ہو گیا تھا۔

تموز اپنے منہ اور ناک سے بہتے خون کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتا اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کا موبائل جیب سے نکل کے زمین پر گر گیا تھا۔ مگر اسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے اپنا بے وزن وجود لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں۔ مجھے معاف کر دیں بابا!" اس کی سسکیاں اذیت سے پر تھیں۔

"دل شیر، ریاض اسے لے جا کر گھر سے باہر پھینک دو۔ اور دوبارہ اس شخص کے لیے دروازہ مت کھولنا!" اس کی ہر التجا نظر انداز کیے۔ وہ کڑے لہجے میں ملازمین سے مخاطب ہوئے تھے۔ جو گھبرا کے سر ہلاتے آگے بڑھے تھے اور تموز کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر زبردستی کی طرف کھینچنے لگے تھے۔

"کہیں نہیں جاؤں گا میں۔ چاہے مجھے باہر پھنکوا دیں۔ میں اس در سے کہیں نہیں جاؤں گا۔!" ملازمین کے ساتھ گھسٹتے ہوئے اس کی آہ و فغاں بلند ہوئی تھی۔

مہر نے بے اختیار اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے تھے۔ اس کے آنسو اس کی تڑپ زیب کی برداشت سے بھی باہر ہو گئی تھی۔ وہ دوپٹے میں منہ دیے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھیں۔ مگر ابراہیم ملک اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے تھے۔ وہ تب تک دروازے میں کھڑے رہے تھے، جب تک ملازموں نے تموز کو باہر دھکیل کے گیٹ بند نہ کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کے دس بجنے کو تھے۔ مگر ہر ایک صدمے کی کیفیت میں تھا۔ تموز کو گھر سے نکال کے ابراہیم صاحب اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔

انجم، غنودگی کی کیفیت میں مہر کے بستر پہ پڑی تھیں۔ لیکن اس حال میں بھی آنسو ان کی بند آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ان کی کنپٹیوں میں جذب ہو رہے تھے۔ اور مہر متورم چہرے کے ساتھ خاموش بیٹھی تھی۔ زیب، صغیر صاحب، جاشی، نویرہ سب ہی اس کے پاس موجود تھے۔ مگر اس ہجوم میں بھی وہ بالکل اکیلی تھی۔ تنہا اور بے کراں۔

کتنے ہی منظر، کتنی ہی باتیں ذہن کے پردے پر ابھر اور مٹ رہی تھیں۔ کیا کچھ نہ سہا تھا اس نے۔ کیا کچھ نہ سنا تھا اس نے۔ اپنے شوہر کی بدکرداری۔ اس کی نفرت۔ اس کے ہاتھوں اپنے وجود کی تذلیل، اپنی ذات کی تذلیل۔ اور یہ سب اس نے تنہا برداشت کیا تھا۔ حتیٰ کہ آج تک اس نے اپنے یہ زخم اپنی ماں کو بھی نہیں دکھائے تھے۔ اس نے اپنے ساس سسر سے بھی تموز کی بدکرداری کا کبھی گلہ نہ کیا تھا۔ مگر آج جب وہ لوٹ آیا تھا تو دل نیم جاں پر لگا ہر زخم لو دینے لگا تھا۔

کیوں؟ کس لیے؟

اس کی حدیں کو چھوتی نفرت بھلا یوں اچانک کہاں غائب ہو گئی تھی۔؟ یا پھر یہ تموز ابراہیم کا کوئی نیا سوانگ تھا۔ دولت کے لیے۔ یا اپنی کسی اور غرض کے

لیے۔ وہ کیا کہہ سکتی تھی بھلا؟ اس نے تو ہمیشہ کی طرح مہر کو کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔

"آپ کو پتا ہے بھائی! تموز بھائی واپس آگئے ہیں۔" جاشی حنان کو مطلع کرنے کی غرض سے اپنا فون لیے لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ اور لائن کے دوسری طرف ڈرائیو کرتے حنان پہ پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

"کیا؟" گاڑی کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ اس نے سرعت سے اپنے ذہن کو حاضر رکھتے ہوئے گاڑی کو سنبھالا تھا۔

"مگر کب؟ کیسے؟" اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں ونڈ اسکرین پہ مرکوز تھیں۔

جواب میں جاشی نے سارا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بھائی کے گوش گزار کردیا تھا۔ جس نے پریشانی کے عالم میں بے اختیار اپنا سر تھام لیا تھا۔

"یہ کیا ہوگیا حنان قاضی؟" اس نے اضطراب کی کیفیت میں خود سے سوال کیا تھا۔

"اب کہاں ہے وہ؟" بامشکل تمام خود کو ٹریفک کے دھارے سے الگ کرتے ہوئے اس نے گاڑی ایک طرف روکی تھی۔

"باہر ہی بیٹھے ہیں۔" اور حنان نے ناقابل یقین انداز میں اک گہری سانس لیتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

"آپ آئیں گے یہاں؟" جاشی کے سوال پہ وہ بھنّا اٹھا تھا۔

"میرا کیا کام ہے وہاں۔ جو مرضی کریں یہ لوگ۔" اس کے تلخ لہجے پہ جاشی نے مزید کچھ کہے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

حنان نے ہاتھ میں پکڑا فون ایک طرف پٹختے ہوئے بے اختیار اسٹیرنگ پر ہاتھ دے مارا تھا۔ "او گاڈ!!" با آواز بلند اپنا غصہ نکالتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال جکڑ لیے تھے۔ یہ کیا ہوگیا تھا؟ یہ تموز ابراہیم کیسے لوٹ آیا تھا؟ وحشت سے سوچتے ہوئے اس نے بے چینی سے اپنی پیشانی مسلی تھی۔

"کیا کروں؟ کیا کروں؟" اضطراب کے عالم میں بند مٹھی لبوں پہ جمائے اس نے جلد از جلد تموز ابراہیم سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ سوچنا چاہا تھا۔ اور تب ہی بالکل اچانک ایک بہت عجیب حل اسے سوجھ گیا تھا۔

"ہاں! زبردست۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔" خود کلامی کرتے ہوئے اس نے دوسری سیٹ پہ پڑا فون جلدی سے اٹھایا تھا۔ اس کے پاس وقت بے حد کم تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی انگلیاں اپنے خاص دوست کا نمبر ملانے لگی تھیں۔ جو کہ ایک بااثر سیاسی شخصیت تھا۔

"ہیلو۔ ہیلو فیض!" دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی وہ بے چینی سے بولا تھا۔

"ہاں حنان! کیسے یاد کیا؟" اس کی بھاری آواز خوشگوار تھی۔

"مجھے تیری مدد کی اشد ضرورت ہے فیض!" وہ سیدھا مدعا پہ آیا تھا۔

"ہاں بول۔"

"ایک بندے کو اٹھوانا ہے۔ ابھی اسی وقت!" اس کی بات پہ ایک لمحے کو دوسری طرف خاموشی چھاگئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ہوجائے گا۔" اور حنان کا پریشانی میں ڈوبا چہرہ بے اختیار کھل اٹھا تھا۔ "کون ہے وہ؟" اس کے استفسار پہ حنان اسے تموز ابراہیم کے بارے میں آگاہ کرنے لگا تھا۔ ساری بات سن کے فیض نے ہنکارا بھرا تھا۔

"ہوں۔ تو ایسا کر ان کے گھر کے باہر پہنچ کر بندے کی صحیح پوزیشن سے مجھے آگاہ کر۔ میں یہاں سے بندے روانہ کرتا ہوں۔"

"ٹھیک۔ بہت بہت شکریہ فیض! اس کام کے بدلے میں تو جان بھی مانگے گا ناں۔ تو دے دوں گا۔" حنان کی بات پر فیض بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

"وہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو وہاں پہنچ۔" اور

حنان نے فون بند کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی۔

"میں اس بار تمہیں کسی قیمت پر نہیں جیتنے دوں گا شمروز ابراہیم!" نفرت اور رقابت کی آگ نے اسے سچ میں بالکل اندھا کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کا ایک بج رہا تھا۔ جب صغیر قاضی گھر جانے کے ارادے سے تنہا پورچ میں آئے تھے۔ انہیں باہر آتا دیکھ کے دل شیر تیزی سے ان کی جانب لپکا تھا۔

"صاحب جی! یہ فون شاید اس لڑکے کا ہے۔ یہاں گملے کے پیچھے گرا پتا نہیں کب سے بج رہا تھا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل صغیر صاحب کی طرف بڑھایا تو ان کی نظریں فون پہ آٹھہریں۔ جس کی اسکرین چیخ چکی تھی۔

"جا کر اسے دے آؤ۔"

"گیا تھا۔ مگر وہ اب باہر نہیں ہے۔" دل شیر کی بات پہ انہوں نے فون پکڑ لیا تھا۔ تب ہی اچانک وہ پھر سے بجنے لگا تھا۔ اسکرین پہ کسی مارک کا نام دیکھ کر انہوں نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد کال ریسیو کرلی تھی۔

"ہیلو۔ ہیلو سیم!" کب سے کال کرتے مارک نے بے چینی سے اسے پکارا تھا۔

"سوری۔ وہ یہاں نہیں ہے۔" صغیر صاحب نے انگلش میں جواب دیا تھا۔ ان کی بات پہ مارک بے اختیار تھم گیا تھا۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"میں۔" صغیر صاحب ایک پل کو رکے تھے۔

"میں اس کا انکل بات کررہا ہوں۔" ان کے تعارف نے مارک پہ شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری کردی تھی۔

"او گاڈ! تو کیا آپ لوگوں نے اسے معاف کردیا۔ آپ لوگوں کی صلح ہوگئی انکل؟" اور صغیر صاحب اس کی بات پہ ساکت ہوگئے تھے۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"میں اس کا بیسٹ فرینڈ اور پارٹنر مارک بول رہا ہوں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ آپ لوگوں کی صلح۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوا مسٹر مارک! اس کے والد نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ دھیرے سے بولے تو مارک کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا!" اور پھر چند لمحوں کے لیے لائن پہ خاموشی چھا گئی۔

"پلیز انکل۔ میری آپ سے ریکویسٹ ہے۔ اس کے والد کو سمجھائیں کہ اس کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں۔ وہ بہت کڑے اور بُرے حالات سے لوٹ کر آپ لوگوں تک آیا ہے۔" چند لمحوں کے بعد مارک کی بوجھل آواز صغیر صاحب کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ بری طرح چونک گئے۔

"کیا مطلب؟ آپ مجھے کھل کر بتائیں گے مسٹر مارک!" ان کی بات پہ مارک نے اک گہری سانس لی تھی۔ اور پھر دھیرے دھیرے وہ ساری بات صغیر قاضی کو بتاتا چلا گیا تھا۔

☼

شمروز کی جس وقت آنکھ کھلی' ارد گرد گھپ اندھیرا تھا۔ اتنا اندھیرا کہ ایک پل کے لیے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا۔ کہ آیا وہ اٹھ چکا ہے یا اب بھی سو رہا ہے۔ اس اندھیرے نے اسے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ اس نے بے چینی سے اپنے وجود کو جنبش دینا چاہی تھی۔ مگر اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اس کی گھبراہٹ یک لخت دو چند ہوگئی تھی۔ اس نے بے اختیار ہی کسی کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ اور تب ایک جھماکے کے ساتھ اس کے ذہن میں وہ منظر تازہ ہوگیا تھا۔ جب گھر کے باہر بیٹھے ہوئے اس کے عین سامنے ایک گاڑی آکر رکی تھی۔ اور اچانک اس میں سے چند آدمی نکل کر اس کے سر پہ

آکھڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا ان میں سے کسی نے ایک کپڑا اس کی ناک اور منہ پہ جما دیا تھا۔ جس کے بعد اسے کچھ یاد نہ رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے، مجھے اغوا کرلیا گیا ہے او نو۔"

ڈوبتے دل کے ساتھ اس نے متوحش نظروں سے اپنے اردگرد چھائے اندھیرے کو دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے اس کی مدد کے لیے چیخ و پکار عروج پہ پہنچ گئی تھی۔ ایسے میں اچانک کسی انجانی سمت سے کنڈی کی آواز اسے بے اختیار خاموش کروا گئی تھی۔ وہ دم سادھے آنے والی آہٹ پہ کان جما گیا تھا۔ تب ہی اس کے داہنی طرف سے دروازہ کھلا تھا اور سوئچ کی آواز کے ساتھ ہی کمرہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ روشنی کی چبھن نے ثمروز کو آنکھیں بند کرنے پہ مجبور کردیا تھا۔

"تشریف لائیں سرکار۔" قدموں کی دھمک کے درمیان اسے فرش پہ کرسی گھسیٹنے کی آواز آئی تھی۔ ثمروز نے زبردستی اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے عین سامنے رکھی گئی کرسی پر ایک شخص بڑے کروفر سے ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی کرسی کے اردگرد تین اسلحہ بردار آدمی کھڑے تھے۔ وہ چاروں افراد ثمروز کے لیے بالکل انجان تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس کی خوف زدہ آنکھیں کرسی پہ بیٹھے فیض کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔ جس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"ہم تمہاری بیوی کے باراتی ہیں ثمروز ابراہیم!" اور ثمروز کو زندگی میں پہلی بار مہر کا حوالہ کسی دوسرے مرد کے منہ سے سن کر، شدید ناگوار گزرا تھا۔

"کیا بک رہے ہو۔" اس کی آنکھوں میں موجود خوف یکایک غصے میں ڈھل گیا تھا۔

"بک نہیں رہا، صحیح کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ تم ابھی اسی وقت اسے طلاق دینے والے ہو۔ یہی تمہاری رہائی کی قیمت ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے فیض نے مونچھوں کو تاؤ دیا تھا اور ثمروز اپنی جگہ پہ ساکت ہوگیا تھا۔

"کس نے رکھی ہے یہ قیمت؟ میرے۔ میرے بابا نے؟" اس کی آواز شدید بے یقینی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ثمروز کی بات فیض کو چونکا گئی تھی۔

"تو کیا تمہارا باپ بھی تمہاری بیوی کی تم سے گلو خلاصی چاہتا ہے؟" وہ محظوظ سا بولا تو ثمروز کے سینے میں اٹکی سانس بحال ہوگئی۔ وگرنہ ابراہیم ملک کی اس درجہ نفرت کا سوچ کر تو اس کا ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔

"ارے یار، اتنے برے شوہر ہو تو جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے اس بے چاری کی؟" فیض کا مسکرا کر کسا گیا جملہ ثمروز کے تن بدن میں آگ لگا گیا تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ اور کان کھول کر سن لو، میں کسی بھی قیمت پر اپنی بیوی کو طلاق نہیں دوں گا۔"

"چاہے جان سے ہاتھ دھونے پڑیں؟" فیض کے چہرے پہ یک لخت سرد مہری پھیل گئی تھی۔

"بالکل!" ثمروز نے قطعیت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں چند ثانیے کے لیے ایک دوسرے سے بندھی رہی تھیں۔ اور پھر فیض نے رخ اپنے بندوں کی جانب موڑ لیا تھا۔

"چلو پھر تو اضح کرو صاحب کی۔" اس کے حکم پہ دو بندے ثمروز کی طرف بڑھے تھے۔ اور اگلے ہی لمحے اس کا وجود ان دونوں آدمیوں کے رحم و کرم پہ آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مارک سے ثمروز پہ گزرنے والے حالات کی پوری روداد سن کے صغیر صاحب شل ہوگئے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر ماؤف ذہن کے ساتھ باہر ٹہلتے رہے تھے۔ اور پھر ایک نتیجے پہ پہنچ کے تیز قدموں سے اندر چلے آئے تھے۔ ان کا رخ سیدھا ابراہیم صاحب کے کمرے کی طرف تھا۔ کتنی ہی منتوں کے بعد وہ ابراہیم ملک کو ان کے کمرے سے نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

انہیں اپنے ساتھ لیے وہ مہر کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ جہاں ساری خواتین موجود تھیں۔ سب کی حیرت بھری نظروں کے جواب میں انہوں نے

صرف تموز کے موبائل کے ملنے اور اس کے دوست مارک کی کال کے آنے کا ذکر کیا تھا۔ اور پھر انہوں نے مارک کو کال کر کے اسے تموز کی فیملی کی اپنے ساتھ موجودگی کے بارے میں بتایا تھا۔ مارک کا نام سن کر ابراہیم ملک چونک گئے تھے۔ وہ اسے Yale کے حوالے سے جانتے تھے۔ صغیر صاحب نے اس سے ساری بات نئے سرے سے دہرانے کی درخواست کرتے ہوئے، موبائل کا اسپیکر کھول دیا تھا۔

مارک نے دھیرے دھیرے گزرے تین سالوں کو لفظوں میں ڈھالنا شروع کیا تھا۔ سوزی سے اس کی شادی کا سن کے مہر کی آنکھوں سے آنسو قطروں کی صورت گرنے لگے تھے۔ کچھ یہی کیفیت انجم بیگم کے دل کی بھی تھی۔ انہیں یہاں سولی پہ لٹکا کے اس نے کتنے آرام سے وہاں اپنی من چاہی دنیا بسالی تھی۔ اس وقت جب مہر یہاں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنی ماں تک سے نجانے کون کون سے جھوٹ بولتی پھر رہی تھی۔ تب وہ وہاں خوشیوں کے ہنڈولے میں اپنی محبت کے ہمراہ جھول رہا تھا۔ تموز نے واقعی اپنا کہا نبھایا تھا۔ اس نے دورہ کر بھی اپنی ذات سے مہر کو کوئی خوشی نہیں ملنے دی تھی۔

لیکن جوں جوں مارک کی گفتگو لورین کی طرف پیش رفت کرتی گئی تھی۔ سب سننے والوں کے رنگ بدلتے چلے گئے تھے۔ اس کا تموز کو لوٹنا اور نیم مردہ حالت میں کچرے کے ڈھیر پہ پھینک جانا، سب ہی کی سانس روک گیا تھا۔ یہ احساس کہ وہ رات بھر انتہائی زخمی حالت میں، لاوارثوں کی طرح کوڑے پر پڑا رہا تھا، سب کا دل نچوڑ گیا تھا۔ حتیٰ کہ ابراہیم ملک کا چہرہ بھی مارے ضبط کے سرخ ہو گیا تھا۔ مارک کی اپنی آواز بھی اس وقت کو یاد کر کے بھر آئی تھی۔

اور پھر تموز کا خوف، اس کی تڑپ اور اس کا پچھتاوا سن کر تو وہ سب ہی دنگ رہ گئے تھے۔ کیا اس جیسے سنگ دل اور خود پرست آدمی کی کایا پلٹ بھی ممکن تھی؟ یہ اذیت ناک حادثہ تموز ابراہیم کے لیے سزا تھی یا رحمت، وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بے شک اللہ کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ وہ کب کسی فاسق کے دل کے بدلنے کا سامان پیدا کر دے، کوئی نہیں جانتا۔

"پلیز سر! میری آپ سے درخواست ہے کہ اسے مزید مت آزمائیں۔ وہ اندر سے بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ اس نے اپنے کیے کی سزا بھگت لی ہے۔ اگر آپ لوگوں نے اسے معاف نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ اپنا بیٹا ہمیشہ کے لیے نہ کھو دیں۔" مارک کی بات پہ انجم تڑپ اٹھی تھیں۔

"اللہ نہ کرے۔ خدا نہ کرے!" وہ دوپٹے میں منہ چھپائے زور زور سے رونے لگی تھیں۔ ان کے رونے کی آواز مارک نے بھی سن لی تھی۔ دل گرفتی سے الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا تھا۔

بے اختیار ایک گہری سانس لیتے ہوئے صغیر صاحب نے ایک نظر حاضرین محفل پہ ڈالی تھی۔ اور

اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں ثموز کو لے کر آتا ہوں۔" ان کی بات پر سب نے انہیں دیکھا تھا۔ مگر کیا کچھ نہ تھا۔ اور ان کے اطمینان کو یہ خاموشی بہت تھی۔

وہ تیز قدموں سے چلتے باہر آئے تھے۔ اور گیٹ کھول کر انہوں نے ثموز کی تلاش میں ارد گرد دیکھا تھا۔ مگر اسے کہیں نہ پا کے وہ ایک بار پھر اندر چلے آئے تھے۔ اس کی غیر موجودگی کی اطلاع نے سب کو نئی پریشانی میں گرفتار کر دیا تھا۔

صغیر صاحب نے ایک بار پھر مارک سے رابطہ کیا تھا۔ اور اس سے ہوٹل کا نام پوچھا تھا۔ جہاں ثموز نے قیام کیا تھا۔

ہوٹل کا پتا لے کر صغیر قاضی' دل شیر کو لے کر نکل گئے تھے۔ اس دوران ابراہیم صاحب نجانے کن سوچوں میں ڈوبے بالکل خاموش بیٹھے رہے تھے۔ مہر بھی بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے گم صم سی ہو گئی تھی۔ سب کچھ اتنا اچانک اور اتنا عجب تھا کہ اس کا ذہن یک لخت ایک خالی سلیٹ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اسے آنے والے وقت کے حوالے سے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ادھر رات کے اس پہر صغیر صاحب کو بہت مشکل سے ہوٹل کے اندر جانے کی اجازت ملی تھی۔ مگر ثموز کو وہاں بھی نہ پا کے صغیر صاحب بری طرح پریشان ہو گئے تھے۔ اسی پریشانی میں وہ واپس ملک صاحب کی طرف آئے تھے۔ ثموز کی ہوٹل سے بھی غیر موجودگی کی خبر نے گھر والوں کو متوحش کر دیا تھا۔ انہوں نے ارد گرد کا سارا علاقہ چھان مارا تھا' مگر ثموز کا کہیں پتا نہیں چلا تھا۔ اسی پریشانی میں رات تمام ہوئی تھی اور اگلا دن نکل آیا تھا۔ مگر یہ دن بھی شدید مایوسی کی نذر ہوا تھا۔ ثموز اچانک کہاں چلا گیا تھا' کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ گھر میں کہرام برپا ہو گیا تھا۔ رات تک ابراہیم ملک کا حوصلہ بھی جواب دے گیا تھا۔ اور بالآخر انہوں نے پولیس سے رابطہ کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

حنان ابھی ابھی صغیر قاضی کے ساتھ ابراہیم صاحب کی طرف سے لوٹا تھا۔ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں چلے جانے سے وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے صغیر صاحب کے اپنے کمرے میں جانے کا بے چینی سے انتظار کیا تھا۔ اور جب ان کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی ــــ تب وہ لاؤنج سے اٹھ کر دبے قدموں ٹیرس پہ چلا آیا تھا۔

اب اسے اس کی بد قسمتی کہیں یا کچھ اور کہ صغیر صاحب کپڑے تبدیل کر کے' کچھ دیر لان میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے ارادے سے کمرے سے دوبارہ باہر چلے آئے تھے۔ ان کا رخ نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ لیکن اچانک انہیں ارد گرد چھائی خاموشی میں ٹیرس کا دروازہ کھلنے اور آہستگی سے بند ہونے کی آواز نے اپنی جگہ پہ رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے ٹھٹک کر اوپر جاتے زینے کی طرف دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے چیک کرنے کے ارادے سے تیزی سے اوپر کو بڑھ گئے تھے۔

احتیاط سے چھت کا دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے ٹیرس پہ جھانکا تھا۔ جو اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ آہستگی سے اوپر داخل ہوئے تھے۔ ان کا ہاتھ دروازے کے ساتھ ہی دیوار میں لگے سوئچ کی طرف بڑھا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ لائٹ جلاتے انہیں پانی کی ٹنکی کے دوسری طرف سے حنان کے بولنے کی آواز آئی تھی اور وہ بری طرح چونک گئے تھے۔

حنان اس وقت یہاں اندھیرے میں کیا کر رہا ہے؟ دل میں سوچتے ہوئے وہ اسے دیکھنے کی نیت سے چاند کی روشنی میں ہی آگے بڑھے تھے۔ وہ ٹنکی کے قریب پہنچے تھے کہ دوسری طرف سے حنان کی آواز نے انہیں اپنی جگہ پہ ساکت کر دیا تھا۔

"دیکھ فیض! معاملے میں پولیس انوالو ہو گئی ہے۔ تجھے جلد از جلد اس سے دستخط لینے ہوں گے۔" اور صغیر قاضی کی مارے بے یقینی کے سانس رک گئی تھی۔

"کیا حنان ثموز کے بارے میں بات کر رہا تھا؟"

ڈوبتے دل کے ساتھ انہوں نے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا تھا۔ جبکہ حنان لحظہ بھر کو رک کے دوسری طرف کی بات سننے لگا تھا۔

"کیا کہا۔ اب بھی نہیں مان رہا؟ اتنی مار پیٹ کے باوجود بھی؟" ثموز کا تا حال اپنی بات پہ ڈٹے رہنے کی اطلاع نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ "ٹھیک ہے' پھر مارو اس کی ٹانگ میں ایک گولی تاکہ یہ اس طلاق نامے پر دستخط کرے۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا تھا اور صغیر صاحب کی آنکھوں کے سامنے زمین آسمان گھوم گئے تھے۔

یہ کیسا بھیانک انکشاف تھا۔ ثموز کے غائب ہونے میں ان کے بیٹے کا ہاتھ تھا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ بے اختیار ان کے کانوں میں حنان کی آواز گونجنے لگی تھی۔

"میں مہر کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ۔ میں مہر سے محبت کرنے لگا ہوں۔" اور صغیر صاحب نے اپنا چکراتا سر تھام لیا تھا۔

"او خدایا! تو اس لڑکے نے یہ ذلیل حرکت مہر کو حاصل کرنے کے لیے کی ہے؟ یہ ان دونوں میں زبردستی طلاق کروانا چاہتا ہے؟" ان کی رگوں میں خون کی جگہ یکایک لاوا دوڑنے لگا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ اور تیز قدموں سے آگے بڑھے تھے۔

ان کی آمد سے بے خبر حنان' فیض کو ہر حال میں یہ معاملہ کل شام تک نبٹانے کی تاکید کر رہا تھا۔ مگر اپنے پیچھے اچانک قدموں کی دھمک سن کے وہ سرعت سے پلٹا تھا۔ اور باپ کو اپنے روبرو پاکے اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

"ذلیل! کمینے!" ان کا ہاتھ اٹھا تھا اور وہ یکے بعد دیگرے دو تین تھپڑ حنان کے منہ پر مارتے چلے گئے۔ "تو میرا بیٹا ہو کر اتنی گری ہوئی حرکت کرے گا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔" حلق کے بل چلاتے ہوئے ان کی آنکھیں مارے غضب کے ابل پڑی تھیں۔ حنان کا چہرہ بالکل فق ہو گیا تھا۔

صغیر صاحب نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے موبائل پکڑتے ہوئے کان سے لگایا تھا۔ مگر دوسری طرف بھی شاید ان کی آواز سن لی گئی تھی۔ تب ہی کال کاٹ دی گئی تھی۔ انہوں نے ایک خون آشام نگاہ بت بنے حنان پہ ڈالی تھی۔ اور پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے دروازے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ انہیں جاتا دیکھ کر حنان کو جیسے ہوش آگیا تھا۔ وہ متوحش سا ان کے پیچھے لپکا تھا۔

"ڈیڈی! پلیز ڈیڈی میری بات سنیں!" مگر وہ اس کی پکار نظرانداز کیے قدم اٹھاتے جا رہے تھے۔ بالآخر حنان کو ہی بھاگ کر ان کی راہ میں آنا پڑا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیرس کی لائٹ جلادی تھی۔ روشنی میں اس کے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی صغیر صاحب کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئی تھیں۔

"حنان میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ میں خود کو ختم کرلوں گا۔" ان کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پر اٹل تھا۔

"پلیز ڈیڈی ایک بار۔ صرف ایک بار میری بات تو سنیں۔" اس کی آواز میں التجا ہی التجا تھی۔

"تمہاری اور میری بات اب صرف اور صرف پولیس کے سامنے ہوگی۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ قطعیت سے بولے تو حنان کی روح فنا ہوگئی۔

"پلیز ڈیڈ یہ نہ کیجیے گا۔ میری۔ میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

"تو تمہیں ثموز اور مہر کی زندگی تباہ کرتے شرم نہیں آئی خبیث انسان؟" یک لخت دھاڑتے ہوئے انہوں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ ان کے سوال نے حنان کو نظریں جھکانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"ساری زندگی تم اس بھلی عورت کے صبر کو آزماتے رہے۔ مگر اس نے اپنی ماتا کا ہاتھ تمہارے سر سے نہیں اٹھنے دیا۔ اس معصوم اور یتیم بچی کو اپنی نفرت کی آگ میں جھونکتے رہے مگر اس نے کبھی تمہارے رویے کی مجھ سے شکایت نہیں کی۔ اور آج تم اس سادہ دل لڑکی کا گھر' اپنی نام نہاد محبت کے نام پہ

اجاڑنے چلے ہو؟ ارے تم میں خدا کا خوف ہے یا نہیں؟ انہوں نے ایک جھٹکے سے اسے پیچھے دھکیلا تھا۔

"میں اس سے محبت کرتا ہوں ڈیڈی۔ میں مہر کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اس نے شکستگی سے باپ کی طرف دیکھا تھا۔

"محبت؟ محبت کے مفہوم سے آشنا بھی ہو تم؟" ان کی آنکھوں میں استہزائیہ رنگ پھیل گئے تھے۔ "محبت صرف پانے کا نام نہیں ہے حنان۔ یہ بہت سی خاموش قربانیوں کا نام بھی ہے۔ مہر ایک شادی شدہ لڑکی ہے پھر تم نے اپنے جذبات اس سے منسوب کیوں کیے؟ کیوں اس گناہ کا ارتکاب کیا؟"

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں اسے تب سے چاہتا ہوں جب مجھے اس کے نکاح کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔" اس انکشاف پہ صغیر صاحب ایک پل کو خاموش ہو گئے تھے۔

"لیکن جب علم ہو گیا تھا۔ تب تمہیں اپنے قدم روک لینے چاہیے تھے۔" ان کا لہجہ بوجھل ہوا۔

"کیوں روک لیتا؟ اس تموز نے مہر کو دیا ہی کیا ہے؟" حنان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

"تموز نے مہر کو کچھ دیا ہے یا نہیں۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہارے لیے غور طلب بات صرف یہ ہونی چاہیے کہ کیوں ہم سب کی ہر طرح کی زور زبردستی کے باوجود مہر کبھی اپنے شوہر کا نام، اپنے نام سے الگ کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئی۔ کیا تموز بہت چاہنے والا اور قدردان شوہر تھا؟ نہیں۔ وہ مہر کی محبت تھا اس لیے۔" اور حنان باپ کی طرف دیکھتا تھم سا گیا تھا۔

"مہر کے دل و دماغ پہ صرف ایک ہی شخص کا راج ہے اور آج سے نہیں سالہا سال سے ہے۔ وہ اس کی کم عمری کا اولین خواب ہے۔ وہ اس سے لڑ سکتی ہے۔ منہ موڑ سکتی ہے مگر اس تعلق کو فنا نہیں کر سکتی۔ ایسی صورت حال میں تم اگر اسے حاصل کر بھی لو گے تو کیا اس کے دل پہ اپنا نام لکھ پاؤ گے؟ کیا اسے سر تاپا اپنا بنا پاؤ گے کبھی؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تو حنان کے اندر حقیقت کی تلخ گرد اڑنے لگی۔

"نہیں حنان! تم ایسا کبھی نہیں کر پاتے۔ مہر کی زندگی میں اگر تموز ابراہیم سرے سے موجود ہی نہ ہوتا۔ تب بھی تم کم از کم مہر احمد کے دل پہ اپنا نقش نہیں چھوڑ سکتے تھے کیونکہ تم وہ شخص ہو جس نے گھر کی عزت کو، جسے تمہارے باپ نے اپنی بیٹی کا درجہ دے رکھا تھا۔ اسے وہ چوٹ پہنچائی جسے وہ کبھی چاہے بھی تو بھلا نہ سکے گی۔ پھر تم اب کس بل بوتے پہ یہ تماشا کر رہے ہو؟ تمہیں تمہاری انتہا پسندی نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تم اس کھیل میں اس دن ہی ہار گئے تھے جب تم نے اس نوعمر لڑکی کے وجود پہ پہلی آلودہ نگاہ ڈالی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ تم نے اپنی اس شکست کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔" پہلی بار زندگی میں پہلی بار اس کے ضمیر نے اس کا احتساب کیا تھا اور اس پہلی ہی کوشش میں وہ لاجواب ہو گیا تھا۔ اس خود احتسابی نے اس کی آنکھوں میں شکستگی کی نمی بکھیر دی تھی۔ جو مقابل کھڑے صغیر صاحب سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھائے اس کے قریب چلے آئے تھے۔

"مہر نے اپنی زندگی میں بہت تکلیفیں دیکھی ہیں حنان۔ خدارا تم تو اسے مزید تکلیف نہ دو۔" بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اس کا فون اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ حنان کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔ آج صحیح معنوں میں اس کے ظرف اور اس کی محبت کا امتحان تھا۔ جس میں وہ پہلی بار یا تو باظرف ٹھہرنے والا تھا یا ہمیشہ کی طرح کم ظرف۔

یک ٹک فون کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں میں تیرتی نمی کو حلق میں اتارا تھا اور اگلے ہی لمحے ہاتھ بڑھا کر فون پکڑ لیا تھا۔ فیض کا نمبر ملاتے ہوئے اس کے دل میں درد ٹھاٹھیں مار رہا تھا مگر آج اس جیسے ضدی اور اکھڑ نے اپنی آرزوؤں کے جام کو توڑ کر مہر احمد سے وفا کی ٹھان لی تھی۔

لو آج سے ہم بھی رسم وفا کے اسیر ٹھہرے
لو آج ہم نے تمہیں آزاد کردیا

☼ ☼ ☼

قطرہ قطرہ زندگی ثموز ابراہیم کے زخموں اور نیلوں سے چور وجود میں اتاری جارہی تھی۔ جو دواؤں کے زیر اثر اسپتال کے بستر پہ بے سدھ سو رہا تھا۔

دو اذیت ناک راتوں کے بعد نکلنے والا دن' ان کی پریشانی کو سمیٹ لے گیا تھا۔ صبح پانچ بجے کے قریب ایک نامعلوم گاڑی ثموز کے بے ہوش وجود کو ابراہیم صاحب کے گھر کے باہر پھینک گئی تھی۔ جسے کوئی گھنٹے بھر بعد باہر نکلنے والے دل شیر نے پہچان کر شور مچا دیا تھا۔ آن واحد میں وہ سب بے قرار سے دوڑے چلے آئے تھے۔ اس کی حالت نے ہر غم' ہر درد بھلا دیا تھا۔ ابراہیم ملک بیٹے کو گاڑی میں ڈال کر دیوانہ وار اسپتال کی جانب بھاگے تھے۔ پیچھے ہی دوسری گاڑی میں مہر' ماں' بہنوں اور ساس کو لے کر بھاگی تھی۔

ثموز کی حالت بے حد خراب تھی۔ اسے دو دنوں سے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ مسلسل ذہنی اور جسمانی اذیت کی وجہ سے اس کا نروس سسٹم اچھا خاصا متاثر ہوا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے "فوراً" سے پیشتر آئی سی یو میں منتقل کردیا تھا۔ اس کی واپسی کی خبر پاکے صغیر صاحب بھی اسپتال دوڑے چلے آئے تھے۔ حنان میں چونکہ مہر کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ اس لیے وہ باپ کے ساتھ نہ آیا تھا۔ پولیس بھی ثموز ابراہیم کے مل جانے کی اطلاع پر وہاں پہنچ گئی تھی۔ اسے لے جانے والے کون تھے' ان کا کیا مقصد تھا؟ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا اور جو جانتا تھا وہ دل میں اپنے اللہ کے حضور اپنے بیٹے کے لیے معافی کا خواستگار تھا۔

مہر جی بھر کے آنسو بہانے کے بعد' دیوار سے سر ٹکائے' غیر مرئی نقطے پہ نظریں جمائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ ثموز کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے خوف نے ان دو دنوں میں اس کی حالت غیر کر ڈالی تھی اور اب جبکہ وہ مل گیا تھا تو اس کے دل پہ وہی جمود ایک بار پھر چھانے لگا تھا' کیا چاہتی تھی وہ؟ کیا کررہی تھی وہ؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی گزشتہ دنوں کی تڑپ پہ وہ خود کو شاباش دے یا اپنی ذات پہ نفرین بھیجے۔ اپنی تضحیک' اپنا روندے جانا اور سب سے بڑھ کر سالہا سال ثموز کے ہاتھوں بے وقوف بننا' وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی مگر جب بات ثموز کی جان پر آئی تھی تو وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ کیا سچی محبت کرنے والے سب ہی اتنے بے حمیت اور بے وقعت ہوا کرتے ہیں یا صرف وہی تھی' جس میں انا یا خودداری نام کی کوئی چیز نہ تھی؟ حد تو یہ تھی کہ اب بھی وہ یہ سب باتیں سوچ ضرور رہی تھی مگر خود میں اتنی ہمت نہ پاتی تھی کہ اسے یہاں چھوڑ کر واپس لوٹ جاتی۔ کتنی عجیب بات تھی' وہ اندر بے ہوش پڑا بھی مہر احمد کو خود سے باندھے رکھنے کی طاقت رکھتا تھا اور وہ باہر ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے بھی اسے دھتکارنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔ آپ میں سے مہر کون ہیں؟" ڈاکٹر کی بات پہ وہ جیسے خود میں لوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹر کے منہ سے اس کا نام نہ صرف اسے بلکہ سب ہی کو حیران کر گیا تھا۔

"میں ہوں ڈاکٹر صاحب۔۔۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی تو ڈاکٹر کی نظریں پل بھر کو اس کے چہرے پر آٹھہریں۔

"سر! آپ انہیں لے کر میرے روم میں آجائیں۔"

ابراہیم صاحب کو مخاطب کرتے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ مہر' بابا کے ساتھ تیز قدموں سے چلتی ڈاکٹر کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ان کے نشست سنبھالنے پر ڈاکٹر نے ابراہیم صاحب کی طرف دیکھا تھا۔

"سر! یہ آپ کی بہو ہیں؟"

"جی۔۔۔" ابراہیم صاحب کی الجھن تاحال برقرار تھی۔

"معذرت کے ساتھ۔۔۔ لیکن کیا آپ کے بیٹے اور بہو میں علیحدگی کا کوئی مسئلہ چل رہا ہے؟" انہوں نے رسان سے سوال کیا تو ابراہیم ملک کے ساتھ ساتھ مہر بھی بری طرح چونک گئی۔

"تھوڑی چپقلش ضرور ہے لیکن علیحدگی کی تو کوئی

بات نہیں ہوئی۔" ابراہیم صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔ "مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"اس لیے کہ آپ کا بیٹا... نیند کی دواؤں کے زیر اثر بھی اپنی وائف کا نام لے رہا ہے اور کسی طلاق کے کاغذ پر دستخط سے انکار کررہا ہے۔" ڈاکٹر کی بات پہ ابراہیم صاحب تو ساکت ہوئے ہی تھے لیکن مہر کا پورا جسم سن ہوگیا تھا۔

"تموز ابراہیم اور اس کے لیے بے چین...." بے اختیار اس کے کانوں میں وہ کاٹ دار الفاظ گونجنے لگے تھے، جنھوں نے اس کے دل کو یوں زخمی کیا تھا کہ لہو آج بھی رستا تھا۔

"تھوک کر جاؤں گا اس پہ.... اور کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گا۔" مگر اس کے اللہ نے نہ صرف اسے پلٹنے پر بلکہ مہر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر بھی مجبور کردیا تھا۔ وہ اسے کھلی آنکھوں سے دوبارہ دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ اللہ نے اس کی بند آنکھوں میں بھی مہر کے چھن جانے کا خوف منجمد کردیا تھا۔ کیا اس سے بہتر بھی بھلا کوئی انصاف ہوسکتا ہے؟

☼ ☼ ☼

ابراہیم صاحب کے گھر میں رونق اپنے عروج پہ تھی۔ آج پورے پانچ دن بعد تموز کی اسپتال سے گھر واپسی ہوئی تھی۔

ہوش میں آجانے کے بعد تموز نے رو' رو کے اپنے ماں باپ سے معافی مانگی تھی اور انہوں نے اسے کیا کہنا تھا بھلا۔ وہ تو اسے پہلے ہی معاف کرچکے تھے۔ مہر البتہ اس کے ہوش میں آنے کا سن کر گھر لوٹ گئی تھی۔ سب نے اسے جاتے دیکھا تھا مگر کسی نے اسے کچھ نہ کہا تھا۔ اس کی واپسی کا سن کے تموز کو چپ لگ گئی تھی۔ آنے والے چار دن وہ اسپتال میں رہا تھا لیکن اس کا انتظار 'انتظار رہا تھا۔ مہر دوبارہ نہیں لوٹی تھی۔ تموز کے اغوا کاروں کا کیا مطالبہ تھا اور اس پہ وہاں کیا گزری تھی۔ اس نے بتانے سے انکار کردیا

تھا۔ وہ جو بھی تھے اور جس کے بھی بندے تھے۔ اس کے حق میں تو بھلا ہی کر گئے تھے۔ اس کے گھر والوں، خاندان والوں کے دل اس کے حق میں نرم ہو گئے تھے۔ اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ مارک کا بھی بے حد شکر گزار تھا۔ جس نے ایک بار پھر خود کو ایک بہترین انسان اور اس کا بہترین دوست ثابت کیا تھا۔ البتہ مہر کی ذات اب تک اس کے لیے ایک سوالیہ نشان تھی۔ وہ کیا ٹھانے بیٹھی تھی، شمروز کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے تو اسے ان اولین لمحوں کے بعد اب تک دیکھا بھی نہ تھا۔ گھر آ کر بھی اس کی نظریں بے قراری سے اسے تلاشتی رہی تھیں مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دی تھی اور کسی سے پوچھنے کا اس کا منہ نہیں پڑ رہا تھا۔

"بابا! میں تھک گیا ہوں۔ مجھے کسی کمرے میں لے چلیں۔" دل اور روح پہ بڑھتے بوجھ نے اس کے کمزور اعصاب کو بہت جلد تھکا دیا تھا۔ یہ گھر اگر اس کے لیے نیا تھا تو اس میں بھی وہ بھلا حق ملکیت جتانے کا حوصلہ کہاں رہا تھا۔

"چلو آؤ۔" ابراہیم صاحب نے آگے بڑھ کے اسے سہارا دے کر اٹھایا تھا اور اپنے ساتھ لیے لاؤنج سے باہر چلے آئے تھے۔ اسے زیادہ وقت نہ ہو اسی لیے انجم نے اس کے لیے نچلی منزل پہ ہی کمرہ سیٹ کیا تھا۔ کمرہ اس کی پسند کے عین مطابق تھا۔ روشن اور کشادہ۔

"فی الحال تمہاری ماں نے تمہارے لیے یہی کمرہ سیٹ کیا ہے۔ جب ٹھیک ہو جاؤ گے تو اپنی مرضی کا کمرہ دیکھ لینا۔" اور باپ کی بات پہ شمروز دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی یہ سوال نہ کر سکا تھا کہ اس کی بیوی کہاں اور کس کمرے میں ہے؟ آیا اس گھر میں موجود بھی ہے یا چھوڑ کر جا چکی ہے۔

"کچھ چاہیے کیا؟" اسے پریشان حال بیٹھا دیکھ کر ابراہیم ملک چونک گئے تھے۔

"چائے کا کہہ دیں بابا۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس کی بات پہ وہ اثبات میں سر ہلاتے کچن میں چلے آئے تھے لیکن وہاں ملازمہ کے ساتھ مہر کو دیکھ کر جھجک گئے تھے۔

"جی بابا؟" اس نے بریانی کی ڈش خالی کرتے ہوئے ابراہیم صاحب کی طرف دیکھا تھا۔

"ہنی کے لیے اس کے کمرے میں چائے بھجوا دو بیٹا۔" اور وہ دھیرے سے "جی" کہتی پلٹ کر کوکنگ رینج کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کی پشت کو بوجھل نظروں سے دیکھتے ہوئے ابراہیم صاحب ایک گہری سانس لے کر رہ گئے تھے۔ وہ انجم بیگم کے کہنے کے مطابق مہر کی زندگی کے ہر فیصلہ کا اختیار اسے سونپ چکے تھے۔ اب وہ اپنے حق میں کیا فیصلہ کرنے والی تھی یا کر چکی تھی، وہ نہیں جانتے تھے مگر سب کے ساتھ ساتھ ان کی بھی یہی دعا تھی کہ چاہے جو بھی فیصلہ ہو۔ ان کے بچوں کے حق میں باعث خیر ہو۔

دروازے پہ دستک کی آواز پر شمروز نے بنا آنکھوں سے بازو ہٹائے اندر آنے کی اجازت دی تھی۔

"چائے۔" فقط ایک ہی لفظ گونجا تھا اور شمروز کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کی روح کھینچ لی ہو۔ اس نے ایک جھٹکے سے بازو ہٹاتے ہوئے اپنی دائیں جانب دیکھا تھا اور حقیقتاً "پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

"مہر!" اس کی سرگوشی میں برسوں کی پیاس تھی۔ وہ بنا آنکھوں کا طلسم توڑے دھیرے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کا یک ٹک خود کو دیکھے جانا مہر کو جھجک کر نگاہیں جھکانے پہ مجبور کر گیا تھا اور یہ منظر شمروز کو اس وقت کی یاد دلایا گیا تھا جب پہلی بار وہ اور مہر ائیرپورٹ پہ روبرو ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بے اختیار جھلملا اٹھی تھیں۔

"میری دعا ہے، اگر یہ کوئی خواب ہے تو میں ہمیشہ کے لیے سو جاؤں اور اگر یہ حقیقت ہے تو خدا میری آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بے خواب کر دے۔" اس کی آواز میں گھلی نمی مہر کے لبوں پہ اک پھیکی سی مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔

"آپ بھول رہے ہیں شاید میں وہی مہر ہوں۔ جس کی طرف آپ نے کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔"

"صحیح کہہ رہی ہو مگر وہ ایک گرے ہوئے انسان کا گرا ہوا فیصلہ تھا اور تمہارا اسیر ہو کر لوٹایا جانا او پروا لے کا فیصلہ ہے۔" وہ بنا کسی پس و پیش کے سکون سے بولا۔ تو مہر کی حیرت نے اسے پلکیں اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

"اتنی گہری باتیں کہاں سے سیکھ لیں آپ نے؟"

"جب سے آگاہی نے در وا کیے ہیں اور جب سے ان بے لگام' بے حساب خواہشوں سے نجات پائی ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ دھیرے سے مسکرایا تو مہر کی نظریں' آنسوؤں میں ڈوبے ان سنہری کانچ کے ٹکڑوں سے ہٹ کے اس تل پہ آ ٹھہری تھیں۔ جو اس کے مسکراتے ہی مہر کو ہمیشہ کی طرح کھلکھلا کے ہنستا محسوس ہوا تھا۔

"یہ تل..... بہت پسند ہے مجھے۔" اور شمروز کے لیے حیرت پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ کیسی فرشتہ صفت لڑکی تھی' نہ کوئی حرف ملامت' نہ بدلے میں تحقیر کا تحفہ' وہ ایک قدم اس کی جانب بڑھا تھا تو وہ دو قدم آگے چلی آئی تھی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اس نرمی سے گویا وہ کانچ کی بنی ہو۔

"اور مجھے یہ ہاتھ....." نرمی سے اس کے موی ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے اگلے ہی لمحے انتہائی محبت سے انہیں ہونٹوں سے لگا لیا تو مہر کی پوری جان اس کے ہاتھوں میں سمٹ آئی۔

"یہ آنکھیں....." اس نے ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کو نرمی سے چوما تھا۔ مہر کی سانس اس کے سینے میں اٹک گئی تھی۔ "یہ چمکتی پیشانی" اس کے لبوں نے عقیدت سے اس کی پیشانی کو چھوا تھا اور مہر کا صبر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔ اس کی بند آنکھوں سے بہتے اشک شمروز کو بری طرح نادم کر گئے تھے۔

"میں نے جس طرح تمہاری ذات اور تمہاری محبت کی تذلیل کی' جس طرح ہر آن تمہیں دھوکا دیا' اس کے لیے میں معافی کے لائق تو نہیں لیکن پھر بھی میری درخواست ہے تم مجھے معاف کر دو مہر!" اس کے آنسوؤں کو کرب سے دیکھتے ہوئے وہ ندامت سے چور لہجے میں بولا تو مہر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ شمروز کے لیے اس کی تڑپ کو مزید برداشت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔ اس کے سینے سے لگتے ہی وہ بچوں کی طرح بہ آواز بلند رونے لگی تھی۔

شمروز نے اسے کھل کر رونے دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے آنسو رکتے رکتے سسکیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

"اگر میں نے اپنے فیس بک پہ تصویریں نہ دی ہوتیں تو آپ مجھ تک کیسے پہنچتے بھئی؟" اس کے سینے سے سر اٹھاتے ہوئے مہر نے تشویش سے سوال کیا تو اس سادگی پہ شمروز بے اختیار ہنس پڑا۔

"تو اللہ تعالیٰ وہ کوئی اور راستہ نکال دیتا کیونکہ ایک بات تو طے تھی۔ اس نے مجھے تم تک لوٹانا ہی تھا۔ جانتی ہو کیوں؟" اس کے نفی میں سر ہلانے پر شمروز مسکرا دیا تھا۔

"کیونکہ تم میری پہلی اور آخری پناہ گاہ ہو..... آئی لو یو مہر شمروز!" اسے سینے سے لگاتے ہوئے اس نے اپنا پہلا اقرار محبت اس کے دامن میں ڈالا تھا۔ مہر نے آسودگی سے اپنی آنکھیں موندلی تھیں۔

"آئی لو یو ٹو شمروز ابراہیم!" اس کے رب نے اس کا گلہ دور کر دیا تھا۔ اس کا صبر رنگ لایا تھا اور اسے مکمل خوشیوں کی نوید سنا دی گئی تھی۔ مکمل اور بھرپور' بے اختیار مہر کے ذہن میں دو جملوں پر مبنی وہ تحریر گھوم گئی تھی جو آج صبح اسے حنان قاضی کی جانب سے موصول ہوئی تھی۔

"اپنی ضد میں بہت شدت سے نفرت کی ہے تم سے اور پھر اسی ضد میں بہت چاہا بھی ہے تمہیں۔ ہو سکے تو اس شدت پسندی کے لیے معاف کر دینا مجھے۔" یہ کیسے ممکن ہوا تھا۔ مہر نہیں جانتی تھی مگر خواہشوں کے اس کھیل میں فتح ہر طرف سے بہت خاموشی سے اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

یہی ہوتا ہے بے غرض اور بے لوث لوگوں کا انجام اور یہی ہے جام آرزو کا اختتام۔